TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222292

UNIVERSAL
LIBRARY

OUP—557—13-7-71—3,000.

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱۵۴۳۳۳ / ن و ز Accession No. ۱۸۳۷۲

Author ڈاکٹر نذیر احمد

Title منتخب متنوعات

This book should be returned on or before the date last marked below.

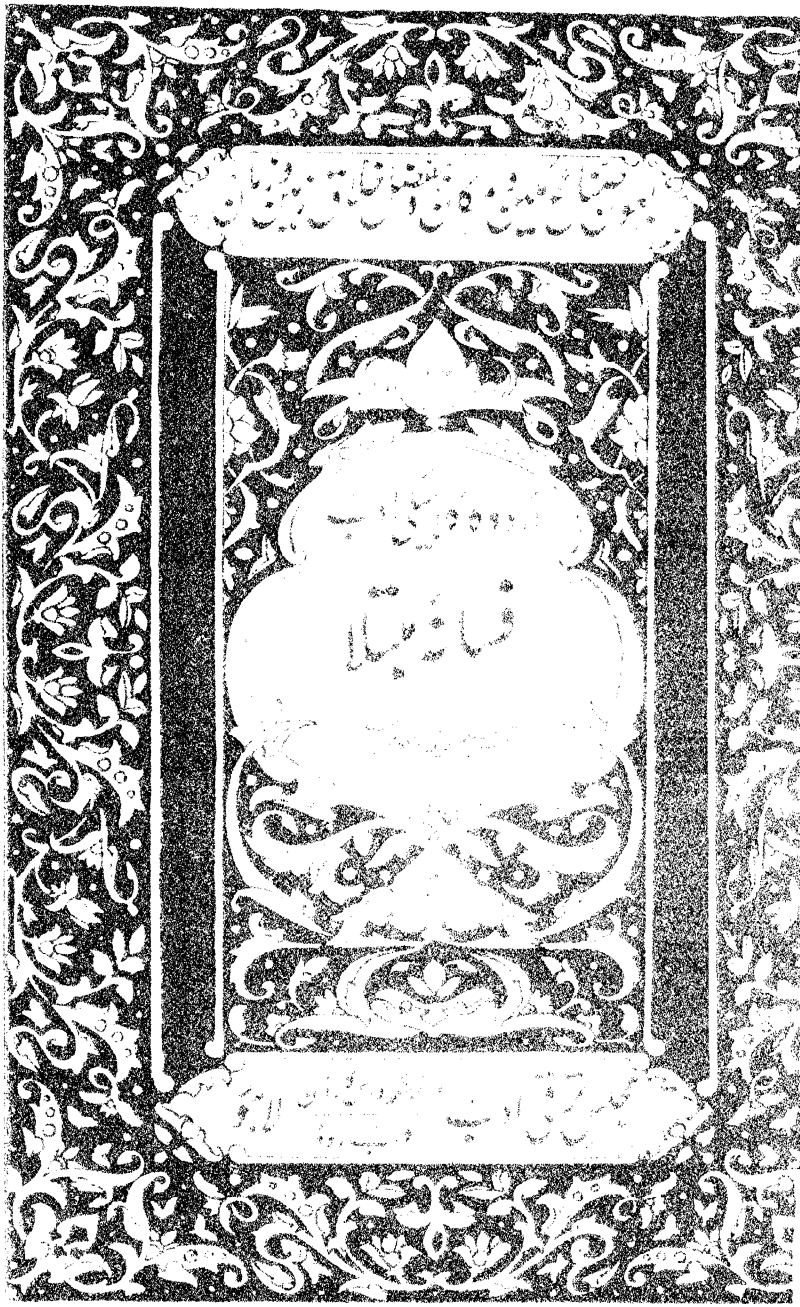

فہرست

۱ - پیش لفظ از مرتب ۱
۲ - مقدمہ از مرتب ۵
۳ - نذیر احمد کی مختصر سوانح عمری ۴۸
۴ - نذیر احمد کی تصنیفات ۵۵

---

۱ - دیباچہ الکتاب ۶۱
۲ - تمہید قصہ ۶۴
۳ - پہلی فصل ۶۷
مبتلا کی ولادت اور طفولیت
۴ - دوسری فصل ۷۷
مبتلا کی تعلیم مکتبی اور اس کا اثر
۵ - تیسری فصل ۸۱
مبتلا کا مدرسے میں تعلیم پانا اور برے لڑکوں کی صحبت میں آوارہ ہونا
۶ - چوتھی فصل ۸۸
مبتلا کا بیاہ اور اس کا معاملہ بی بی کے ساتھ
۷ - پانچویں فصل ۹۷
مبتلا کی مصیبتوں کا آغاز اور اس کی بدکرداریاں
۸ - چھٹی فصل ۱۰۱
مبتلا کے چچا کا حج سے واپس آنا

۹ - ساتویں فصل ۱۱۲
مبتلا کے چچا میر متقی کا اپنی بھانجی ، یعنی مبتلا کی بیوی کے سامنے تعزیت کے طور پر وعظ کہنا

۱۰ - آٹھویں فصل ۱۲۰
میر متقی کا مبتلا کے امور خانہ داری کی اصلاح میں کوشش کرنا

- نویں فصل ۱۲۴
میر متقی بڑے بھانجے سید حاضر کو سمجھاتے ہیں کہ بہن کو محروم الارث مت کرو

۱۲ - دسویں فصل ۱۴۱
سید حاضر کا میر متقی کے وعظ سے متاثر اور متنبہ ہو کر بہن کو اس کا حق دینے پر آمادہ ہونا اور دونوں بھائیوں کی اتنی بات پر باہمی رنجش -

۱۳ - گیارھویں فصل ۱۶۱
سید حاضر نے بہ تقاضائے دین داری علی رغم انف سید ناظر اپنی بہن کو اس کا حق دلایا

۱۴ - بارھویں فصل ۱۶۴
سید ناظر کے فسادات ، میر متقی کی نسبت عرضی گمنام ، میر متقی کے سمجھانے سے اصلاح ذات البین کا ہونا

۱۵ - تیرھویں فصل ۱۶۰
میر متقی کا مبتلا کو سمجھانا اور اس کی اصلاح

حال میں کوشش کرنا

۱۶ - چودھویں فصل ۱۷۶
مبتلا پر میر متقی کے وعظ کا کہاں تک اثر ہوا

۱۷ - پندرھویں فصل ۱۸۲
میر متقی کا دفعۃً بے وقت رام پور روانہ ہونا اور مبتلا کو سید حاضر اور عارف کے سپرد کر جانا

۱۸ - سولھویں فصل ۱۸۶
میر متقی کے چلے جانے کے بعد مبتلا کس رنگ میں رہا

۱۹ - سترھویں فصل ۱۸۸
حسن صورت پر مبتلا اور عارف کا مباحثہ

۲۰ - اٹھارھویں فصل ۲۱۰
مبتلا کا دام محبت میں مبتلا ہونا

۲۱ - انیسویں فصل ۲۱۹
مبتلا اور عارف کا مباحثہ تعدد نکاح کے بارے میں

۲۲ - بیسویں فصل ۲۳۱
مبتلا کا دوسرا نکاح

۲۳ - اکیسویں فصل ۲۳۸
غیرت بیگم پر اپنی سوکن کے راز کا فاش ہونا

۲۴ - بائیسویں فصل ۲۶۳
دو سوکنوں کی لڑائی کا سلسلہ اور اس کا اثر بد مبتلا پر ، مبتلا کی اولاد پر ، اس کی بیبیوں اور انتظام خانہ‌داری پر

۲۵ - تیئیسویں فصل ۲۷۵
ہریالی کا امید سے ہونا ، غیرت بیگم کا اس بات کو جاننا اور اپنی ماما خاتون سے اس کو سنکھیا دلوانا ــــ مقدمے کا کوتوالی میں دائر ہونا اور آخرکار ناظر کی تدبیر سے دب جانا ، مگر مبتلا کا دیوالیہ نکل کر

۲۶ - چوبیسویں فصل ۳۰۸
مبتلا اور ہریالی کا بگاڑ

۲۷ - پچیسویں فصل ۳۱۲
مبتلا کی خانہ داری دونوں بیبیوں کے ساتھ کس طرح پر تھی —

۲۸ - چھبیسویں فصل ۳۱۵
مبتلا نے تنگ ہو کر دونوں گھروں میں رہنا چھوڑا اور اس کی حالت یوماً فیوماً ردی ہوتی گئی ، یہانتک کہ ایک دن مر کر رہ گیا

۲۹ - ستائیسویں فصل ۳۱۹
خاتمہ

۳۰ - مرثیہ ۳۲۲

۳۱ - فرہنگ الفاظ

پیش لفظ

فسانۂ مبتلا کا پہلا ایڈیشن ۱۸۸۷ء میں مطبع نولکشور لکھنؤ سے شائع ہوا ، لیکن اس کی کتابت و طباعت کا معیار ناقص تھا ، اس لیے ۱۸۸۹ء میں مصنف نے اس کا دوسرا ایڈیشن متن کی تصحیح اور حواشی و فرہنگ کے ساتھ اپنی نگرانی میں شائع کیا ۔ دوسرے ایڈیشن کے بعد تیسرا اور چوتھا ایڈیشن مولوی بشیرالدین احمد (فرزند مصنف) اور مولوی منذر احمد (نبیرۂ مصنف) کے زیر اہتمام دہلی سے شائع ہوا ۔ اب ایک مدت بعد پاکستان میں کئی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں ۔ تحقیق و تدریس کے سلسلے میں دو جدید ایڈیشن مرتب کی نظر سے گزرے ۔ پہلے ایڈیشن (مطبوعہ کراچی) میں اس دعوے کے باوجود کہ ''موجودہ ایڈیشن مصنف کے شائع کردہ متذکرہ ایڈیشن (یعنی دوسرے ایڈیشن—مرتب) کے مطابق شائع کیا جا رہا ہے'' کتابت کی غلطیاں نہ صرف لفظی تحریفات تک محدود ہیں ، بلکہ کئی کئی سطروں کی عبارتیں حذف ہو گئی ہیں ، اور دوسرے ایڈیشن (مطبوعہ لاہور) میں کاتب نے ان تمام اغلاط و محذوفات کی پوری پوری پیروی کی ہے ۔ اغلاط و تحریفات کا یہ سلسلہ نقل در نقل نہ جانے کب تک جاری رہتا ، لیکن شکر ہے کہ مجلس ترقئی ادب لاہور نے کلاسیکی ادب کی طباعت و اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور نذیراحمد کی تصانیف میں سے 'ابن‌الوقت' کے بعد ''فسانۂ مبتلا'' کو منتخب کیا ۔

مرتب نے متن کی تصحیح میں پہلے اور دوسرے ایڈیشن کے علاوہ مولوی منذر احمد کا شائع کردہ ایڈیشن بھی پیش نظر رکھا ہے ۔ دوسرے ایڈیشن میں جہاں جہاں مصنف نے ترمیم و اضافہ کیا ہے ، حواشی میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے ۔ ہمارے یہاں علامات اوقاف کی بدعت حسنہ نے عام تحریروں میں اب تک رواج نہیں پایا، لیکن جو کتابیں درسیات میں شامل ہیں ان میں بعض ضروری علامات کا استعمال بالالتزام ہونا چاہیے ، تاکہ طلبہ اس کے عادی ہو جائیں ۔ نذیر احمد کی تصانیف میں علامات اوقاف کی ضرورت اس لیے بھی محسوس ہوتی ہے کہ بسا اوقات جملوں کی پیچیدہ ساخت یا طوالت اور قواعد صرفی کے خلاف لفظوں کی محاوراتی ترتیب کی وجہ سے طلبہ کو عبارت پڑھنے اور سمجھنے میں دقت پیش آتی ہے ، لہذا اس ایڈیشن میں حتی الامکان اس امر کا خاص اہتمام کیا گیا ہے ۔

نذیر احمد نے بالعموم اپنی تصانیف کے حاشیوں میں ناموس اصطلاحات و محاورات ، نیز بعض نکات کی وضاحت کی ہے اور اکثر کتابوں میں مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی بطور ضمیمہ شامل کر دی ہے ؛ فسانۂ مبتلا کے دوسرے ایڈیشن میں حواشی بھی ہیں اور فرہنگ بھی ، اس ایڈیشن میں بعض غیر ضروری حاشیوں کو چھوڑ کر مصنف کے تحریر کردہ تمام حاشیے (ستارے* کے نشان امتیاز کے ساتھ) درج ہیں ، لیکن بہت سے الفاظ ، اصطلاحات ، محاورات و امثال ایسے ہیں جو اس وقت ، خصوصاً اہل دہلی کے لیے عام فہم تھے ، اب ناموس اور تشریح طلب ہیں ، لہذا حواشی اور فرہنگ میں اضافہ بھی ناگزیر ہو گیا ۔ کہیں کہیں ایسے الفاظ و محاورات کی نشان دہی بھی ضروری سمجھی گئی جو متروک ، عامیانہ یا عام روز مرہ کے خلاف ہیں ۔ پہلے اور

دوسرے ایڈیشن میں جو الفاظ پرانے طریقے سے لکھے گیے ھیں ، مثلاً مونہ (منہ) ، پونہنچنا (پہنچنا) ، ٹھیرنا (ٹھہرنا) ، یا محبتہ (محبت) ، قدرۃ (قدرت) ، حفاظتہ (حفاظت) وغیرہ ، انھیں جدید طریق املا و کتابت کے مطابق لکھا گیا ھے ۔

غرض مرتب نے طلبہ کی ضروریات کے پیش نظر اسے ایک درسی ایڈیشن بنانے کی کوشش کی ھے ۔ امید ھے کہ طلبہ کے علاوہ عام قارئین کے لیے بھی یہ کوشش کسی نہ کسی حد تک سود مند ثابت ھوگی ۔

مرتب

مقدمة

مقدمہ

آپ کسی بلند کوھسار کی وادی میں کھڑے ھوں تو آس پاس کی گل بدامن جھاڑیوں ، درختوں اور چشموں سے لے کر قریب کے سرسبز ٹیلوں ، دور کے پہاڑی سلسلوں اور ان کے پیچھے سے جھانکتی ھوئی برف پوش چوٹیوں تک کتنے رنگا رنگ مناظر قلب و نگاہ کا دامن کھینچتے ھیں ۔ پھر جب آپ اس جلوہ گاہ فطرت سے رخصت ھو کر واپس جائیں تو پہلے ھی موڑ پر وادی کی ساری کائنات نظروں سے اوجھل ھو جاتی ھے ۔ پھر درجہ بدرجہ چھوٹے بڑے پہاڑ روپوش ھونے لگتے ھیں ، اور پھر صرف چند جھلکتی ، دمکتی ھوئی چوٹیاں باقی رہ جاتی ھیں جو دور دور تک ذوق نظر کو ھنس ھنس کر پکارتی ھیں ، حتیٰ کہ دید و بازدید کا یہ سلسلہ بھی ختم ھو جاتا ھے ۔ ھاں کبھی کبھی میدان کے کھیتوں اور باغوں کو سیراب کرنے والی ندیاں اپنے نورانی سرچشموں کی یاد دلاتی رھتی ھیں ۔ یہی حال اکابر کی زندگی کا ھے ۔ ان کے زمانے میں ان کے چھوٹے بڑے تمام کارنامے، ان کی شکستیں اور فتحیں ، ان کی شخصیت کے روشن و تاریک رخ ، ان کے حالات کے نشیب و فراز ـــ ھر پہلو پر نگاھیں اٹھتی ھیں ، ھر بات کے چرچے ھوتے ھیں ، لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ھے لوگ ان حکایتوں اور شکایتوں کو بھولتے جاتے ھیں ۔ کچھ اھم خدمات ، چند خاص معرکوں کا ذکر زبانوں

پر رہ جاتا ہے اور پھر آخرکار ان کے تخلیقی جوہر کا بہترین مظہر ، ان کی زندگی کا سب سے بڑا شاہکار باقی رہ جاتا ہے، یا پھر یوں بھی ہوتا ہے کہ ہمارے ادب و ثقافت کے چمنستانوں میں ان کی بخشی ہوئی روایات کا چشمۂ فیض محسوس یا غیر محسوس طور پر صدیوں جاری و ساری رہتا ہے ۔

نذیر احمد کی باغ و بہار ، کوہ وقار شخصیت کے گوناگوں پہلو اور اُن کی پر انقلاب زندگی کے نشیب و فراز چشم تماشا کے لیے ذوق و عبرت کا کتنا سامان اپنے اندر رکھتے ہیں ۔ دنیوی وجاہت کے اعتبار سے وہ اُن بلندیوں تک پہنچے جو اس زمانے میں ترقی کی معراج تھی ۔ قومی خدمات کے لحاظ سے اُن کا شمار صف اول کے رہنماؤں میں ہوتا تھا ۔ ان کی ادبی شہرت اُن کے نامور معاصرین کے لیے بھی باعث رشک تھی ۔ قانونی کتب کے تراجم سے ان کی علمی و ادبی خدمات کا آغاز ہوا اور وہ اپنے عہد کے بہترین مترجم تسلیم کیے گیے ۔ ان کا ترجمۂ قرآن بھی ایک عہد آفریں کارنامہ ثابت ہوا ۔ قومی مجالس میں ان کی خطابت کی دھوم مچ گئی اور وہ اردو کے بہترین خطیب مانے گیے ۔ حالی و شبلی کی طرح جلسوں میں ان کی قومی شاعری نے بھی خوب رنگ جمایا ، لیکن خطابت کی گھن گرج کے ساتھ ان کی رجز خوانی کی لے بھی اپنا وقتی اثر دکھا کر ختم ہوگئی ، تراجم ایک ایک کرکے ٹکسال باہر ہو گیے ، اُن کی مذہبی و درسی تصانیف اب نایاب ہو رہی ہیں ۔ غرض اُن کی تمام معرکہ آرائیاں بھولی بسری کہانیاں بن چکیں ، اب اُن کی ادبی عظمت و شہرت کا دار و مدار لے دے کر صرف ناولوں پر رہ گیا ہے ۔ یہی اُن کی قومی ، دینی اور ادبی خدمات کا حاصل اور ان کی تخلیقی و فنی صلاحیتوں کے بہترین مظہر ہیں ۔ اُن کے ناول اپنی بعض فنی خامیوں اور جدید

نقادوں کی شدید نکتہ چینیوں کے باوجود آج بھی زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ یہ اُردو میں صنف ناول کے ارتقا کی ابتدائی کڑیاں ہیں، انہیں کون گنوا سکتا ہے! ان میں جو روح عصر سموئی ہوئی ہے اور ایک معاشرے کی زندگی رچی بسی ہے، اُسے کون مٹا سکتا ہے!

آج سے تقریباً سو (۱۰۰) برس پہلے جب نذیر احمد نے قدیم قصہ گوئی کی بساط اُلٹ کر ناول کی بزم نو آراستہ کی اس وقت اگرچہ نیے سیاسی حالات کے زیر اثر پبلک کا تعلیمی ماحول بدل چکا تھا اور شمالی ہند، خصوصاً لاہور میں کچھ علمی و ادبی تحریکیں جنم لے رہی تھیں، لیکن اُردو میں ناول اب تک اسم بامسمیٰ، یعنی بالکل نئی چیز تھا۔ خود نذیر احمد نے بھی انگریزی ادب کے سطحی مطالعے سے فن ناول کی ایک جھلک دیکھی تھی اور اپنی ذہنی اپج سے کام لے کر اردو میں اُس کا نقش اول تیار کر دیا۔ رفتہ رفتہ اس فن کے بعض اہم تقاضوں کو بھی پورا کیا، یعنی نہ صرف یہ کہ 'بوستان خیال' اور 'فسانۂ عجائب' جیسی داستانوں کے طلسم ہوش ربا کو توڑا اور کہانی کو واقعیت کے سانچے میں ڈھالا، بلکہ زندگی کے عام واقعات کو اپنے حسن بیان سے رومان سے زیادہ دلچسپ بنا دیا۔ ناول کے مختلف اجزاء کو رشتۂ وحدت میں پرویا، فسانے کی دنیا کو حقیقی کرداروں سے آباد کیا، مکالموں میں بے تکلف بول چال کا رنگ ابھارا، اُس دور کے معاشرتی حالات کی ہو بہو عکاسی کر کے اپنے ناولوں کو ایک زندہ جاوید مرقع بنا دیا، لیکن فن کے ان تقاضوں سے کچھ زیادہ شدید اور اہم خود زندگی کے تقاضے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد مسلمانان ہند زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ وقت کی پکار یہ تھی کہ اگر مسلمانوں کو اپنا قومی وجود برقرار رکھنا

ہے تو انھیں اپنے مذہب کی حقیقی و دائمی قدروں اور اپنے اسلاف کی اعلیٰ تہذیبی روایتوں کو زندہ کر کے موجودہ فکری جمود ، قدامت پرستی ، جہالت ، سیاسی انتشار اور معاشرتی بے راہ روی کے خلاف جہاد کرنا ہوگا کہ یہی عناصر ان کی دنیوی ترقی اور خوش حالی کے راستے میں حائل ہیں ۔ قومی ابتلاء و آزمایش کے اس نازک دور میں جن کے دل قومی ہمدردی کے جذبات سے لبریز اور جن کے ذہن نور بصیرت سے روشن تھے ، انھوں نے زمانے کے اس چیلنج کو قبول کیا ۔ ادھر سرسید نے قومی ترقی کا ہمہ گیر پروگرام مرتب کر کے عملی جد و جہد کی ایک منظم تحریک شروع کی ، عین اسی وقت نذیر احمد نے اپنے قصوں کے ذریعے سے جمہور کی معاشرتی اصلاح اور نئی نسلوں ، خصوصاً طبقۂ نسواں کی تعلیم و تربیت کا بیڑا اٹھایا ، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ قومی انقلاب کا وسیع تر نصب العین اس وقت تک حاصل نہ ہو گا جب تک انفرادی اور خانگی زندگی میں نظم و ضبط اور سکون و مسرت کی فضا پیدا نہ ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے قصوں میں اُن کا اصلاحی جذبہ اور مقصدیت کا جوش چھلکا پڑتا ہے ۔ یہ غیر معتدل مقصدیت فن کے لیے ہمیشہ ناساز گار ثابت ہوتی ہے ۔ نذیر احمد بھی مقصد اور فن میں توازن قایم نہ رکھ سکے ۔ ان کے ناولوں کی یہی سب سے بڑی خامی ہے ، لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ نذیر احمد اُردو کے پہلے ناول نگار ہیں ؛ ایک ہی جست میں سفر ارتقا کی تمام منزلیں طے کر لینا نذیر احمد کیا ، کسی بھی فن کار کے بس کی بات نہیں ؛ تاہم اس ابتدائی دور میں انھوں نے اُردو ناول میں جو خوبیاں پیدا کیں اور جو روایتیں قایم کیں وہ اُن کے ادبی اجتہاد کا کارنامہ اور فن سے ان کی گہری وابستگی کا ثبوت ہیں ۔

ڈاکٹر عبد الحق مرحوم مقدمۂ ''حیات النذیر'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں : ''مرحوم اگر مرأۃ العروس کے سوا اور کوئی دوسری کتاب نہ لکھتے تو بھی وہ اردو کے باکمال انشا پرداز مانے جاتے اور اُن کی حیات جاودانی کے لیے صرف یہی ایک کتاب کافی ہوتی۔'' اس میں شک نہیں کہ مرأۃ العروس کو اُن کے بعد بھی بے حد شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی ، لیکن یہ ناول ان کے کمال فن کی صحیح نمایندگی نہیں کرتا ۔ اگرچہ اس زمانے میں مغربی ادب سے نا آشنائی اور تنقیدی شعور کے فقدان کے سبب سے فنی تربیت کے وہ مواقع حاصل نہ تھے جو اب ہیں ، تاہم نذیر احمد کا فن مرأۃ العروس کے بعد توبۃ النصوح ، فسانۂ مبتلا اور ابن الوقت میں برابر سنورتا اور نکھرتا چلا گیا ہے ۔ بعض نقادوں نے توبۃ النصوح کو اُن کے سب ناولوں پر ترجیح دی ہے، لیکن فن کی جملہ شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے فسانۂ مبتلا کو نذیر احمد کا بہترین ناول قرار دیا جا سکتا ہے ۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ نذیر احمد کے فکر و فن کا تجزیہ کرتے ہوئے فسانۂ مبتلا کے بارے میں فرماتے ہیں : '' فسانۂ مبتلا میں مقصد سے دل بستگی کا وہی عالم ہے جو مصنف کے اور ناولوں میں ہے ، مگر فن کے اسرار اور رموز پر عبور کے معاملے میں اس کو ہم نذیر احمد کا شاید مکمل ترین قصہ کہہ سکتے ہیں'' (سر سید احمد خاں اور اُن کے رفقاء صفحہ ۲۲۱) ۔ پروفیسر وقار عظیم کے نزدیک بھی فسانۂ مبتلا میں اس کا مصنف ''واعظ اور مصلح کا لبادہ اتار کر فن کار کے نازک لباس میں ملبوس دکھائی دیتا ہے'' اردو ناول کے ارتقا کے زیر عنوان وہ لکھتے ہیں : ''. . . . فسانۂ مبتلا اُردو کا پہلا ناول ہے جس نے صحیح معنوں میں زندگی اور فن دونوں کی انفرادی اہمیت اور باہمی

رشتے کے احساس کی داغ بیل ڈالی اور نذیر احمد کے بعد آنے والے ناول نگاروں کو فن کی روایت کا ایسا معیار ملا جس میں بہت سی خامیوں کے باوجود مکمل فن کی ساری نشانیاں موجود تھیں ،، (داستان سے افسانے تک صفحہ ۶۰)

★

نذیر احمد کے ناولوں کے پلاٹ عموماً سادہ ، اکہرے اور بے جان ہوتے ہیں ۔ اُن میں قصہ پن ، پیچیدگی اور کشمکش ، تعویق و تاخیر کا عنصر بہت کم ہوتا ہے ۔ باتوں کو دلکش پیرایے میں بیان کرنے ، حالات اور واقعات کی ہو بہو تصویر کھینچ دینے کی صلاحیت جو ہر اچھے ناول نگار میں پائی جاتی ہے ، اُن میں بدرجۂ کمال موجود تھی اور اس فطری صلاحیت کا اظہار ناولوں کے علاوہ اُن کی تقریروں ، بلکہ خالص علمی و مذہبی تصنیفوں میں بھی جا بجا ہوا ہے ۔ اگر اصلاح معاشرہ کے بجایے وہ محض قصہ گوئی کو اپنا نصب‌العین قرار دیتے تو دلچسپ واقعات کی کڑیاں جوڑ کر ایک جان‌دار پلاٹ تعمیر کرنے کا فن اپنی تمام نزاکتوں کے باوجود شاید ان کے لیے دشوار نہ ہوتا ، لیکن مقصدیت کے پیش نظر انھوں نے واقعات سے زیادہ افراد قصہ کی سیرت و شخصیت کو اہمیت بخشی ، معاشرتی زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں دلچسپی پیدا کی اور رفتہ رفتہ کہانی کا رخ خارجی واقعات سے نفس انسانی کے مطالعے کی طرف موڑ دیا ۔ چنانچہ فسانۂ مبتلا میں یہ موڑ بالکل واضح طور پر ہمارے سامنے آ جاتا ہے ۔ مقصد سے بغایت وابستگی کا یہ اثر ضرور ہوا کہ نذیر احمد کے ناول قصے کی جاذبیت سے محروم ہوگیے ، لیکن نذیر احمد جیسے ’’ وسیع بازؤں والے ادیب ‘‘ کے حق میں یہ ایک لحاظ سے اچھا بھی ہوا ۔ وہ ہر موقع پر جزئیات کو اس

طرح سمیٹتے چلے جاتے ہیں کہ بقول ڈاکٹر سید عبد اللہ ''کوئی چیز اُن کے بازؤں کے پھیلاؤ سے باہر نہیں رہ سکتی'' اس صورت میں اگر وہ کردار سے زیادہ عمل اور مسائل زندگی سے زیادہ قصہ گوئی پر توجہ دیتے تو شاید اُن کا ہر ناول ''فسانۂ آزاد'' بن کر رہ جاتا۔

اگرچہ فسانۂ مبتلا کے پلاٹ کی ترتیب و تعمیر میں نذیراحمد نے زیادہ فنکارانہ مہارت کا ثبوت دیا ہے، تاہم اس کے ابتدائی حصے میں واقعات کی رفتار بہت سست ہے۔ فسانۂ مبتلا غالباً اُردو کا پہلا ناول ہے جس میں افراد قصہ کے نفسیاتی تجزیے کی کوشش کی گئی ہے، خصوصاً ہیرو کا ذہنی ارتقا اور اس کی شخصیت کی تمام تہوں کو کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ ناول کے ابتدائی ابواب میں ہیرو کے تعارف کے بعد اس کی تعلیم و تربیت کے مختلف مراحل اور اس کے خانگی ماحول پر روشنی ڈالی گئی ہے، تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ اس کے ذہنی ارتقا میں ماحول و معاشرے کے اثرات اور خانگی حالات کس حد تک کارفرما رہے ہیں۔ اس کے بعد میر متقی کے مواعظ اور حاضر و ناظر کے جھگڑوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ حصہ بھی اصل قصے سے کچھ زیادہ غیر مربوط نہیں، خصوصاً میر متقی کی وہ طویل گفتگو جس میں وہ سادات نگر کے گزشتہ حالات بیان کرتا ہے، نہایت دلچسپ ہے۔ یہاں نذیر احمد نے پہلی مرتبہ دیہاتی معاشرت، خصوصاً مسلمان زمینداروں کے حالات کی تصویر کشی کی ہے۔ اس ماحول کی مصوری یوں بھی ضروری تھی کہ سید ناظر جو ناول کا ایک ناقابل فراموش کردار ہے، اسی ماحول کا پروردہ تھا۔ جایداد کی تقسیم پر جو مقدمہ بازی ہوتی ہے اس کی تفصیلات ناظر کے کردار کو اجاگر کرتی ہیں۔

آگے چل کر عارف اور مبتلا کے مناظرے اور مباحثے شروع ہوجاتے ہیں - پورے ناول میں یہی حصہ دور از کار معلوم ہوتا ہے - حتٰی کہ حسن کی ماہیت پر مبتلا اور عارف کی گفتگو موضوع کی رنگینی کے باوجود قصے کی روانی میں خلل انداز ہوتی ہے - تعدد ازواج پر ان دونوں کا مباحثہ اس سے زیادہ بے محل ہے - ناول کے نصف آخر میں پلاٹ دلچسپ ہے - واقعات کی رفتار تیز ہو جاتی ہے اور اُن واقعات میں ڈرامائی کشمکش اور تذبذب کا عنصر بھی پایا جاتا ہے - ہریالی سے ملاقات اور پھر دوسری شادی رچانے کے بعد سے مبتلا کی حسرت ناک موت تک طرح طرح کے واقعات پیش آتے ہیں - سوکنوں کی نوک جھونک اور چھوٹے چھوٹے گھریلو جھگڑوں کے علاوہ بعض سنگین وارداتیں بھی ہوتی ہیں ، لیکن ہر صورت حال ، کرداروں کا ہر عمل، رد عمل بالکل فطری انداز سے پیش کیا گیا ہے -

ناول میں بعض مواقع ایسے ہیں جہاں نذیر احمد کی حقیقت نگاری حد کمال کو پہنچ گئی ہے ، مثلاً میر متقی کی آمد پر مبتلا کی گھبراہٹ ، شوخ چشم بھانڈوں کی برجستہ نقل ، شادی کے بعد ہریالی کا مبتلا کے گھر میں بن ٹھن کر آنا اور محلے کی عورتوں کا اس کی درگت بنانا ، غیرت بیگم کی بد انتظامی اور گھر کی افراتفری کا نقشہ ، ہریالی کا راز فاش ہونے پر غیرت بیگم کی کیفیت ، معصوم کی طفلانہ شرارتیں ، ناظر و مبتلا کی کشتم پچھاڑ . . . . ان تمام موقعوں پر نذیر احمد کی قوت بیان کے ساتھ ساتھ اُن کے تخیل کی خلاقی ، بذلہ سنجی ، مشاہدے کی گہرائی اور نفسیاتی باریک بینی کے جلوے ہمیں حیرت میں ڈال دیتے ہیں - ان بیانیہ پاروں کے محاکاتی حسن اور واقعہ نگاری کے کمال کے باوصف یہ ماننا پڑتا ہے کہ نذیر احمد کے دیگر ناولوں کی

طرح فسانۂ مبتلا میں بھی ہیئت کی تشکیل فنکارانہ نہیں ہے۔ اول تو وہ تعلیم و تلقین کی دھن میں ہیئت کی طرف خاص توجہ نہیں دیتے، دوم یہ کہ قدیم قصہ گویوں کی طرح نذیر احمد بھی اپنے جوش بیان میں جزئی تفصیلات کا انبار لگاتے چلے جاتے ہیں۔ جزئیات کا حد سے زیادہ پھیلاؤ قصے میں حسن ترتیب اور حسن تناسب قایم رہنے نہیں دیتا۔

نذیر احمد کے فن پر ایک عام اعتراض یہ ہے کہ وہ مقصد کی خاطر حقیقت کا خون کردیتے ہیں اور زندگی کو حسب منشا مسخ کر کے پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر احسن فاروقی ان کے ہر ناول کو ''طویل واقعاتی تمثیل'' قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان ناولوں میں ''مقصد کو کسی فرضی قصے کے ذریعے ادا کیا گیا ہے جس کے واقعات اخلاقی مقصد کے بالکل موافق ظہور میں آتے ہیں'' (اردو ناول کی تنقیدی تاریخ صفحہ ۲۹)۔ اس اعتراض کا ایک مختصر جواب یہ ہے کہ ان کے قصوں میں ایسی کوئی بات نہیں ملتی جو امکان وقوع کے خلاف ہو۔ دوسرے یہ کہ نذیر احمد عموماً اپنے افراد قصہ کے افتاد مزاج، ذہنی رجحانات، ان کی نفسیاتی کمزوریوں اور اخلاقی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لینے کے بعد انھیں ایسے واقعات سے دو چار کراتے ہیں جن کی طرف ان کا کردار انھیں لے جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ان پر وہی اعتراض وارد ہو سکتا ہے جو فارسٹر نے ہارڈی پر کیا تھا کہ وہ اپنے افراد قصہ کے مطابق واقعات ڈھونڈ کر لاتا ہے، مگر یہ کون سی ان ہونی بات ہے؟ واقعات و کردار میں ایک لازمی رشتہ ہوتا ہے، دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوا کرتے ہیں۔ فسانہ مبتلا میں مبتلا کے

کردار اور اس کی زندگی کے حالات میں بڑا گہرا ربط ہے۔ کوئی واقعہ ایسا نہیں ہے جس پر آورد کا حکم لگایا جا سکے۔

فسانۂ مبتلا کے پلاٹ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ نذیر احمد نے خلاف معمول اس میں حسن و عشق کی ہلکی سی چاشنی پیدا کر دی ہے۔ ہمارے نقادوں کو ان سے ایک یہ بھی گلہ ہے کہ انھوں نے مشرقی داستانوں کی عام روایت کے بر خلاف حسن و عشق کی داستان طرازی سے دامن بچایا ہے۔ سید علی عباس حسینی جن کے نزدیک نذیر احمد ایک ''ملائے مسجدی'' سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، ایک جگہ طنزاً لکھتے ہیں '' ان کی متشرع طبیعت رنگین محبت ہی سے نہیں، بلکہ زن و شو کی محبت کے نام سے بھی لجاتی ہے'' (ناول کی تنقید و تاریخ صفحہ ۱۸۴) ۔ حسینی صاحب کا یہ بیان تسامح و تجاہل پر مبنی ہے۔ نذیر احمد کے کم از کم دو ناول (ایامیٰ اور فسانۂ مبتلا) تو ایسے ضرور ہیں جن میں رنگین محبت اور زن و شو کی محبت یہ دونوں عنصر کم و بیش موجود ہیں۔ فسانۂ مبتلا میں مبتلا کی حسن پرستی 'ہریالی اور مبتلا کا رومان اور پھر شادی، ان باتوں کے علاوہ اس معاشرے کی ایک جنسی گمراہی، یعنی امرد پرستی کا ذکر بھی آیا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ نذیر احمد نے خلوت کدوں کے پردے اٹھا کر جنسی ہیجان آفرینی کے اسباب فراہم نہیں کیے۔ ان کے بیانات میں لذتیت اور خیالی رومانیت کی جگہ واقعیت اور معقولیت پائی جاتی ہے۔ سرشار اور نذیر احمد کا موازنہ کرتے ہوئے حسینی صاحب ایک جگہ پھر لکھتے ہیں '' ان کی مولویت انہیں سوسائٹی کی مرقع کشی سے ہمیشہ مانع رہی / وہ حسن و عشق کے افسانوں سے برابر گریزاں رہے۔'' حسن و عشق کے افسانوں سے وہ کیوں

گریزاں رہے، اس سوال کا صحیح جواب حسینی صاحب خود بھی جانتے ہوں گے ۔ نذیر احمد نے دہلی کے متوسط طبقے کی زندگی کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے ۔ اس معاشرے کی عکاسی کی ہے جہاں شریف گھرانوں کی بہو بیٹیاں شادی سے پہلے کسی غیر محرم کا منہ نہیں دیکھتی تھیں ۔ یہی وجہ ہے کہ پرانے قصے تو کیا ناولوں میں بھی فسانۂ آزاد سے لے کر امراؤ جان ادا تک متوسط طبقے کے افراد کی داستان عشق ہمیں کہیں نہیں ملتی ۔ ان تمام ناولوں کے ہیرو اور ہیروئنیں عیش پرست امراء ، بگڑے دل نواب ، آزاد خیال بیگمات ، طوائفیں ، غیر قوموں کی آوارہ عورتیں یا پھر مامائیں، دائیاں، مہریاں، بھٹیاریاں وغیرہ ہیں ۔ چونکہ لکھنؤ کے عشرت زدہ ماحول میں ایسے کردار زیادہ ملتے تھے ، اس لیے وہیں اس قسم کے ناول بھی زیادہ لکھے گیے ۔ دوسری بات یہ کہ سوسائٹی کی مرقع کشی کے لیے حسن و عشق کے راگ الاپنا کوئی ناگزیر شرط نہیں ہے ۔ نذیر احمد نے اپنی مولویت کے باوجود جس خوبی سے دہلی اور نواح دہلی کی زندگی کے مرقع تیار کئے ہیں اس کا اعتراف خود حسینی صاحب بھی کر چکے ہیں ۔ اگر نظر انصاف سے دیکھا جائے تو یہ بھی نذیر احمد کے فنی محاسن کا ایک پہلو ہے کہ انھوں نے محض زیب داستان کے لیے پر تکلف رومان آفرینی کے بجائے حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے اپنے معاشرے کی صحیح عکاسی کی ۔ قصے کہانی کو حسن و عشق کی تنگ نائے سے نکال کر زندگی کی شاہراہ پر لا کر کھڑا کر دیا اور کہانی لکھنے والوں کو پہلے پہل یہ احساس دلایا کہ ع : اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا ۔

ناول میں سب سے نازک مرحلہ کردار نگاری ہے ۔ نفسیاتی تحلیل اور لا شعور کی تشریح و تعبیر کا رجحان جب سے شروع ہوا اس فن کی نزاکتیں اور بڑھ گئی ہیں ۔ ابتدائی دور کے ناولوں میں ان باریکیوں کو ڈھونڈنا فضول ہے ۔ وہاں تو ہمیں صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ ناول نگار کرداروں کی انفرادی خصوصیت کو اجاگر کرنے میں کس حد تک کامیاب رہا ہے ۔ آیا اس کے کردار جیتے جاگتے اور جانے پہچانے انسان معلوم ہوتے ہیں یا محض خیر و شر کی نمائندگی کرنے والے فرشتے اور شیطان ہیں ۔ اس اعتبار سے اگر نذیر احمد کے فن کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوگا کہ بعض ایسے کرداروں کو چھوڑ کر جو قصے میں تبلیغی مقصد کی تکمیل کے لیے لائے گیے ہیں ، اُن کے باقی تمام کرداروں میں زندگی کی حرارت و حرکت موجود ہے ، بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مختلف حیثیتوں کے زندہ متحرک کردار جس کثیر تعداد میں نذیر احمد نے تخلیق کئے ہیں ، اُتنے پریم چند سے پہلے شاید ہی کسی اور ناول نگار کے یہاں ملتے ہوں ۔

نذیر احمد زندگی کے مختلف پہلوؤں ، ادلتی بدلتی حالتوں اور انسانی سیرت کی نفسیاتی باریکیوں کا گہری نظر سے جائزہ لینے کے عادی تھے ۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں : ''جو دنیا کے حالات پر کبھی غور نہیں کرتا اُس سے زیادہ کوئی بے وقوف نہیں ہے اور غور کرنے کے واسطے دنیا میں ہزاروں طرح کی باتیں ہیں ، لیکن سب سے عمدہ اور ضروری آدمی کا حال ہے ۔ غور کرنا چاہیے کہ جس روز سے آدمی پیدا ہوتا ہے زندگی میں مرتے دم تک اس کو کیا کیا باتیں پیش آتی ہیں اور کیوں کر اس کی حالت بدلا کرتی ہے'' اسی غوروفکر اور مطالعہ و مشاہدہ کی عادت نے انھیں

فطرت انسانی کا نبض شناس بنا دیا تھا ۔ ان کے تخلیق کردہ کردار اس حقیقت کا بین ثبوت ہیں ۔

نذیر احمد کے بعض نقاد عموماً اُن کے پہلے ناول ''مراۃ العروس'' کی اصغری و اکبری کی مثالیں پیش کر کے کردار نگاری میں اُن کی ناکامی پر مہر تصدیق ثبت کر دیتے ہیں ۔ اگرچہ یہ دونوں کردار بعض خوبیوں اور خامیوں کا مثالی نمونہ ہیں ، تاہم ان میں کوئی بات بعید ازقیاس نہیں ہے جبھی تو بروایت مصنف ''حیات النذیر'' بعض لوگ اس دھوکے میں کہ سچ مچ کوئی اصغری اکبری ہوگزری ہیں ، دھلی میں اُن کا مکان ڈھونڈتے ہوئے آ نکلتے تھے (حیات النذیر صفحہ ۱۶۴) ۔ اس ناول کے بعض ضمنی کردار ، مثلاً ماما عظمت ، سیٹھ ہزاری مل ، تماشا خانم وغیرہ بھی اپنے اپنے رنگ میں کافی جاندار ہیں ۔ بہر حال اصغری و اکبری کی مثالیت بعد کے ناولوں کے کسی کردار میں نہیں پائی جاتی ۔ اس میں شک نہیں کہ وہ پیچیدہ یا مکمل کرداروں کے بجائے کرداری نمونے (Types) بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں ، لیکن ان کے ناولوں میں بعض ایسے کردار بھی ہیں جنھیں محض نمونہ نہیں کہا جا سکتا ۔ کلیم ، ابن الوقت ، مبتلا ، ہریالی ، غیرت بیگم یہ سب اپنی سیرت کے کسی غالب رجحان کے باوجود کئی اور انفرادی خصوصیات کے حامل ہیں ، لہذا انھیں مکمل کردار سمجھنا چاہیے ۔ اسی طرح اگرچہ ان کے بعض مشہور کردار (مثلاً اصغری ، ظاہر دار بیگ ، سیدناظر وغیرہ) نمو پذیر نہیں ، لیکن کچھ کردار ایسے بھی ہیں جو ارتقائی مدارج طے کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ نعیمہ (توبۃ النصوح) ، مبتلا اور ابن الوقت کے کردار اس کی نمایاں مثالیں ہیں ۔ فسانۂ مبتلا میں نذیر احمد نے مبتلا کے ذہنی نشوونما کے مختلف مراحل جس دقت نظری سے پیش کیے ہیں اُس کی مثال اُردو میں اس سے پہلے کہیں

نہیں ملتی ۔ ہریالی اور غیرت بیگم کے نفسیاتی کوائف کی عکاسی بھی اُن کا فنی کارنامہ ہے ۔ ایامیٰ میں آزادی بیگم کی ذہنی کشمکش کو جا بجا بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے اور بقول ڈاکٹر سید عبداللہ ''یہ اُردو میں نفسیاتی تجزیے کی اولین کوششوں میں سے ہے'' (سرسید اور اُن کے رفقاء صفحہ ۲۲۱) نذیر احمد نے کردار نگاری میں توصیفی اور ڈرامائی دونوں طریقے اختیار کیے ہیں ، مثلاً فسانۂ مبتلا کے ابتدائی حصے میں مصنف نے خود ہی مبتلا کی نفسیاتی کمزوریوں کی توجیہ و تاویل کی ہے ، لیکن سید ناظر ، غیرت بیگم اور ہریالی وغیرہ کے کردار اپنے عمل اور مکالموں کے ذریعے مجسم ہو کر ہمارے سامنے آئے ہیں ۔

الغرض نذیر احمد نے کردار نگاری کے جو نمونے پیش کیے ہیں وہ اس قابل ضرور ہیں کہ انھیں اس فن میں ''نقاش اول'' قرار دیا جا سکتا ہے ، لیکن حیرت ہے کہ ہمارے بعض نقاد نذیراحمد کی بجائے شرر یا سرشار کے سر پر اولیت کا تاج رکھتے ہیں ۔ مثلاً مجنوں گورکھپوری اپنی کتاب ''افسانہ'' میں لکھتے ہیں : ''شرر اور اُن سے زیادہ سرشار نے پہلے پہل اُردو میں کردار نگاری کو رواج دیا'' ڈاکٹر احسن فاروقی بھی اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے کہ نذیر احمد ''ناول نگار نہ تھے ، مکمل تمثیل نگار تھے'' اور اُن کے تمام ناول محض ''اخلاقی تمثیل ہیں'' اُن کے ہر کردار کو ''تمثیلی مجسمہ'' قرار دینے پر مصر ہیں ۔ اُن کے دلائل کی بنیاد یہ ہے کہ تمثیل کے افراد ، مثلاً بنین (Bunyan) کے ''بیڈ مین'' (Bad Man) کی طرح نذیر احمد کے کردار بھی کسی اخلاقی صفت کا مجسمہ اور اسم بامسمیٰ ہوتے ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ بیڈ مین کا کردار اسم بامسمیٰ ، یعنی بدی کا مجسمہ ہے اور انگریزی معاشرے میں ایسے نام نہیں

ہوتے، لیکن نذیر احمد کے بیشتر کرداروں کے نام ایسے ہیں جو عموماً ہمارے یہاں رائج ہیں، مثلاً کلیم، علیم، مشتاق، میر متقی، عارف، غیرت بیگم، فہمیدہ، صالحہ، صادقہ وغیرہ۔ اس عام عقیدے کے مطابق کہ انسان کی شخصیت پر اس کے نام کا اثر پڑتا ہے، اگر مندرجہ بالا کرداروں کی سیرت میں ان کے ناموں کی کچھ جھلک پائی جاتی ہو تو یہ کوئی بعید از قیاس بات نہیں۔ یقیناً ان میں سے کوئی کردار بیڈ مین (Bad man) کی طرح نیکی یا بدی یا اور کسی اخلاقی صفت کا مجسمہ ہرگز نہیں ہے۔ ناموں کے سلسلے میں یہ نکتہ بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ مشرقی زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں میں رعایت لفظی کا شوق بہت پرانا ہے، نذیر احمد کے زمانے میں تو یہ مرض عام تھا۔ شرفاء اور اہل علم عام گفتگو میں ضلع جگت کے استعمال سے اپنی خوش مذاقی کا ثبوت دیتے تھے۔ نذیر احمد کی عبارتوں میں بھی کہیں کہیں رعایت لفظی کا سراغ ملتا ہے، لیکن ناموں کے انتخاب میں یہ رجحان بہت نمایاں ہو گیا ہے؛ مثلاً اکبری اور اصغری کے ناموں میں بڑائی اور چھوٹائی کا مفہوم پایا جاتا ہے، اس لیے بڑی بہن کا نام اکبری اور چھوٹی کا نام اصغری رکھ دیا۔ توبۃ النصوح کے نام میں ایک قرآنی ترکیب ''توبۃً نصوحاً'' کی رعایت ملحوظ ہے۔ فسانۂ مبتلا میں مبتلا ایک بحث کے دوران میں کہتا ہے: ''میں نے مولوی محمد فقیہ سے اس مسئلے کی خوب تحقیق کی تھی'' زہر خورانی کے معاملے میں کوتوال کے سامنے جو عطار شہادت دیتا ہے اس کا نام حکیم رکھا گیا ہے۔ ان ناموں کی مناسبت ظاہر ہے۔ اسی قسم کے بہت سے نام ملیں گے جو اخلاقی صفات کے مظہر نہیں، بلکہ محض رعایت لفظی کے شوق بے جا کا نتیجہ ہیں۔ نذیر احمد کے درجنوں کرداروں میں سے صرف دو چار

ایسے ہیں جن کے نام بھی عجیب ہیں اور جو ایک حد تک اسم بامسمیٰ بھی ہیں ، مثلاً حجۃالاسلام یا مرزا ظاہردار بیگ یا ابن‌الوقت وغیرہ ، لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ محض نام کے صفاتی ہونے کی وجہ سے ہم ظاہر دار بیگ یا حجۃ‌الاسلام کو تمثیلی مجسمہ قرار دے دیں ۔ یہ سب جیتے جاگتے انسان ہیں ، لیکن قصے میں ضمنی حیثیت رکھنے کی وجہ سے اُن کی شخصیت کا صرف نمایاں ترین پہلو ہمارے سامنے آیا ہے ۔ انھیں ہم سادہ کردار یا ٹائپ کہہ سکتے ہیں ۔ ابن الوقت تو ہر لحاظ سے ایک مکمل کردار ہے ۔

فسانۂ مبتلا کے تقریباً تمام اہم اور غیر اہم کردار زندگی سے بھرپور ہیں ۔ سب سے پہلے ناول کے ہیرو مبتلا کو لیجیے ، مبتلا کا کردار محض کسی خوبی یا خامی کا مجسمہ نہیں ، بلکہ ایک مخصوص ماحول و معاشرے کے پروردہ جیتے جاگتے انسان کا کردار ہے ۔ ناول کے ابتدائی باب میں اس کا تعارف ایک شاعر کی حیثیت سے ہوتا ہے ۔ اس مناسبت سے ہمارے ذہن میں نذیر احمد کے ایک اور مشہور کردار کلیم کا خیال آجاتا ہے ۔ دونوں کے رجحانات یکساں ہیں ، دونوں ذہین ، طباع ، خوش مذاق ، تعلیم یافتہ اور رنگین مزاج شاعر ہیں ۔ دونوں انیسویں صدی کے نصف اول کی پر امن و بارونق دلی کے شاعرنواز اور شاعرگر معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اس مشابہت کے باوجود دونوں کے کردار میں بڑا فرق ہے ۔ کلیم ان نوجوانوں کی نمایندگی کرتا ہے جو اگرچہ آزادہ رو ، لاابالی ، دنیاوی معاملات سے بے خبر اور مذہب سے بیگانہ ہیں ، لیکن ان کے اوقات شعر و شاعری اور اسی قسم کے اعلیٰ ثقافتی ، ذہنی و تخلیقی مشاغل میں ، مشاعرے کی محفلوں اور ادبی حلقوں میں بسر ہوتے ہیں ۔ مبتلا بھی ذہین ہے اور محض اپنی غیر معمولی ذہانت

کے بل پر مکتب اور مدرسے کے تعلیمی مراحل بآسانی طے کرتا چلا گیا ۔ وہ اوائل عمر سے شاعری کا دلدادہ تھا ۔ مشاعروں میں شریک ہوتا تھا ، لیکن میر انشا کی طرح وہ حسین و نازنین بھی تھا ۔ آوارہ مزاج ، امرد پرست نوجوانوں نے اسے گھیر لیا ۔ بری صحبت میں پڑ کر وہ ناچ رنگ ، عیش پرستی ، طوائف بازی اور اسی قسم کی دیگر ''بازیوں'' کی نذر ہو گیا ۔ نوجوانوں کے ان دو طبقوں کی ذہنی سطح اور ان کے مشاغل کی نوعیت میں بڑا فرق ہے ۔ مبتلا کے کردار میں ہر دو طبقوں کی بعض عام خصوصیات موجود ہیں ۔ مبتلا اگرچہ فطری طور پر سلیم الطبع ہے، اپنے چچا کی مشفقانہ نصیحت سے متاثر ہو کر بعض بری عادتوں سے تائب ہو جاتا ہے ، لیکن وہ کلیم جیسی سادہ اور بھولی طبیعت نہیں رکھتا ، بلکہ عیاش لوگوں کی طرح سخن ساز اور مکار بھی ہے۔ ہریالی کو گھر میں لانے کے لیے بروقت حیلہ تراشی سے کام لیتا ہے ۔ کلیم معاملہ فہم نہ سہی ، لیکن بہادر ہے اور ایک بہادر کی موت مرتا ہے ۔ مبتلا عاقبت نااندیش بھی ہے اور بزدل بھی ۔ وہ زندگی کی رزم گاہ سے بزدلوں کی طرح منہ موڑ لیتا ہے اور بے بسی سے جان دیتا ہے ۔ اس کے اندر کچھ ایسی نفسیاتی کمزوریاں پائی جاتی ہیں جو ایک خاص قسم کے خانگی ماحول اور جاہلانہ تربیت کا نتیجہ ہیں ۔ نذیر احمد نے ناول کی ابتدائی پانچ فصلوں میں اس کے ذہنی نشوونما کے مختلف مراحل کا نقشہ کھینچا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ کس طرح زنانخانے میں گھسے رہنے اور بے جا ناز برداریوں کی وجہ سے اس میں خود اعتمادی ، جرأت اور حوصلہ مندی کی صفات پیدا نہ ہو سکیں ۔ کیسے اس میں نسائیت پیدا ہوئی اور زندگی کی کشمکش میں مردانہ وار حصہ لینے کی صلاحیت سے وہ کیوں محروم رہ گیا ۔ ہم اس کے

حسرتناک انجام پر آنسو بہاتے ہیں، لیکن یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تمام مصیبتیں اس کے کردار کی بعض کمزوریوں کا نتیجہ ہیں۔ ڈاکٹر احسن صاحب مبتلا کے کردار پر یوں رائے زنی فرماتے ہیں: ''مولانا نے دو شادیاں کرنے والوں کو زیادہ تر مبتلائے حسن پرستی دیکھا ہوگا، ایسے آدمیوں کی بابت عام باتوں کو جمع کر کے ایک مجسمہ پیش کیا جو اس لیے کافی دلپذیر نہیں ہو پاتا کہ نہ تو وہ پورا مجسمہ ہی ہے اور نہ کردار'' (ایضاً صفحہ ۶۰)۔ دراصل ڈاکٹر صاحب اسے مصلحتہً کردار کہنا نہیں چاہتے اور صاف صاف ''مجسمہ'' کی تہمت لگاتے ہوئے بھی شرماتے ہیں، اس لیے انھوں نے اسے ''عام صفات کا مجسمہ'' کہہ کر پیچھا چھڑا لیا، لیکن اگر مبتلا کا کردار صفات کا مجسمہ ہے تو اردو ناولوں میں کردار جیسی چیز کہیں ڈھونڈے سے نہ ملے گی، بلکہ ایسے ''عام صفات کے مجسمے'' بھی کم تر ہی نظر آئیں گے!!

اس ناول کا دوسرا اہم کردار غیرت بیگم دیہات کے غیر مہذب ماحول کی پروردہ ہے۔ صورت شکل بے عیب، لیکن شہری تہذیب کی مرصع سازی سے محروم۔ ازدواجی زندگی کی ناکامی مبتلا کی آوارگی سے زیادہ خود اسی کی جہالت، پھوہڑپن اور بد سلیقگی کا نتیجہ ہے۔ مبتلا کے جمالیاتی ذوق کے برعکس نہ اسے گھر کی تزئین کا سلیقہ ہے نہ اپنی آرائش کا خیال۔ پہلے تو شوہر کی آوارگی اور گھر کی بربادی کا منظر بے بسی اور خاموشی سے دیکھتی رہی، لیکن سوکن کا جلاپا اسے شعلۂ جوالہ بنا دیتا ہے۔ اس کا بدلا ہوا رویہ فطرت نسوانی کے عین مطابق ہے۔ ہریالی کے علاوہ مبتلا بھی اس کے جوش انتقام کا نشانہ بنتا ہے، بلکہ جان دینے اور لینے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ اس کا یہ رد عمل اس کی شدید جذباتیت، جہالت اور مزاج کے اکھڑپن کو دیکھتے ہوئے

الکل فطری معلوم ہوتا ہے ۔ تعلیم و تربیت کے فقدان سے بد سلیقہ، ند خو اور بد زبان تھی، لیکن اس کا باطن اتنا خراب نہ تھا ۔ س کے اندر بھی مشرقی خواتین کی روائتی شوہر پرستی کا جذبہ موجود ہے جو رشک و رقابت کی آگ فرو ہونے کے بعد اسی شدت سے ابھر آتا ہے ۔

غیرت بیگم کے مقابلے میں ہریالی کا کردار اس حقیقت کی روشن دلیل ہے کہ خانگی زندگی کے سکون و مسرت کا انحصار بہت کچھ عورت کی تہذیب ، شائستگی اور سلیقہ مندی پر ہے ، محض خاندانی شرافت کسی کام نہیں آتی ۔ اصل چیز ہے شریفانہ برتاؤ ، خوش اخلاقی اور شیریں زبانی ۔ ہریالی میں یہ اوصاف موجود ہیں ۔ وہ بازاری عورت ہوتے ہوئے بھی ایک اچھی گرھست بیوی ثابت ہوتی ہے ، لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ وہ اصل نسل کی طوائف نہ تھی، بلکہ لکھنؤ کی خانگی تھی ۔ طوائف شادی اور گرھستی کے بکھیڑے میں نہیں پھنستی ، لیکن خانگی جائز یا ناجائز طور پر کسی ایک کی ہو رھتی ہے ۔ ناول نگار کا یہ قول بھی ملحوظ رہے کہ ''خواصی ، مصاحبت یا کسی دوسرے طور پر اس نے شاھی محلات میں ضرور تربیت پائی ہے ۔''

مرزا ظاھر دار بیگ کی طرح سید ناظر بھی نذیر احمد کے کرداروں میں نہایت کامیاب اور ناقابل فراموش ''نمونہ'' (Type) ہے ۔ ناظر جیسے ''ثقہ بدمعاش'' اور قانونی شاطر ھمارے معاشرے کے جانے پہچانے کردار ھیں ۔ اس کردار کی تخلیق میں نذیر احمد نے عدالت و پولیس ، وکیلوں اور مقدمہ بازوں کے ذاتی تجربات و مشاھدات سے کافی کام لیا ہے ۔ ناظر کے نزدیک حلال و حرام، جائز نا جائز میں کوئی فرق نہیں ۔ وہ قانون کی گرفت سے بچتے ہوئے اپنے فایدے کے لیے سب کچھ کر گزرتا ہے اور قانون میں

بھی وہ اپنے داؤ پیچ سے اتنی گنجائش نکال لیتا ہے کہ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ ثابت کر دکھاتا ہے ۔ قانونی نکتہ رسی کے علاوہ لسانی اور سخن سازی بھی اس کے کار گر حربے ہیں ۔ انھی ہتھکنڈوں سے کام لے کر زہر خورانی کے معاملے میں خوب ہاتھ رنگتا ہے اور کوتوال کو بیوقوف بنا کر بنے بنائے مقدمے کو ختم کر دیتا ہے ۔

فسانۂ مبتلا کے غیر اہم کرداروں میں ، عارف تو محض ناول نگار کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کے لیے لایا گیا ہے ، لیکن میر متقی، سید حاضر اور ماما خاتون کے کردار کافی جاندار ہیں ۔ میر متقی مصنف کا محبوب کردار، بلکہ خود اسی کی شخصیت کا ایک دوسرا روپ ہے ۔ وہ علم و عمل ، دین‌داری اور دنیا داری ، اخلاص و ایثار ، گفتار و کردار کی گوناگوں صفات کا مجموعہ ہے ۔ طویل تقریریں تو کرتا ہے، لیکن بے وقت کی بھیرویں نہیں الاپتا ۔ مبتلا کو سمجھانے سے پہلے وہ بڑی گہری نگاہ سے اس کا نفسیاتی مطالعہ کرتا ہے ۔ اس کی کمزوریوں کو سمجھ لینے کے بعد ہفتوں موقع کا منتظر رہتا ہے اور نصیحت کے مناسب پیرایوں پر غور کرتا ہے ۔ مردم شناسی کی صلاحیت اور غور و فکر کی عادت ہونے کی وجہ سے اس کی باتیں مدلل بھی ہوتی ہیں اور مؤثر بھی ۔ مبتلا کی اقتصادی حالت درست کرنے کے لیے جو انتظامات وہ کرتا ہے اُن سے اس کی معاملہ فہمی اور تجربہ کاری کا ثبوت ملتا ہے ۔ سید حاضر بھی نذیر احمد کے پسندیدہ اوصاف ، یعنی دین‌داری اور خدا ترسی کے ساتھ معقولیت ، مصلحت اندیشی اور میانہ روی کی خوبیوں کا حامل ہے اور نذیر احمد کے نمو پذیر کرداروں میں سے ہے ۔ متقی کی نصیحت سے متاثر ہو کر جایداد کے معاملے میں اپنے غاصبانہ رویے سے باز آ جاتا ہے

ناظر کی تیزی و طراری کے مقابلے میں اس کے مزاج کا دھیما پن ، تحمل ، وقار اور تمکنت ہر موقع پر نمایاں ہے ۔ ماما خاتون اگرچہ مرأۃ العروس کی ماما عظمت کی طرح دلچسپ تو نہیں ، تاہم اپنی چرب زبانی ، عیاری و مکاری کی وجہ سے ناقابل فراموش کردار ہے ـــ سید حاضر کا ہلوایا غریبا گوجر صرف ایک لمحے کے لیے ہمارے سامنے آتا ہے، لیکن نذیر احمد نے ایک صفحے کے مکالمے میں اس کی ذہنیت اور شخصیت کی ایسی تصویر کھینچ دی ہے کہ وہ بھلائے سے نہیں بھولتا ۔ دراصل نذیر احمد نے کردار نگاری میں مکالموں سے بھی بڑا کام لیا ہے ۔ حاضر ، ناظر ، غیرت ، ہریالی ، سب کے مکالمے ان کے مزاج اور ذہنی رجحانات کی آئینہ داری کرتے ہیں ۔

★

قدیم قصوں کے مقابلے میں ناول کی ایک امتیازی خصوصیت بے تکلف اور فطری مکالمے ہیں جن سے واقعات اور کرداروں کی باطنی کیفیات دونوں کے تمثیلی اظہار میں مدد ملتی ہے اور ناول میں ڈرامائی کشش و جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ نذیر احمد نے مکالموں میں بھی ایسی ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے کہ اردو کے بہت کم ناول نگار اس فن میں اُن کا مقابلہ کر سکتے ہیں ۔ تمام نقادوں نے اُن کی اس خوبی کو کھلے دل سے سراہا ہے ۔ سید علی عباس حسینی لکھتے ہیں : ''بے شک و شبہ مولانا عورتوں کے مکالمے کے بادشاہ ہیں ۔ صنف نازک کے انداز تکلم ، طرز گفتگو ، نشست الفاظ اور روزمرہ محاورے پر جیسا انھیں عبور ہے ، ویسا سرشار، ہوش اور مرزا رسوا کے علاوہ کسی کو نصیب نہیں ۔ ان مقامات پر مولانا نے سلاست ، روانی اور آمد کے دریا بہا دئے ہیں اور اتنی ٹکسالی زبان لکھی ہے کہ ہر فقرے

پھر جی لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے'' (اردو ناول کی تاریخ و تنقید صفحہ ۱۸۵)

نذیراحمد اپنے فطری ذوق ادب کے ماتحت اوائل عمری سے زبان اور محاورے کے چٹخارے کے دلدادہ تھے ۔ قران کریم سے آن کی بغایت شیفتگی کا ایک خاص سبب اس کی فصاحت ہے جس نے انھیں ادھیڑ عمر میں قرآن حفظ کرنے پر مجبور کیا ۔ لڑکپن میں تعلیم کے لیے دھلی آئے تو یہاں کی زبان کا ایسا چسکا لگا کہ دھلی کے روزمرے و محاورے کے حافظ اور پھر محافظ بن گیے ۔ شریف گھرانوں کی خالص بیگماتی زبان کے علاوہ بازاروں کی عامیانہ بول چال اور مکتبوں کے مولویانہ انداز گفتگو ، غرض دلی کے ہر طبقے کی زبان پر انھیں کامل عبور حاصل تھا ۔ نذیر احمد مکالموں میں عموماً اس فرق مراتب کو ملحوظ رکھتے ہیں ، یعنی کرداروں کے حسب حیثیت ، اسی طبقے کی زبان اور لہجہ اختیار کرتے ہیں ، لیکن کبھی کبھی محاورہ بازی کا شوق انھیں حجۃ الاسلام اور میر متقی جیسے ثقہ لوگوں کی گفتگو میں بھی عامیانہ الفاظ و محاورات کے استعمال پر مجبور کر دیتا ہے ۔

عورتوں کی زبان کو ہر جگہ ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے ۔ ان کی بعض مخصوص اصطلاحیں ہوتی ہیں ۔ بول چال میں محاوروں ، مثلوں اور کنایوں کا استعمال زیادہ ہوتا ہے ۔ آن کے لب و لہجے میں جذباتی انداز اور طنز نمایاں ہوتا ہے ۔ عورتوں کا مکالمہ لکھنے کے لیے زبان کے ایک خاص اسلوب سے واقفیت کے ساتھ آن کی ذہنیت اور نفسیات کا ادا شناس ہونا بھی ضروری ہے ۔ فسانۂ مبتلا کے نسوانی کردار تعداد میں مردوں سے زیادہ نہیں ، لیکن مرد عموماً تقریریں کرتے ہیں ، لہذا مکالموں میں عورتوں کا حصہ زیادہ ہے ۔ مختلف مواقع پر طرح طرح

کے مکالمے آئے ہیں ۔ کہیں گلے شکوے ہیں، کہیں لعن طعن ؛ کہیں ہریالی کی شیریں گفتاری ہے ، کہیں غیرت بیگم کی بد زبانی ؛ کہیں ماماؤں کی لگائی بجھائی ہے، کہیں خاتون کے دم دلاسے ۔ ہر جگہ نذیر احمد نے عورتوں کی ذہنی کیفیات ، توہمات اور رجحانات کی ترجمانی ایسے فطری انداز میں کی ہے کہ مکالمہ پڑھتے وقت کرداروں کی آوازیں ہمارے کانوں میں گونجتی ہیں اور اُن کے لب و لہجے کے اُتار چڑھاؤ کو ہم محسوس کرتے ہیں ، لیکن نذیر احمد کے کمال فن کا اظہار اُس وقت ہوتا ہے ، جب وہ غم و غصہ ، نفرت و حقارت یا جوش انتقام کے شدید جذبات کو مکالموں میں ادا کرتے ہیں ۔ ایسے مکالموں میں تیغ زبان کی روانی ، طعن و طنز کی زہرناکی اور لہجے کی تندی و تلخی بے پناہ ہوتی ہے ، بلکہ کبھی کبھی تو نشست الفاظ اور فقروں کی بے ترتیبی سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جذبات کا سیلاب قواعد زبان کے بند توڑ کر بہہ نکلا ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے مکالموں کے لیے محض زبان دانی کافی نہیں ، بلکہ اس کے ساتھ نفسیاتی بصیرت اور فطرت شناسی بھی ضروری ہے ۔ فسانۂ مبتلا میں ایسے کئی مکالمے موجود ہیں ۔ یہاں ایک مختصر سا اقتباس نمونۃً پیش کیا جاتا ہے ۔ بوڑھی عورت کے استفسار سے اچانک ہریالی کی حقیقت کھل جانے پر غیرت بیگم کچھ دیر کے لیے مبہوت سی رہ جاتی ہے ۔ ایک لمحے بعد اس کا سکوت ٹوٹتا ہے ، لیکن وہ تحقیق حال کی کوشش نہیں کرتی ، وہ کسی بحث و تکرار میں نہیں الجھتی ، وہ گھر پر اپنا دعویٰ جتانے اور سوکن کو نکال باہر کرنے کے لیے کوئی لمبی چوڑی بات نہیں کرتی ؛ وہ اچانک ایک آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ پڑتی ہے ۔ اُس کے دونوں ہاتھ بھی چلنے لگتے ہیں اور زبان بھی ۔ دو ہتھڑ

کی ہر ضرب کے ساتھ اس کی زبان چھوٹے چھوٹے طنزیہ فقروں کے کوڑے برساتی ہے ۔ دست و زبان کی یہ ہم آہنگی ملاحظہ ہو : ''تم نے دیکھا ، یہ ہریالی نہیں گھر والی ہے ، یہ بی بی ہے ، یہ میری سوکن ہے ۔ میں رانڈ ہوں ، یہ سہاگن ہے ۔ میں لونڈی ہوں ، یہ بیگم ہے ۔ میں چڑیل ہوں ، یہ حور ہے ۔ یہ میاں کی لاڈو ہے ۔ یہ میاں کی چہیتی ہے ۔ یہ میاں کے کلیجے کی ٹھنڈک ہے !''۔

اس میں شک نہیں کہ نذیر احمد کے ناولوں میں عورتوں کے مکالمے زیادہ دلچسپ ہوتے ہیں ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ عورتوں کی زبان میں ایک لوچ اور لہجے میں تیکھا پن ہوتا ہے ۔ اُن کے مخصوص انداز گفتگو کی ہوبہو نقل ہمیں چونکا دیتی ہے ۔ لیکن عورت ہو یا مرد ، بچہ ہو یا بوڑھا ، عالم ہو یا جاہل ، نذیر احمد کا قلم ہر کردار کی زبان بن کر اُن کی ترجمانی کرتا ہے ۔ فسانۂ مبتلا میں چلبلا بھانڈ کے طائفے کی نقل ملاحظہ ہو ، جس میں بھانڈوں کی شوخی و ظرافت ، حاضر جوابی اور پھبتی بازی کو بڑی برجستگی سے پیش کیا گیا ہے ۔ سید حاضر کی گفتگو میں نرمی ، بردباری اور شائستگی کی جھلک موجود ہے ۔ اس کے برخلاف سید ناظر کے مکالمے اس کی تیزی و طراری کے آئینہ دار ہیں ۔ نذیر احمد کے ناولوں میں بیشتر کردار شہری ہیں ۔ فسانۂ مبتلا میں گریبا (غریبا) ایک ٹھیٹھ دیہاتی کردار ہے جو لمحے بھر کے لیے ہمارے سامنے آتا ہے۔ لیکن دیہاتی لہجے میں اس کی سیدھی سادی گفتگو اس کی شخصیت کا ایک ایسا نقش ہمارے ذہن پر ثبت کر دیتی ہے کہ ہم اُسے کبھی نہیں بھول سکتے ۔

نذیر احمد کے ناولوں کا سب سے بڑا عیب بعض کرداروں

کے وہ طویل مکالمے ہیں جو کہیں وعظ کہیں مباحثہ و مناظرہ اور کہیں طویل ناصحانہ گفتگو کی صورت میں ہوتے ہیں ۔ ان کے ہر ناول میں کوئی نہ کوئی کردار ان کی شخصیت کے خطیبانہ پہلو کی نمایندگی ضرور کرتا ہے ۔ فسانہ مبتلا میں میر متقی عارف اور ایک حد تک سید حاضر اسی قسم کے کردار ہیں ۔ سید حاضر کی گفتگو طوالت کے باوجود اصل قصے سے مربوط ہے ۔ میر متقی کا پہلا وعظ جس میں وہ غیرت بیگم کو بزرگوں کی وفات پر صبر جمیل کی تلقین کرتا ہے زیادہ طویل نہیں ۔ اس میں زندگی کا رجائی فلسفہ دل نشین پیرایے میں بیان کیا گیا ہے ۔ دوسرے وعظ کی طوالت سادات نگر کے دلچسپ حالات اور میرمقتدر کے عبرت ناک قصے کی وجہ سے گراں نہیں گزرتی ۔ تیسرا وعظ لادینی نظام تعلیم کے برے نتائج پر ایک مدلل اور خشک مقالے کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اسی طرح مبتلا اور عارف کے مباحثے بھی قصے کی روانی میں بے جا طور پر خلل انداز ہوتے ہیں ۔ اگرچہ ان تقریروں اور مباحثوں میں بھی ۔ تکلف گفتگو کا انداز افہام و تفہیم کا دلنشیں پیرایہ، محاکاتی بیان کا لطف اور محاوراتی زبان کا چٹخارا قارئین کی دلچسپی کو برابر قائم رکھتا ہے، لیکن بہرحال ناول کی ''کارگہ شیشہ گری'' اس دراز نفسی کی متحمل نہیں ہو سکتی ۔

★

نذیر احمد کے فن کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ناولوں میں مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کی بالکل سچی تصویر کشی کی ہے اور یہی خصوصیت آن کے ناولوں کی دائمی قدر و قیمت کی ضامن ہے۔ آن کے یہاں منظر نگاری کہیں نام کو بھی نہیں ملتی ۔ منظر نگاری کی ابتدا بہت بعد میں شرر

کے ناولوں سے ہوئی ۔ موسمی کیفیات اور مقامی خصوصیات یعنی شہر کے محلوں، گلی، کوچوں، عمارتوں کا ذکر بھی بہت کم آتا ہے ۔ سوشل ناول کی ایک قسم وہ ہے جسے گھریلو ناول کہتے ہیں ۔ نذیر احمد کے تقریباً سبھی ناول گھریلو ناول ہیں اور اس اعتبار سے وہ اردو کے جین آسٹن کہے جاتے ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ جس طرح جین آسٹن کے ناولوں میں گھر کے ڈرائنگ روم یا معاشرتی زندگی کی تقریبات ، پارٹیاں ،ڈنر ،بال وغیرہ مرکزی حیثیت رکھتی ہیں، اسی طرح نذیر احمد کے قصے بھی گھریلو زندگی کے اردگرد گھومتے ہیں ، لیکن نذیر احمد نے ایک اصلاحی مقصد کے تحت گھریلو زندگی کی عکاسی کی ہے ۔ اس مقصدیت نے ان کے ناولوں میں زندگی کا دائرہ وسیع کر دیا ہے اور جمہور کی معاشرتی زندگی کے مختلف اہم مسائل اور متعدد پہلو اُن کے ناولوں میں سما گیے ہیں ۔

اگرچہ نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں صراحۃً دھلی اور اس کے محلوں کا نام بنام ذکر نہیں کیا (مثلاً فسانۂ مبتلا میں دھلی کا کہیں نام نہیں آیا) لیکن اُن کے ہر ناول میں جو مقامی رنگ اور مخصوص فضا موجود ہے ، نیز عصری حالات اور واقعات کے بارے میں اشارات ملتے ہیں اُن سے پتا چلتا ہے کہ اُن کے قصوں کا پس منظر دھلی کے سوا اور کوئی شہر نہیں ہوسکتا۔ نذیر احمد دھلی کے علاوہ یہ سلسلۂ ملازمت پنجاب ، یوپی اور حیدرآباد کے مختلف شہروں میں رہے ۔ اس طرح انھیں مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کے گہرے مطالعے کے مواقع ملتے رہے ۔ دھلی کو جو مرکزی حیثیت حاصل تھی اس کی وجہ سے وہاں کی تہذیب و معاشرت ہندوستان کے عام مسلمان شرفا کے لیے ایک نمونہ تھی ۔ کچھ اس تمدنی یکسانیت اور کچھ نذیر احمد

کے مشاہدے کی وسعت کے سبب سے ان کے ناولوں میں زندگی کی جو تصویریں ہمیں ملتی ہیں اُن میں ایسی عمومیت پائی جاتی ہے کہ ہر مسلمان قاری کو، بقول ڈاکٹر عبدالحق مرحوم ''رہ رہ کر شبہ ہوتا ہے کہ کہیں اسی کے خاندان کے پتّرے تو نہیں کھول رہے ہیں'' - یہی وجہ ہے کہ جہاں سرشار کے فسانۂ آزاد میں ایک خاص طبقے، یعنی لکھنؤ کے رئیسوں اور اُن کے مصاحبوں کی زندگی ملتی ہے، وہاں نذیر احمد کے ناول عام مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت اور اُس دور کی عام ذہنیت اور سماجی تصورات کے آئینہ دار ہیں -

سوال یہ ہے کہ نذیر احمد کے ناولوں کا معاشرتی پس منظر محض خیالی تو نہیں ہے ؟ آیا انھوں نے زندگی کی صحیح عکاسی کی ہے یا کسی خاص نقطۂ نظر کے تحت اُسے مسخ کرکے پیش کیا ہے - مولانا حالی کا یہ قول اکثر نقل کیا جاتا ہے کہ '' مرأۃالعروس میں جو نقشہ عورتوں کی اخلاقی حالت کا کھینچا گیا، سر سید اس کو مسلمان شرفأ کی زنانہ سوسائٹی کے حق میں ایک اتہام خیال کرتے تھے'' حقیقت یہ ہے کہ سر سید دھلی کے ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے - اس طبقے کی خواتین تہذیب و شائستگی کا نمونہ تھیں - سر سید کا مشاہدہ شرفأ کے اعلیٰ گھرانوں تک محدود تھا ، لیکن نذیر احمد اول تو خود ایک متوسط گھرانے کے فرد تھے اور اُن کے مشاہدے کا دائرہ بھی وسیع تر تھا - انھوں نے مسلمانوں کی گھریلو زندگی کے جتنے پہلو پیش کیے ہیں وہ اُن کے حقیقی مشاہدات پر مبنی ہیں ، لیکن کسی فن کار سے یہ توقع نہ رکھنی چاہیے کہ وہ مورخ یا صحافی کی طرح خارجی نقطۂ نظر سے واقعات کی روداد لکھ دے گا - فن کار مشاہدات

کے خام مواد کو لے کر اپنے تخیل سے ایک نئی زندگی اور ایک نئی دنیا تخلیق کرتا ہے ۔ نذیر احمد کی حقیقت نگاری بھی تخیل کی رنگ آمیزی سے خالی نہیں۔

فسانۂ مبتلا میں گھریلو زندگی کے بے شمار پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں ۔ ابتدائی فصلوں میں مبتلا کی ولادت اور تربیت کے سلسلے میں مختلف رسم و رواج ، گنڈے تعویذ ، آسیب کے توہمات ، لاڈ پیار کے انداز، پھر شادی بیاہ کی رسموں ، رقعوں کی آمد و رفت، جہیز کے مطالبے ،عورتوں کے طعنے تشنے بیان کیے گیے ہیں ۔ چند درمیانی فصلوں کے بعد پھر گھریلو زندگی کی تفصیلات شروع ہوجاتی ہیں ۔ غیرت بیگم کی بد انتظامی ، ضعیف الاعتقادی ، ہریالی کا سگھڑ پن ، سوکنوں کی کٹا چھنی ، ماماؤں کنیزوں کے طور طریقے، غرض خانگی زندگی کے کئی دلچسپ اور عبرت ناک نقشے سامنے آتے ہیں ۔ ہر جگہ واقعیت کا یہ عالم ہے گویا ہم اپنے ہی تجربات کا عکس دیکھ رہے ہیں۔

نذیر احمد کے ناولوں کا مرکز اندرون خانہ کی زندگی ہے، لیکن ابن الوقت اور فسانۂ مبتلا میں معاشرت کے اندرونی و بیرونی پہلوؤں کا تناسب تقریباً برابر ہے اور یہیں اُن کے ذاتی تجربات کا رنگ زیادہ گہرا ہو گیا ہے ؛ مثلاً مبتلا کی تعلیم کے سلسلے میں جس مدرسے کا ذکر آیا ہے ، اس کی تمام تفصیلات نذیر احمد کی محبوب درسگاہ قدیم دہلی کالج پر پوری پوری منطبق ہوتی ہیں ۔ قرائن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ قصہ انقلاب سن ستاون سے پہلے کا ہے ۔ اُس زمانے میں جدید طرز کی یہی درسگاہ تھی جہاں عربی ، فارسی کے علاوہ جدید علوم کی تعلیم ہوتی تھی ۔ صدر معلم پرنسپل کہلاتا تھا ۔ سالانہ امتحان اور جماعت بندی کا طریقہ رائج تھا ۔ طلبہ کو وظائف ملتے تھے۔ سالانہ جلسے کی تقریب

میں انعامات اور تمغے دیے جاتے تھے ۔ بعض باتوں سے پتا چلتا ہے کہ مصنف نے خود اپنی تعلیمی زندگی کی یاد تازہ کی ہے ۔ مثلاً مبتلا بھی فارسی کی ابتدائی تعلیم کے باوجود مصنف کی طرح عربی کی جماعت میں داخل ہوا ۔ دونوں کی مدت تعلیم آٹھ سال تھی ، حتیٰ کہ خوش نصیب مصنف کی طرح کم بخت مبتلا نے بھی ایک سال تمغہ حاصل کیا ۔ جدید طرز کی درسگاہوں میں طلبہ کی اخلاقی گمراہی اور جنسی بے راہ روی کا نقشہ جس بے باکی سے نذیر احمد نے پیش کیا ہے اُس کی توقع عموماً اُن سے نہیں کی جاتی ۔ در اصل نذیراحمد نے اُس دور کے معاشرے کی دکھتی رگ کو چھیڑا ہے ۔ قومی زوال کے ساتھ ساتھ اخلاقی مفاسد بڑھتے جا رہے تھے اور نوجوان طبقہ ان مفاسد کا بری طرح شکار تھا ۔ امرد پرستی کی وبا شعراء کے حلقوں سے گزر کر مکاتب و مدارس کے طلبہ میں بھی پھیلی ہوئی تھی ۔ شریف گھرانوں کے چشم و چراغ اپنی زندگی کے اوقات رقص و سرود کی محفلوں اور بھانڈوں کی نقلیں دیکھنے میں گزارتے تھے ۔ اس ضمن میں بھانڈوں کی نقالی کا بیان ، فن نقالی اور نذیر احمد کی مرقع نگاری دونوں کا ایک نادر نمونہ ہے ۔ جائداد اور زہر خورانی کے مقدموں کے ضمن میں ناظر کی شاطرانہ چالوں اور کوتوال صاحب کی کارگزاری سے قانون دانوں اور قانون کے محافظوں کی دھاندلی ، رشوت کی گرم بازاری اور حق و انصاف کی پامالی کا حال منکشف ہوتا ہے ۔ چونکہ نذیر احمد کو بہ حیثیت ڈپٹی کلکٹر ایسے مقدمہ بازوں ، وکیلوں ، عدالتوں اور پولیس والوں سے برسوں سابقہ رہا ، لہذا اُن سے بڑھ کر انگریزوں کے نظام عدل کی پول اور کون کھول سکتا تھا ۔ فسانۂ مبتلا میں شہری زندگی کے علاوہ دیہاتی زندگی کی بھی ایک جھلک دکھائی گئی ہے ۔ سید نگر کے حالات

اگرچہ ضمناً بیان ہوئے ہیں، لیکن محض چند صفحات میں نذیراحمد نے ظالم و جابر اور مقدمہ باز زمینداروں کی زندگی کے بعض گوشوں کو بڑی ہنر مندی سے بے نقاب کیا ہے۔

ناول کا سن تصنیف ۱۸۸۵ء ہے، لیکن مختلف اندرونی شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ اس قصے کا تعلق انیسویں صدی کے نصف اول سے ہے۔ اس زمانے کو مد نظر رکھیے تو ناول میں بہت سی باتیں بداہۃً غلط معلوم ہوتی ہیں، مثلاً خفیہ پولیس کے آدمیوں کا میر متقی سے یہ پوچھنا کہ ''مہدی جنھوں نے مصر میں خروج کیا ہے، مہدی موعود ہیں یا نہیں'' تاریخی اعتبار سے غلط ہے۔ ناول کی تصنیف کا زمانہ یقیناً مہدی سودانی کے عروج و خروج کا زمانہ تھا، لیکن ناول میں میر متقی اور مبتلا کے یہ واقعات اُس سے چالیس پچاس سال پہلے کے ہیں۔ اسی طرح کابل کی حکومت سے انگریزوں کی چھیڑ چھاڑ اور ترکوں سے کشیدگی بہت بعد کی باتیں ہیں۔ ناول میں ان واقعات کی طرف بھی اشارے موجود ہیں۔ اُس زمانے میں دھلی و نواح دھلی کا علاقہ صوبۂ پنجاب کے ماتحت نہیں تھا، نہ اُس علاقے کی تقسیم ضلعوں، تحصیلوں اور پرگنوں میں ہوئی تھی، لیکن سید ناظر اپنے ماموں کے خلاف لیفٹننٹ گورنر کے پاس گمنام عرضی ارسال کرتا ہے اور سید حاضر جایداد کے بٹوارے کے بارے میں اپنی درخواست کو رجسٹری کرا کے حاکم پرگنہ (یعنی ڈپٹی کلکٹر) کے نام بھیجتا ہے۔ اسی طرح مقدمے کے سلسلے میں کلکٹری اور دیوانی کی عدالتوں اور عدلیہ و انتظامیہ کی اُن تمام کارروائیوں کا ذکر آتا ہے جو بعد کے نظم و نسق سے تعلق رکھتی ہیں۔ انقلاب سے پہلے دھلی کا کوتوال عموماً کوئی معزز خاندانی مسلمان ہوا کرتا تھا،

لیکن نذیر احمد نے یہ منصب "لالہ لکھنی چند" کو سونپ دیا ہے ۔ علاوہ ازیں ناول میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو اُس عہد کے لحاظ سے بعید از قیاس معلوم ہوتی ہیں ، مثلاً میر متقی کا اپنے وعظ میں گھڑی کے کل پرزوں کی مثال دینا اور یہ کہنا کہ "مدرسوں کی تعلیم کوک ہے اور ریگولیٹر ندارد" دو سوکنوں کی یک جائی کے لیے سید حاضر کا سوڈا اور ایسڈ کے ملنے کی تشبیہ پیش کرنا ، مبتلا کا تعجب سے یہ کہنا "کیا انگریزوں کی عمل داری میں یہی انصاف ہے؟" زہر خورانی کی واردات میں ہریالی کی ماما کو ہسپتال پہنچانا اور وہاں ڈاکٹر کا پچکاری سے پیٹ صاف کر کے خارج شدہ مادے کا کیمیائی تجزیہ کرنا ، ولایت کی مس بیلی کا شرفاء کے گھروں میں دایہ گیری کے لیے آنا جانا —— ان سب باتوں سے کچھ ایسا مترشح ہوتا ہے کہ دھلی کی سیاسی و معاشرتی زندگی پر انگریزی اقتدار اور مغربی تہذیب کے سائے بہت گہرے ہو چلے تھے ، لیکن زمانۂ تاریخی کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ امر خلاف واقعہ ہے ۔ مختصر یہ کہ نذیر احمد نے فسانۂ مبتلا میں تاریخی واقعیت کو ملحوظ نہیں رکھا اور بہت سی اغلط بے جوڑ باتیں بیان کرتے چلے گیے ہیں ۔

★

ناول کا تعلق انسانی زندگی اور اس کے مختلف مظاہر سے ہے ، لیکن ناول نگار زندگی کا محض عکاس نہیں ہوتا، وہ مبصر اور فن کار بھی ہوتا ہے ۔ زندگی کے مشاہدات و تجربات فنکار کی شخصیت کے سانچے میں ڈھل کر ایک نیا روپ اختیار کر لیتے ہیں ۔ پھر جو فن پارہ ظہور میں آتا ہے اس میں مشاہدے کی واقعیت کے علاوہ احساس و تاثر کی گرمی ، فکر و نظر کی

روشنی اور تخیل کی رنگینی ـــــ یہ تمام عناصر بھی شامل ہوتے ہیں ۔ اس طرح ناول زندگی کی تصویر بھی ہوتا ہے اور تفسیر و تنقید بھی ۔ ناول نگار زندگی کا ترجمان بھی ہوتا ہے اور مصلح و رہنما بھی ، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ مصلح اور معلم کا لبادہ اوڑھ کر ادب و فن کی بارگاہ میں قدم نہ رکھے ۔ اس کا اصلاحی مقصد زندگی اور فن پر حاوی نہ ہونے پائے ۔ وہ کھلم کھلا تبلیغ نہ کرے ، ورنہ ادب پروپاگنڈا کی پستیوں میں جا گرے گا ۔ نذیر احمد بہ ایں جبہ و دستار ، بڑی بے تکلفی سے ادب کے ایوان میں در آئے ۔ یہ اُن کی ایک اجتہادی غلطی تھی ، لیکن اُن کے ناولوں کو ''عمرانی مقالہ'' یا ''اخلاقی تمثیل'' ثابت کرنے سے پہلے ہمیں اُن کی تصانیف کے تاریخی و معاشرتی پس منظر کا جائزہ لینا چاہیے ۔ تبھی ہم نذیر احمد اور اُن کے فن کا صحیح مقام متعین کر سکیں گے ۔

انسانی ہمدردی اور زندگی کو بہتر بنانے کا جذبہ ، حیات و کائنات کا وسیع مطالعہ ، معاشرتی شعور ، ایک واضح نقطۂ نظر ، اپنے مشاہدات و تاثرات کو آزادی سے پیش کرنے کی جرأت ، زبان و بیان پر قدرت ـــــ غرض نذیر احمد اُن تمام اوصاف کے حامل تھے جو ایک قصہ گو کو عظیم فن کار بناتے ہیں ، لیکن وہ ایک ایسے دور کے ادیب تھے جب شعر و ادب میں مقصدیت کا رجحان بڑی شدت سے کارفرما تھا ۔ انھوں نے جب مقصدی ناول کا ہیولیٰ تیار کیا اُس وقت نہ تو فن کا کوئی اعلیٰ معیار ان کے سامنے تھا اور نہ اس راہ میں تنقید کے چراغ روشن ہوئے تھے ، لہذا قدیم داستانوں کی حد سے زیادہ تخیلی رومانیت کے رد عمل میں جدید ناول کی واقعیت اور مقصدیت بھی حد اعتدال سے گزر گئی ۔ پھر یہ کہ اس کے قارئین نہ مذہب سے اتنی مغائرت

رکھتے تھے اور نہ اُن کا فنی شعور اتنا بیدار تھا کہ قصے کے دوران میں دین و اخلاق کی باتیں اُن کے لیے بے لطفی کا باعث ہوتیں اور یہ باتیں کچھ اس سلیقے اور ایسے شگفتہ انداز میں کہی گئی ہیں کہ وعظ و پند کی خشکی اور بے کیفی کا احساس بھی کہیں نہیں ہوتا ۔ پھر یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ نذیر احمد نے مقصد کے لیے زندگی کو مسخ نہیں کیا اور نہ براہ راست تبلیغ کی ، بلکہ اکثر اپنے کرداروں کے مکالموں سے اپنے نظریات کے اظہار کا کام لیا ہے ۔ اس طرح اگرچہ مکالمے بعض جگہ طویل ہوجاتے ہیں ، لیکن کرداروں کی شخصیت اور قصے سے اُن کا تعلق عموماً قائم رہتا ہے ۔

نذیر احمد کے ناولوں میں جہاں کہیں نصوح ، مولوی مستجاب ، حجۃالاسلام ، میر متقی اور سید حاضر جیسے دین دار کردار ہمیں نظر آتے ہیں ، ہم انھیں مصنف کی مولویت کا پرتو سمجھنے لگتے ہیں ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب اُس معاشرے کے عام جانے پہچانے کردار ہیں ۔ دھلی انقلاب سن ۵۷ سے پہلے اور اس کے بعد بھی دینی علوم کا سب سے بڑا گہوارہ تھی ۔ شہر میں مولویوں اور عالموں کے بے شمار خاندان آباد تھے ، بلکہ تقریباً ہر گھرانے میں عالم موجود تھے ۔ عام تعلیم یافتہ مسلمان بھی دینی علوم سے بے بہرہ نہ تھے ۔ شرفاء کی گفتگو میں آیات و احادیث کے حوالے اور دینی و علمی اصطلاحیں عموماً آتی تھیں ۔ اہل علم کی صحبتوں میں دینی مسائل پر مباحثے و مناظرے ہوتے تھے ۔ گھر کے بزرگ ، چھوٹوں کو نصیحت کرتے تو ان کی باتوں میں مولویانہ خطابت کا رنگ ہوتا تھا ، لیکن جب ہم نذیر احمد کے ناولوں میں اس انداز کے مکالمے پڑھتے ہیں تو اُن کے فن پر نکتہ چینی

کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ بھی اُس معاشرے کے حقیقی پہلو ہیں۔

نذیر احمد کے بعض ناولوں میں وعظ کے عنوان سے جو طویل تقریریں درج ہیں اور جو فنی اعتبار سے سب سے زیادہ قابل اعتراض ہیں، اُن کے لیے بھی اُس دور کے معاشرتی حالات میں ایک وجہ جواز ملتی ہے۔ دھلی میں اس وقت وعظ گوئی اور خطابت کا فن انتہائی عروج پر تھا، حتیٰ کہ پیشہ‌ور واعظوں کا ایک مستقل طبقہ پیدا ہو گیا تھا۔ چوک سعداللہ خاں جو دھلی کا ایک پر رونق بازار تھا، اس لحاظ سے دھلی کا ''ھائیڈ پارک'' بھی تھا۔ فرق یہ ہے کہ لندن والے ھائیڈ پارک میں نوآموز مقرر فن تقریر کی مشق کیا کرتے ہیں اور یہاں بڑے بڑے کہنہ مشق، جادو بیان واعظ اپنے اپنے اڈوں پر وقت و موسم کی مناسبت سے تقریریں کیا کرتے تھے۔ مساجد میں سال بھر تفسیری خطبات کے سلسلے جاری رہتے تھے۔ شادی و غمی کے موقعوں پر گھروں میں بھی مجالس وعظ منعقد ہوتی تھیں۔ ''ایامیٰ'' میں مولوی مستجاب کی وفات پر آزادی بیگم کی تسلیٔ خاطر کے لیے مولوی مقتدیٰ کی تقریر اور فسانۂ مبتلا میں ایک ایسے ہی موقع پر میر متقی کا تعزیتی وعظ رواج عام کے عین مطابق ہے۔ اسی طرح میر متقی کی دیگر تقریریں اور عارف و مبتلا کے مباحثے اُس دور کی مناظرہ بازی اور خطابت پسندی کے رجحانات کی نشان دھی کرتے ہیں۔

ان توجیہات سے نذیر احمد کے عیب کو ہنر ثابت کرنا مقصود نہیں، بلکہ اس حقیقت کا اظہار مطلوب ہے کہ نذیر احمد اپنی فنی کوتاھیوں کے لیے بڑی حد تک معذور بھی تھے۔ وہ تو خیر مبتدی تھے، مقصدیت کو فن کے پردے میں چھپانے اور

اپنے نظریات کو غیر محسوس طور پر قارئین کے دلوں میں اتار دینے کا سلیقہ ایک صدی بعد بھی ہمارے ناول نگاروں کو اب تک نہیں آیا ۔ یہ ایسا نازک مرحلہ ہے جہاں بڑے بڑوں کے پاؤں ڈگمگا جاتے ہیں اور بعض اوقات ناول گھٹیا درجے کا پروپاگنڈا بن کر رہ جاتا ہے ؛ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نذیراحمد اپنے اصلاحی مقصد میں جس حد تک کامیاب رہے ، اُردو کے کسی مقصدی ادیب کو اتنی کامیابی آج تک نصیب نہیں ہوئی ۔

نذیر احمد کے افکار و نظریات پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ، اُن میں سے ہر ایک پر بحث کرنا مزید طوالت کا باعث ہوگا ، یہاں صرف عام غلط فہمیوں کا ازالہ ضروری ہے ۔ ہمارے بعض فضیلت مآب نقادوں نے نذیر احمد کو ''کٹھ ملا'' یا ''ملائے مسجدی'' مشہور کر رکھا ہے ۔ اس روایت کے برعکس نذیر احمد کے تصورات و نظریات میں عموماً وہی معقولیت جلوہ فرما نظر آتی ہے جو سرسید اور اُن کے رفقاء کے فکری رجحانات کا بنیادی وصف ہے ، بلکہ انھوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں علماء کے فکری جمود اور تنگ نظری کے خلاف بڑی جرأت و بے باکی سے احتجاج کیا ہے ، خصوصاً ابن‌الوقت اور ایامیٰ میں مولویوں کی بے عملی ، فرقہ بندی ، مناظرہ بازی ، کج بحثی اور دنیا سازی کا پردہ اس طرح فاش کیا کہ اس دور کے ادب میں اس کی کہیں مثال نہیں ملتی ۔ انھوں نے بہت سے معاملات میں ، علماء کی روایت پرستی اور سرسید کی تجدد پسندی کی دو انتہاؤں کے درمیان نقطۂ اعتدال قایم کرنے کی کوشش کی ۔ وہ اُن تمام تعصبات اور رسم و رواج کی اُن سب خرابیوں کی اصلاح کرنی چاہتے تھے جو قومی ترقی کی راہ میں حائل تھیں ، لیکن مغربی تہذیب کی کورانہ تقلید کے وہ قائل نہ تھے ۔ انھیں اس بات

پر کامل ایمان تھا کہ مسلمان ، مسلمان رہ کر ہی ترقی کر سکتا ہے ۔ اُن کے نزدیک اصلاح معاشرہ کی غرض و غایت صرف یہ تھی کہ اسلام کے روشن اصولوں پر اوہام باطل ، تقلید جامد اور جاہلانہ رسوم کے جو پردے پڑے ہوئے ہیں انھیں ایک ایک کار کے اٹھا دیا جائے۔ انھوں نے اپنے عہد کی زندگی اور معاشرے کا اسی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ، لہذا اُن کے ناولوں میں اُن دینی ، اخلاقی اور تہذیبی قدروں کا ذکر آنا ضروری تھا جن پر اس معاشرے کی بنیاد تھی ۔ نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں وضو اور طہارت کے مسائل بیان نہیں کیے ، بلکہ اُن ابدی قدروں کی تبلیغ کی ہے جن پر ہر قوم اور ہر معاشرے کے فروغ و بقا کا انحصار ہے ۔ وہ اپنی قوم کے افراد میں وہ بنیادی صفات پیدا کرنا چاہتے ہیں جن کے بغیر نہ کوئی قوم دنیا میں پنپ سکتی اور نہ کوئی معاشرتی نظام قایم رہ سکتا ہے ، مثلاً اپنے فرائض اور دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کا خیال ، باہمی معاملات میں انصاف و رواداری ، خانگی زندگی میں اخلاص و محبت ، سادگی اور کفایت شعاری ، محنت اور کام کی عظمت کا احساس ـــــ یہ بنیادی تصورات ان کے ہر ناول میں غیر محسوس طور پر سموئے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض اہم مسائل ہیں جو زیادہ اُبھار کر پیش کیے گیے ہیں ، مثلاً فسانہ مبتلا میں جن مسائل پر خاص زور دیا گیا ہے ۔ اُن میں تعدد ازواج سب سے اہم ہے ۔ نذیر احمد نے اس مسئلے کو خالص سماجی حیثیت سے پیش کیا ہے ۔ تعدد ازواج شرعاً ممنوع نہیں ، ہاں اس سے خانگی زندگی میں بسا اوقات الجھنیں پیدا ہوتی ہیں ۔ مبتلا اور عارف کے مناظرے میں بھی انھوں نے تعدد ازواج کے شرعی جواز سے انکار نہیں کیا ، بلکہ اس کے خلاف یہ دلیل پیش کی ہے کہ ازدواجی معاملات میں شریعت نے جو حقوق عورتوں

کو دیے ہیں ، رسم و رواج نے انھیں سلب کر لیا ہے ۔ ہمارے معاشرے میں اُن تمام شرعی احکام کی پوری پوری تعمیل نہیں ہوتی جو حسن معاشرت کے لیے ضروری ہیں ، اس لیے ہمارے یہاں تعدد ازواج سے بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ سوکنوں میں باہمی رقابت کا ہونا فطری امر ہے ۔ اس رقابت اور محاسدے سے خانگی زندگی نہایت تلخ ہو جاتی ہے ۔ مقصدی حیثیت سے ناول نگار پر یہ اعتراض ضرور ہو سکتا ہے کہ مبتلا کا حسرت ناک انجام تعدد ازدواج سے کہیں زیادہ اس کی نفسیاتی کمزوریوں اور ناسازگار حالات کا نتیجہ ہے ۔ اگر ناول کا ہیرو مبتلا کے بجائے میر متقی ، یعنی خود نذیراحمد جیسا جہاندیدہ اور پختہ کردار انسان ہوتا تب بات بنتی ۔ واضح ہو کہ اس ناول کی تصنیف اور ''دو شادیاں نہ کیجیو زنہار بھول کر'' کی تاکید کے باوجود خود نذیر احمد بھی اپنے مجبوری اعزا ، خصوصاً والدۂ ماجدہ کے اصرار پر عقد ثانی کے دام میں گرفتار ہو گیے تھے ، لیکن ذاتی تجربے کے بعد انھیں قدر عافیت معلوم ہوئی اور بہت جلد اس پھندے سے نکل آئے ۔

تعدد ازدواج کی طرح دیگر مسائل بھی جو اس ناول میں نمایاں طور پر پیش کیے گیے ہیں ، عام معاشرتی مسائل ہیں ۔ مثلاً تعلیم و تربیت کا مسئلہ لیجیے ، یہ ہر معاشرے کا ایک بنیادی مسئلہ ہے ۔ ماں کی آغوش تعلیم و تربیت کی پہلی منزل ہے ۔ مبتلا کا کردار اس حقیقت کی روشن مثال ہے کہ شخصیت کی تعمیر میں خانگی ماحول کے اثرات کتنے دور رس اور دیرپا ہوتے ہیں ۔ تعلیم و تربیت کی دوسری منزل مکتب اور مدرسہ ہے ۔ ناول میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ پرانے مکاتب کے ''میاں جی'' ہوں یا جدید مدارس کے ماسٹر صاحبان سبھی عموماً کردار سازی کے

منصب کے نا اہل ہوتے ہیں یا اس فریضے سے غافل ۔ ایک اور معاشرتی مسئلہ بھی ضمناً اس قصے میں آ گیا ہے ۔ رسم و رواج کی خرابی سے عورتیں عموماً میراث کی تقسیم میں اپنے جائز حق سے محروم رہ جاتی ہیں ۔ اس سلسلے میں نذیر احمد نے حقوق العباد کی اہمیت واضح کر کے مذہبی نظام کے معاشرتی پہلو کو خاصا نمایاں کر دیا ہے ۔

نذیر احمد کے بارے میں ایک غلط فہمی یہ بھی پھیلائی جا رہی ہے کہ وہ اپنی ملائیت کی وجہ سے فنون لطیفہ ادب اور ثقافت سب کے دشمن تھے ۔ فنون لطیفہ میں سے رقص و موسیقی وغیرہ کے بارے میں نذیر احمد کا رویہ ان کے ہم عصر مفکروں، قومی شاعروں اور مقصدی ادیبوں سے کسی طرح مختلف نہ تھا ۔ وہ اس معاشرے کو جو رنگیلے شاہ اور جان عالم پیا کی تعیش زدگی اور طوائف الملوکی کے ہاتھوں تباہ ہو چکا تھا ، حیات نو کا پیغام دینا چاہتے تھے ۔ شعر و ادب میں بھی وہ اس دور کے دیگر اکابر کی طرح مقصدیت کے حامی اور اس روایتی ادب کے مخالف تھے جس کا رشتہ زندگی سے کٹ چکا تھا ۔ ہم ادب اور زندگی کی بحث یہاں چھیڑنا نہیں چاہتے، لیکن فسانۂ مبتلا کے حوالے سے نذیر احمد کے اصل موقف کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں ۔ پرانے مکاتب میں فارسی کی عاشقانہ شاعری سے بچوں کے تدریسی سلسلے کا آغاز ہوتا تھا ۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فسانۂ مبتلا کے ابتدائی ابواب میں وہ لکھتے ہیں ''جن باتوں کی بھننگ کان میں پڑنا نو جوانوں کے حق میں سم قاتل ہے ، سبقاً سبقاً ازبر کرائی جاتی ہیں.....'' پھر دوسری فصل کے خاتمے پر یہ عبارت ہے :''.....اکثر کتابیں نظم.....مضمون دیکھو تو جھڑا عاشقی ، جن کے نام سے نو عمر آدمی کے منہ میں رال بھر آئے ۔ مادہ قابل ، طبیعت مناسب.....

غرض فیضان مکتب سے حضرت میں ایک صفت اور پیدا ہوئی یعنی عاشق مزاجی—، اس حقیقت سے کسے انکار ہو گا کہ تعلیم کے ابتدائی مدارج میں نا پختہ ذہن و کردار کے نو عمر طلبہ کو فارسی یا اردو شعراء کا عشقیہ کلام پڑھانا تعلیم کے کسی اصول کی رو سے درست نہیں ہے ۔ ہمارے قدیم و جدید ادب میں ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو ادبی مذاق کی تربیت کے لیے طلبہ کو پڑھائی جاسکتی ہیں، لیکن نصاب تعلیم میں صحیح انتخاب کا فقدان پہلے بھی تھا اور اب بھی کسی حد تک باقی ہے ۔

★

سرسید کے رفقاء میں سے نذیر احمد اور ذکاءاللہ دونوں کے ذہنی رجحانات ان کے حلقۂ اثر میں آنے سے پہلے قدیم دہلی کالج کی آغوش تربیت میں تشکیل پا چکے تھے ۔ یہ دونوں اس فضا کے پروردہ تھے جہاں جدید علوم کی روشنی شمالی ہند میں سب سے پہلے نمودار ہوئی اور جہاں ترجمہ ، تالیف و تصنیف کے ذریعے سے اردو کو ایک عملی زبان بنانے کی اولین کوشش بڑی سرگرمی سے شروع ہو چکی تھی ۔ نذیر احمد نے اس درس گاہ سے بہت کچھ فیض اٹھایا ۔ یقیناً یہیں انھوں نے صاف ستھری زبان میں اظہار و ابلاغ کا ابتدائی سبق بھی سیکھا ہو گا اور قانونی کتب کے تراجم میں دہلی کالج کی ''ٹرانسلیشن سوسائٹی'' کی کارگزاریوں سے انھیں رہنمائی بھی ملی ، لیکن ناولوں میں ان کا اسلوب تراجم کے خشک ، سنجیدہ علمی انداز اور قدیم داستانوں کی پرتکلف زبان سے بہت مختلف تھا ۔ اس اسلوب میں اچھوتے پن کے باوجود چند اثرات کی جھلک صاف طور سے نظر آتی ہے ۔ نذیر احمد کے عہد سے نصف صدی قبل میر امن نے سب سے پہلے دلی کے روز مرے کا حادو جگایا تھا ۔ ابھی ان کے میٹھے بول کانوں میں گونج رہے

تھے کہ خود نذیر احمد کے زمانے میں غالب نے مراسلے کو مکالمہ بنا کر اردوئے معلیٰ کا نقش جمایا ۔ اگرچہ عود ہندی (۱۸۶۸ء) اور مراۃ العروس ۱۸۶۹ء کی اشاعت میں صرف ایک سال کا فرق ہے، لیکن غالب کے خطوط اس سے بہت پہلے ادبی سوغات بن چکے تھے ۔ قیاس یہ ہے کہ نذیر احمد مرزا کی شوخی تحریر سے ضرور متأثر ہوئے ہوں گے ۔ دہلی کی شستہ زبان کو شگفتہ پیرایے میں لکھنے کا سلیقہ انھوں نے میر امن اور ان سے زیادہ غالب سے سیکھا ہو گا ، مگر چونکہ نذیر احمد نے اپنے ابتدائی ناول عورتوں کے لیے لکھے جن میں گھریلو زندگی کے نمونے تھے ، لہذا ان کی زبان پر زنانہ محاورات کا رنگ زیادہ چھا گیا ۔ انھی ایام میں نذیر احمد کے ایک ہم جماعت منشی پیارے لال آشوب نے محکمۂ تعلیم پنجاب کے لیے چند قصے لکھے تھے ۔ آشوب کا قصہ ''من سکھی اور سندر سنگھ'' غالباً اردو کا پہلا افسانہ ہے جس میں حقیقی زندگی کی عکاسی کے لیے عام بول چال کی زبان ، منظر کشی کا بے تکلف بیانیہ انداز اور مکالمہ نگاری کا جدید اسلوب اختیار کیا گیا ہے ۔ ممکن ہے ''رسوم ہند'' (مطبوعہ۱۸۶۸ء) جس کے ابتدائی ابواب آشوب کے قصوں پر مشتمل ہیں) کی اشاعت سے پہلے یہ قصے نذیر احمد کی نظر سے گزرے ہوں اور انھوں نے سادہ زبان میں معاشرتی حالات کی تصویر کشی اور مکالمہ نگاری کا گر آشوب سے سیکھا ہو ۔

ان شعوری یا غیر شعوری اثرات کے باوجود نذیر احمد کا اسلوب ایک انفرادی شان رکھتا ہے ۔ ان کی آواز جو کبھی نرم و شیریں ہوتی ہے اور کبھی نہایت پرخروش ، ہر رنگ میں صاف پہچانی جاتی ہے ۔ بفون (Buffon) کا یہ مشہور قول کہ ''اسلوب ہی مصنف ہے'' نذیر احمد کے انداز تحریر پر پوری

طرح صادق آتا ہے ۔ ان کی بے تکلفی ، صاف گوئی ، نکتہ سنجی اور شوخی و ظرافت کے جلوے تحریر میں ہر جگہ نمایاں ہیں ۔ مکالمے ہوں یا محاکاتی اور بیانیہ ٹکڑے ، ہر موقع پر ان کا لب و لہجہ بے تکلف گفتگو کا سا ہوتا ہے ۔ ان کی خوش مذاقی جا بجا طنز و تمسخر کے پہلو نکال لیتی ہے ۔ کہیں کہیں ثقیل و کرخت الفاظ اور لہجے کا پر شور آہنگ ان کی شخصیت کے جلالی پہلو اور ان کی طبیعت کے زور و قوت کی نمایندگی کرتا ہے — وہ شخصیت جس کے بارے میں سی ۔ ایف ۔ اینڈریوز کے تاثرات یہ ہیں : ''ان میں چٹان کی سی قوت اور عزم تھا..... مولوی نذیر احمد سے گفتگو کرنا درحقیقت اس امر سے واقف ہونا تھا کہ انسان ایک ایسی آتش فشاں ہستی سے دو چار ہو رہا ہے جو ایک لفظ سے مشتعل ہو سکتی ہے اور ہیجان یا طوفان میں منتقل ہو سکتی ہے.....ان کے روبرو میں یہ محسوس کرتا تھا کہ میں ایک بہت بارعب شخصیت اور ایک غیر معمولی قابلیت کے انسان کے سامنے بیٹھا ہوں ۔ ،، (تذکرہ مولوی ذکاءاللہ دہلوی—ص ۲۰) ۔ یہ بلند آہنگی جو ان کی تقریروں میں خطابت کی گھن گرج پیدا کرتی ہے ، ان کے ناولوں میں اکثر اس جگہ پائی جاتی ہے جہاں غم و غصے کے شدید جذبات کا اظہار ہوتا ہے ، لیکن عموماً ان کی عبارتوں میں چھوٹے چھوٹے متوازن فقروں کی ترتیب ، کبھی ہم وزن الفاظ کے استعمال اور کبھی لفظوں کی تکرار سے ایک مدھم موسیقی کی خوش آہنگی پائی جاتی ہے ۔

مکالموں کے سلسلے میں ذکر آ چکا ہے کہ نذیر احمد دہلی کی بیگماتی اور عوامی زبان ، محاورات و امثال کے بادشاہ ہیں ، مگر اس کے ساتھ ہی وہ ''لغت ہائے حجازی'' کے ''قارون'' بھی ہیں ۔

یہ دو رنگی (یعنی عوامیت اور مولویت) زبان کی طرح ان کی شخصیت کا ایک مستقل جزو تھی ۔ عوام دوستی کے جذبے اور عوامی زندگی سے گہرے لگاؤ کی بنا پر وہ زبان کے معاملے مین اشرافی تکلفات اور چھوت چھات کے قائل نہیں ۔ ٹھیٹھ عوامی بول چال کے خزف ریزوں کو وہ اپنی تحریر میں نگینے کی طرح جڑ دیتے ھیں ۔ روزمرے اور محاورے کے استعمال میں بھی انھوں نے بڑی کشادہ دلی کا ثبوت دیا ھے ۔ بعض محاورات تو ایسے ھیں جنھیں سن کر خود دھلی والے بھی کانوں پر ھاتھ رکھتے ھیں۔ بہر حال ناول میں بے ساختہ و بے تکلف زبان کا یہ انداز کھپ جاتا ھے ، خصوصاً مکالموں مین تو اس کے جوھر اور بھی کھل جاتے ھیں ، لیکن مذھبی تصانیف میں محاورہ بازی کا یہ شوق ان کے لیے بالآخر باعث رسوائی ھوگیا۔ دوسرا رنگ مولویت یا علمیت کا ھے ۔ اگرچہ عربی و فارسی کے ثقیل الفاظ و تراکیب ، علمی اصطلاحات ، آیات و اقوال وغیرہ اس دور کے اھل علم طبقے کے روزمرہ میں شامل تھے اور یہ بات بھی ھے کہ اُن کے ناولوں میں کہیں کہیں ایک خاص مذھبی پس منظر اور بعض کرداروں کے انفرادی رنگ کو نمایاں کرنے کے لیے یہ مولویانہ زبان ھی کام آ سکتی تھی ، لیکن ان کی عام تحریر مین اس قسم کے ثقیل و غریب الفاظ ۔ حد کھٹکتے ھیں ۔

نذیراحمد کی تحریر میں ایجاز و اختصار کی جگہ اطناب و تفصیل کا انداز پایا جاتا ھے ۔ وہ اپنے قارئین کے فہم و فراست پر کبھی اعتماد نہیں کرتے اور جب تک ھر معاملے کے مختلف پہلوؤں کو کھول کر نہیں رکھ دیتے انھیں چین نہیں آتا ۔ تعلیم و تلقین کا جوش ، جزئیات نگاری اور کبھی خود نمائی کا شوق انھیں بسیار نویسی پر مجبور کر دیتا ھے ۔ ان کے اسلوب میں قدیم

انشا پردازوں کی لفاظی و صناعی کا رنگ بھی جا بجا جھلکنے لگتا ہے۔ مثلاً کہیں مترادف الفاظ کی بھر مار ہوتی ہے ، کہیں ایک جملے میں درجنوں اسماء و صنعات کا ڈھیر لگا دیتے ہیں ، کہیں فقروں میں سجع و قافیہ کا التزام ہوتا ہے ، مگر یہ ان کی تحریر کا عام انداز نہیں ہے ۔

اس افراط و تفریط کے باوجود نذیر احمد کا اسلوب بحیثیت مجموعی ، نہایت مؤثر اور دلکش ہے ۔ دراصل یہی سب سے بڑی خوبی ہے جس نے ان کے ناولوں کی بعض فنی خامیوں پر پردہ ڈال دیا ہے ؛ حتیٰ کہ جہاں کہیں وہ واعظ بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں ، وہاں بھی ان کے بیان کی شگفتگی پر بقول ریاض ''قلقل مینا'' کا گمان ہوتا ہے :

اتنی تو ہو بیان میں واعظ شگفتگی
ہم رند سن کے قلقل مینا کہیں جسے

(پروفیسر) افتخار احمد صدیقی
صدر شعبۂ اردو ۔ اسلامیہ کالج
(سول لائنز) لاہور

نذیر احمد کی مختصر سوانح عمری

شمس العلماء ڈاکٹر مولوی. نذیر احمد ۳۱-۱۸۳۰ء کے قریب[۱] ، اپنی ننھیال ، موضع ریھڑ تحصیل نگینہ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے - ان کے جد اعلیٰ شاہ عبد الغفور اعظم پوری اپنے وقت کے مشاہیر اولیاءاللہ اور حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوھوی رح کے خلفاء میں تھے - ان کے ننھیالی بزرگوں میں بھی بہت سے علماء وقضات کے نام ملتے ھیں - نذیر احمد کی عمر چار سال کی تھی کہ وہ اور اُن کے بڑے بھائی علی احمد اپنے والدین کے ساتھ ریھڑ سے بجنور آ گیے ، جہاں اُن کا آبائی مکان تھا - ان کے والد مولوی سعادت علی صاحب معلمی کرتے تھے - نذیر احمد نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور اپنی فطری ذھانت کی وجہ سے کم عمری ھی میں فارسی کی متداول کتابیں ختم کر لیں ، پھر حضرت مولانا نصر اللہ خاں صاحب خورجوی رح سے عربی پڑھنے لگے - مولانا نصر اللہ خاں بجنور میں ڈپٹی کلکٹر اور ایک درویش صفت عالم تھے - اپنے بلند منصب اور سرکاری

---

۱ - نذیر احمد کی سوانح عمری ''حیات النذیر'' میں سن پیدایش ۱۸۳۶ء درج ھے - دیگر تذکرہ نگار بھی حیات النذیر کی سند پر یہی سن ولادت نقل کرتے آئے ھیں ، لیکن نذیر احمد کی تعلیم و تربیت کے مختلف مراحل اور دیگر واقعات کو پیش نظر رکھتے ھوئے یہ سن صریحاً غلط معلوم ھوتا ھے - اب تک کوئی ایسی شہادت نہیں ملی جس کی بنا پر سال ولادت متعین ھو سکے ، لیکن تحقیق کی رو سے ۱۸۳۱ء زیادہ صحیح اور قرین قیاس ھے -

مصروفیات کے باوجود انھیں درس و تدریس کا شوق تھا ۔ طلبہ کی ایک جماعت کو گھر پر پڑھاتے بلکہ ، بہتوں کی کفالت بھی کرتے تھے ۔ نذیر احمد کے والد اور دادا سے اُن کے مراسم تھے۔ نذیر احمد اور اُن کے بھائی کو اپنی نگرانی میں لے لیا اور اس توجہ سے پڑھانے لگے کہ دورے میں بھی ان بچوں کو اپنے ساتھ رکھتے تھے ۔ تقریباً پانچ برس تک نذیر احمد نے ڈپٹی صاحب سے عربی صرف و نحو ، منطق اور فلسفہ پڑھا ۔ چودہ برس کی عمر تھی کہ ڈپٹی صاحب کے مشورے کے مطابق اُن کے والد انھیں دھلی لے گیے اور پنجابی کٹرے کی اورنگ آبادی مسجد کے مدرسے میں مولوی عبد الخالق صاحب کے حوالے کر دیا ۔ اس مدرسے میں انھیں بڑی مصیبتیں جھیلنی پڑیں ۔ محلے میں گھر گھر روٹے مانگنے کے لیے جانا پڑتا تھا ۔ طلب علم کی خاطر ٹکر گدائی کی ذلت بھی گوارا کرتے رہے ۔ حسن اتفاق سے جنوری ۱۸۴۵ء میں نذیر احمد اور اُن کے بھائی علی احمد کا داخلہ قدیم دھلی کالج میں ہو گیا ۔ شمالی ہند میں یہ پہلی درس گاہ تھی جہاں مشرقی اور مغربی علوم ایک ساتھ پڑھائے جاتے تھے اور طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لیے وظائف و انعامات بھی دیے جاتے تھے ۔ کالج میں داخل ہوتے ہی نذیر احمد اور اُن کے بھائی کو دو دو روپیہ وظیفہ ملنے لگا جو بڑھتے بڑھتے چوبیس روپے تک پہنچ گیا ۔ دھلی کالج میں منشی ذکاءاللہ ، مولانا محمد حسین آزاد اور منشی پیارے لال آشوب وغیرہ اُن کے ہم جماعت تھے ۔ ۱۸۵۴ء تک کالج میں زیر تعلیم رہے ۔ اس کالج کی تعلیم نے انھیں جدید خیالات اور مغربی علوم و فنون کی روح سے آشنا کیا اور اُن کے ذہنی افق کو بہت وسیع کردیا ۔ کالج کی تعلیم کا آخری زمانہ تھا کہ بجنوری اعزا کی مرضی

کے خلاف ، بلکہ اُن کی لاعلمی میں ، اُن کی شادی پنجابی کٹرے کے مولوی عبدالخالق صاحب کی پوتی سے ہوگئی ۔ مفتی صدرالدین خان آزردہ نے خطبۂ نکاح پڑھا ۔ شادی ہونے کے بعد وہ سسرال میں رہنے لگے ۔ ۱۸۵۴ء میں کنجاہ ضلع گجرات (سابق پنجاب) میں چالیس روپے ماہوار کے مدرس ہوئے ۔ دوسال بعد ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوکر کانپور چلے گئے ۔ یہاں انگریز انسپکٹر سے کچھ ان بن ہوگئی ، استعفیٰ دیا اور دھلی آگئے ۔ پہنچتے ہی ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوگیا ۔ اس ہنگامے میں نذیراحمد کے سسرالی اعزا (مولوی عبدالقادر صاحب اور علامہ نذیر حسین صاحب) نے ایک انگریز خاتون کی جان بچائی تھی ، اُسی خدمت کے صلے میں مولویوں کا گھرانہ تباہی سے بچ گیا اور نذیر احمد بھی اپنے گزشتہ منصب پر بحال ہوگئے ۔ جب وہ ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوکر الہ‌آباد آئے تو یہاں انھیں اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل ، یعنی انگریزی زبان سیکھنے کا موقع مل گیا اور بہت جلد انھوں نے انگریزی میں ایسی استعداد پیدا کرلی کہ قانونی کتابوں کے ترجمے کرنے لگے ۔ پہلے انکم ٹیکس ایکٹ کا ترجمہ کیا ، پھر انڈین پینل کوڈ (تعزیرات ہند) کے ترجمے میں شریک ہوئے ، لیکن اس لحاظ سے شریک غالب رہے کہ پورے ترجمے کی اصلاح و نظرثانی کا کام بھی انجام دیا ۔ پھر ضابطہ فوجداری کے ترجمے کو سنوارا اور قانون شہادت کے دقیق متن کا ترجمہ کیا ۔ ڈاکٹر نذیر احمد کر ترجمے کا ایسا سلیقہ تھا کہ اُن کی وضع کردہ اصطلاحیں قانونی ادب کا جزولاینفک بن گئیں ۔ یہی ترجمے ترقی مدارج کا سبب بن گیے ؛ پہلے تحصیلداری کا عہدہ ملا ، دو سال بعد ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹر ہوگئے ۔

نذیر احمد مترجم کی حیثیت سے سرکاری حلقوں میں کافی مشہور ہو چکے تھے؛ ۱۸۶۶-۶۷ء میں ان کی ادبی زندگی کا آغاز

ہوا ۔ چند پند ، منتخب الحکایات اور مرآت العروس یہ تینوں کتابیں نہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں سبقاً سبقاً لکھنی شروع کیں ۔ دو سال بعد اتفاق سے مسٹر کیمپسن ، ڈائرکٹر تعلیمات ان کتابوں سے متعارف ہوئے ۔ اس وقت محکمۂ تعلیم کی درسی ضروریات کے لیے ایسی کتابیں درکار تھیں جن کی زبان سادہ ہو اور جو موضوع و انداز بیان کے اعتبار سے دلچسپ اور سبق آموز ہوں ۔ کیمپسن صاحب نے ان سب کتابوں کو اور خصوصاً مرآت العروس کو بہت پسند کیا ۔ آن کی جوہر شناس نگاہوں نے مرات العروس کی سادہ معاشرتی کہانی میں جدید ناول کی خصوصیات دریافت کر لیں ۔ اس پر سرکار سے ایک ہزار روپیہ انعام دلوایا ۔ اسی طرح چند پند ، منتخب الحکایات ، بنات النعش ، توبۃ النصوح ، مبادی الحکمت ، ان سب کتابوں پر خود نہایت عمدہ ریویو لکھے ، انھیں تعلیمی اداروں میں رائج و شایع کیا اور مؤخر الذکر تینوں کتابوں پر حکومت کی طرف سے پانچ پانچ سو روپے انعام بھی دلوائے ۔ ایک انگریز حاکم لیوپورون کی طرف سے علم ہیئت کی ایک کتاب کے ترجمے کے لیے ایک ہزار روپے کے انعام کا اعلان ہوا ۔ گیارہ ترجمے پیش کیے گیے ، جن میں نذیر احمد کا ترجمہ بہترین قرار پایا ۔ یہ ترجمہ تنقید و نظرثانی کی غرض سے ریذیڈنٹ حیدرآباد کے ذریعے سے امیر کبیر ، مدارالمہام ریاست کے پاس بھیجا گیا جو علم ہیئت و ریاضی کے بہت بڑے عالم تھے ۔ امیر کبیر اور سرسالار جنگ نذیر احمد کی ذہانت و قابلیت سے متاثر ہوئے ۔ سر سالار جنگ نے سرسید کے ذریعے سے تحریک کی اور ان کی خدمات حیدرآباد کے لیے منتقل کرا لیں ۔ اس وقت نذیر احمد اعظم گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے ۔ دو سال کی رخصت خاص لے کر ۱۸۷۷ء میں حیدر آباد پہنچے

پہلے ساڑھے بارہ سو روپے ماہوار تنخواہ پر صدر تعلقہ دار (کمشنر) مقرر ہوئے؛ پھر ترقی کر کے بورڈ آف ریونیو کے رکن ہو گیے اور سترہ سو روپے ماہوار تنخواہ ہو گئی۔ سرسالار جنگ بے حد قدر و عزت کرتے تھے۔ اپنے دونوں فرزندوں کو کچھ عرصے کے لیے ان کی شاگردی میں دے دیا۔ ڈاکٹر نذیر احمد کو نظام دکن میر محبوب علی خاں کی معلمی کا بھی فخر حاصل ہوا، کیونکہ انھوں نے سر سالار جنگ کی فرمایش سے انتظامات ملکی پر سات رسالے نوجوان نظام کی تعلیم کے لیے، لکھ کر پیش کیے۔ یہ رسالے شایع نہیں ہوئے۔ حیدر آباد میں انھوں نے تلنگی زبان سیکھی اور ایک طویل دورے کے دوران میں قرآن مجید حفظ کر لیا، لیکن وہاں کے ہشت سالہ قیام کا زمانہ کچھ ایسی مصروفیات میں گزرا کہ تصنیف و تالیف کے لیے وقت نہ نکال سکے۔

سالار جنگ کے انتقال کے بعد اُن کے بیٹے لایق علی سالارجنگ ثانی ہوئے۔ چونکہ ڈاکٹر نذیر احمد اُن کے استاد رہ چکے تھے، لوگوں کو کھٹکا پیدا ہوا کہ وہ اپنے شاگرد پر اپنا اثر نہ ڈالیں۔ لگائی بجھائی ہونے لگی۔ نذیر احمد سیاسی داؤ پیچ سے نفرت کرتے تھے، پنشن لے کر دھلی چلے آیے۔ خانہ نشین ہونے کے بعد نذیر احمد نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ از سر نو شروع کیا۔ فسانۂ مبتلا، ابن‌الوقت، رویاے صادقہ اور ایامیٰ یہ چاروں ناول اسی دور کی تصنیف ہیں۔ آخری زمانے میں مذہبی تصانیف کی طرف خاص توجہ رہی۔ قرآن کا سلیس و با محاورہ زبان میں ترجمہ اس دور کا سب سے بڑا علمی کارنامہ ہے۔ مذہبی تصانیف میں 'الحقوق والفرایض' بڑی جامع کتاب ہے۔ اُمہات‌الامہ (یعنی اُمت کی مائیں) میں ازواج مطہرات

نبی کریم صلعم کے حالات اور تعدد ازواج کے اسباب بیان کیے ہیں ، لیکن وہ مذہبی کتابوں میں بھی قصوں کی بے تکلف زبان استعمال کرتے ہیں ؛ چنانچہ اس کتاب میں اُن کے بعض مبتذل و عامیانہ محاوروں پر اتنا ہنگامہ برپا ہوا کہ کفر کے فتوے صادر ہوئے اور بالآخر کتاب کے تمام نسخوں کو جلا دیا گیا ۔

تصنیفی مشاغل کے علاوہ نذیر احمد نے قومی کاموں میں بھی حصہ لینا شروع کیا ۔ وہ بہت پہلے سے سرسید کی شخصیت سے متاثر اور اُن کے خیالات سے متفق تھے ۔ دھلی آنے کے بعد سرسید کی تعلیمی تحریک کے نہایت سرگرم مبلغ بن گیے ۔ قدرت نے انھیں قوت تحریر کی طرح ایک غیر معمولی قوت تقریر سے بھی نوازا تھا ۔ ۱۸۸۸ء میں جب وہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (جسے اس وقت محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کہتے تھے) کے سالانہ اجلاس منعقدہ لاھور میں پہلی مرتبہ شریک ہوئے تو اُن کی جادو بیانی نے سب کو مسحور کر لیا ۔ پھر تو سر سید انھیں ہر دورے میں اپنے ساتھ رکھنے لگے اور کانفرنس، نیز انجمن حمایت اسلام کے جلسوں کی رونق افزائی کے لیے اُن کی شرکت نہایت ضروری سمجھی جانے لگی ۔ انھوں نے ایجوکیشنل کانفرنس، علی گڑھ کالج ، طبیہ کالج دھلی ، انجمن حمایت اسلام اور اسلامیہ کالج کو اپنی خطابت اور حمایت سے بہت فائدہ پہنچایا ۔ یہی نہیں کہ چندے کی پر زور اپیلیں کرکے لاکھوں روپے ان اداروں کے لیے جمع کرائے، بلکہ خود اپنی جیب سے بھی گراں قدر رقمیں چندے میں پیش کیں عموماً تقریر سے پہلے قومی نظم بھی سنایا کرتے تھے اور نظم اس انداز سے پڑھتے کہ سماں بندھ جاتا تھا ۔

ڈاکٹر نذیر احمد کو ۱۸۹۷ء میں حکومت نے شمس العلماء کا خطاب عطا کیا ۔ ۱۹۰۲ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی نے ایل ایل ۔ڈی

کی اعزازی ڈگری دی اور ہندوستان بھر کی یونیورسٹیوں میں سے پنجاب یونیورسٹی کو نذیر احمد جیسے عالم کی خدمت میں ڈی ۔ او ۔ ایل کی ڈگری پیش کرنے کی سعادت نصیب ہوئی ۔

نذیر احمد کی زندگی کا بیشتر حصہ تعلیم و تعلم کے مشاغل میں گزرا ۔ عام مطالعے کے علاوہ وہ نیے نیے علوم سیکھا کرتے تھے ۔ زندگی کے آخری دور میں ایک پنڈت کو ملازم رکھ کر سنسکرت زبان سیکھنی شروع کی ۔ گونا گوں مصروفیات کے باوجود طلبہ کا ہجوم انھیں گھیرے رہتا تھا ۔ درس و تدریس کا یہ سلسلہ پایان عمر تک جاری رہا ۔ آخرکار ۲۷- اپریل ۱۹۱۲ء کی شب میں فالج کا حملہ ہوا ، ۲۸- اپریل کو جمعے کے روز انتقال فرما گیے اور گورستان حضرت خواجہ باقی باللہ میں مدفون ہوئے ۔

ڈپٹی نذیر احمد کی تصانیف

تراجم :

(۱) قانون انکم ٹیکس (بہ شرکت بابو شیوپرشاد)
(۲) تعزیرات ہند(۱۸۶۰-۶۱) بہ شرکت منشی عظمت اللہ و مولوی کریم بخش)
(۳) ضابطۂ فوجداری (اصلاح و نظرثانی)
(۴) قانون شہادت ۔
(۵) سماوات (۱۸۷۶ء) علم ہیئت پر ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ۔

ناول :

(۱) مرآت العروس (۱۸۶۹ء) اردو کا پہلا ناول مسلم شرفاء کی خاندانی معاشرت کی تصویر لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک سبق آموز کہانی ۔
(۲) بنات النعش (۱۸۷۳ء) مرآت العروس کا دوسرا حصہ ۔ قصے کے پیرایے میں عورتوں کو معلومات عامہ اور خانہ داری کی تعلیم ۔
(۳) توبۃ النصوح (۱۸۷۷ء) مقبول ترین ناول ۔ تربیت اولاد اور صحیح اسلامی زندگی کی تعلیم ۔

(۴) محصنات یا فسانۂ مبتلا (۱۸۸۵ء) تعدد ازواج کی معاشرتی خرابیاں اور ناقص تربیت کے نتائج ۔

(۵) ابن‌الوقت (۱۸۸۸ء) مغربی و مشرقی معاشرت کا مقابلہ ؛ انگریزوں کی اندھی تقلید پر طنز ۔

(۶) رویائے صادقہ ـــ اصلاح عقاید ـــ قدیم شرفاء کی زندگی کا نقشہ ۔

(۷) ایامیٰ ـــ عقد بیوگان کی ضرورت ۔

مذہبی تصانیف :

(۱) ترجمہ قرآن مجید (۳—۱۹۰۲ء) قرآن مجید کا بامحاورہ اور فصیح و بلیغ ترجمہ ۔ ایک معرکہ آرا علمی کارنامہ ۔

(۲) الحقوق و الفرائض ۔ (۱۹۰۶ء) دینی عقاید و مسائل پر ایک جامع کتاب ۔ ۳ حصوں میں ۔

(۳) امہات‌الامہ ـــ ازواج مطہرات کے حالات پر ایک پادری کے اعتراضات کے جواب میں ۔

(۴) الاجتہاد (۱۹۰۸ء) عقاید اسلامی کی عقلی دلیلیں ۔

(۵) ادعیۃ القرآن ـــ قرآن مجید کی تمام دعائیں مع مفید حواشی ۔

(۶) مطالب‌القرآن (۱۲—۱۹۱۱ء) آخری عمر کی نامکمل تصنیف ۔

اخلاقی و درسی کتب :

(اخلاقیات)

(۱) چند پند (۶۹—۱۸۶۸ء) بچوں کو آداب معاشرت کی تعلیم ۔

(۲) منتخب الحکایات (۶۹–۱۸۶۸ء) اخلاقی کہانیوں کا مجموعہ ۔

(۳) موعظۂ حسنہ ـــ بیٹے کے نام نصیحت آمیز خطوط ۔

(درسیات)

(۴) مبادی‌الحکمت (۱۸۷۱ء) علم منطق پر جدید پیرایے میں ایک دلچسب تصنیف ۔

(۵) مایغنیک فی‌الصرف (۶) صرف صغیر ۔ عربی و فارسی قواعد (۷) رسم‌الخط (فن کتابت)

(۸) نصاب خسرو (خالق باری بطرز جدید)

متفرقات :

(۱) مصائب غدر ـــ ہنگامہ ۵۷ء کے حالات

(۲) مجموعہ لیکچرز ـــ دو حصوں میں

(۳) نظم بے نظیر ـــ قومی نظموں کا مجموعہ

دیباچۃ الکتاب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ اللہ وہ بھی کیا دن تھے کہ سرولیم میور[1] ممالک مغربی و شمالی[2] کے لفٹنٹ گورنر تھے اور مسٹر ایم ۔ کمپسن[3] تعلیم کے ڈائرکٹر ۔ تعلیم کے اعتبار سے یہ دونوں صاحب مسلمانوں کے گویا ہارون‌الرشید اور منصور تھے اور ہنود کے بکرماجیت اور بھوج ۔ انگریزی جتنی پڑھی جائے تھوڑی ، مگر کتنی ہی کیوں نہ پھیلے ، ہندوستان کی ملکی زبان تو بن بیٹھنے سے رہی ۔ قوم

۱۔ سر ولیم میور عربی کے عالم ، اردو کے حامی اور اہل علم کے بڑے قدر دان تھے ۔ ۱۸۶۹ء کے دربار میں انہوں نے نذیر احمد کے پہلے ناول 'مراۃ العروس' کی بیحد تعریف کی ، حکومت کی جانب سے مصنف کو ایک ہزار روپے انعام دیا اور اپنی جیب خاص سے ایک گھڑی عنایت کی ۔ ۱۸۷۲ء میں نذیر احمد کے دوسرے ناول 'بنات‌النعش' پر پانچ سو روپے کا انعام منظور کیا ۔

۲۔ ہندوستان کا ایک صوبہ جسے بعد میں صوبجات متحدہ (یو ۔ پی) کے نام سے موسوم کیا گیا اور اب وہ اتر پردیش کہلاتا ہے ۔ اس زمانے میں احاطہ بنگال، بمبئی و مدراس کے علاوہ تمام صوبوں کے حاکم اعلیٰ لفٹنٹ گورنر ہوتے تھے ۔

۳۔ کیمپسن صاحب بھی فارسی و اردو کا خاصا ذوق رکھتے تھے ۔ انہوں نے نذیر احمد کے ابتدائی ناولوں پر شاندار ریویو لکھے ، مصنف کو انعام دلوائے اور تعلیمی اداروں میں ان کی کتابیں رائج کیں ۔ انگلستان واپس جانے کے بعد مصنف کی اجازت سے 'مراۃ العروس' کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور 'توبۃ النصوح' کو انگریزی کے تشریحی حاشیوں کے ساتھ مرتب کرکے شائع کیا ۔

من حیث القوم اویر سویر جب کبھی ترقی کرے گی اپنی ھی زبان[۴] میں پڑھنے لکھنے سے - سرولیم میور کا یہی گر تھا - وہ زبان اردو کی پرداخت کے پیرایے میں ھماری فلاح کی فکر میں تھے - انھی کی قدردانی مجھے تصنیف و تالیف کی باعث ھوئی، یہاں تک کہ عورتوں کی تعلیم کا سلسلہ مرتب ھو گیا - خانہ داری میں مراۃالعروس ، معلومات ضروری میں بنات النعش ، خدا پرستی میں توبۃ النصوح - ان کتابوں نے ایسا رواج پایا کہ انگریزی ، بنگالی ، گجراتی ، بھاکا، مرھٹی، پنجابی کشمیری، سات زبانوں میں ترجمہ ھوا اور اس وقت تک بدفعات چالیس ھزار جلدیں چھپ چکیں - ان ھی دنوں مجھے یہ خیال ھوا تھا کہ مسلمانوں کی معاشرت میں عورتوں کی جہالت اور نکاح کے بارے میں مردوں کی آزادی دو بڑے نقص ھیں - میں نے ایک نقص کے رفع کرنے میں (جھدالمقل) کوشش کی ھے ، تو دوسرے نقص کے دفع میں بھی کچھ کرنا ضرور ھے - قصے کا منصوبہ ذھن میں ٹھہرا چکا تھا کہ سرولیم میور ولایت چلے گیے اور میں حیدر آباد[۵] - اب کہ خدمت سے علیحدہ ھو کر خانہ نشین ھوا ، فرزند ارجمند اصلح و اسعد مولوی بشیرالدین احمد موقع پا کر متقاضی ھوئے - اگر اس کتاب سے کوئی فایدہ مترتب ھوا، اور ان شاءاللہ تعالٰی ھوگا، تو لوگوں کو

---

۴ - پون صدی قبل جب اس ملک میں انگریز اور انگریزیت کا آفتاب اقبال نصف النہار پر تھا ، نذیر احمد کی یہ رائے آن کی دور اندیشی کا بین ثبوت اور آج بھی ھماری قوم کے لیے ایک درس عبرت ھے -

۵- ۱۸۷۷ء میں نذیر احمد اعظم گڑھ (یو - پی) میں ڈپٹی کلکٹر تھے کہ حیدر آباد سے سرسالار جنگ نے ایک گراں قدر مشاھرے پر آن کی خدمات ریاست کے لیے طلب کر لیں - وھاں وہ صدر تعلقہ دار صوبہ شمال اور رکن مجلس مال جیسے بلند مناصب پر فائز رھے - بالآخر ۱۸۸۵ء میں پنشن لے کر دھلی چلے آئے -

مجھ سے بڑھ کر مولوی بشیرالدین احمد کا شکر گزار ہونا چاہیے کیونکہ انھوں نے اس کتاب کے لکھنے میں میری اس قدر مدد کی ہے کہ فی‌الواقع شریک تصنیف ہوا اور شریک بھی شریک غالب فقط۔

نذیر احمد وفقہ‌اللہ‌التزودلغد

دھلی ۲۲ - اگست ۱۸۸۵ء

تمہید قصہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مبتلا[1] تھا تو تخلص، مگر چونکہ پھبتا ہوا تھا ایسا مشہور ہوا کہ اصلی نام کو دور کے رشتہ دار تک بھی نہیں جانتے تھے اور مبتلا کے نام سے لڑکے شہر کے تمام گلی کوچوں میں ، جب تک امرد رہا غزلیں اور واسوخت ، جوان ہوا تو گیت اور ٹھمریاں اور مرے پیچھے[2] بھی مدتوں بعد تک مرثیے اور نوحے گاتے پڑے[3] پھرتے تھے۔ ہمارے یہاں کی شاعری میں عشق بازی اور بےتہذیبی کے سوا ہے کیا ؛ شریف خاندانوں کے نوجوان لڑکے اکثر اسی مکتب[4] سے خرابی کے لچھن سیکھتے اور اسی اکھاڑے میں

۱۔ صرف عربی کی رو سے مبتلا کے الف مقصورہ کو 'ی' کی صورت میں لکھنا چاہیے، مگر ہم نے جان بوجھ کر صاحب تخلص کی نقل و تقلید کی ہے* ۔
[صاحب تخلص کی نقل و تقلید'' کی بات محض سخن طرازی ہے جس سے حقیقت کا التباس پیدا کرنا مقصود ہے۔ مبتلا ، منتہا وغیرہ الفاظ کی املا میں یہ تصرف اہل لغت اور اہل زبان نے قبول کر لیا ہے۔ فارسی و اردو میں عموماً یہی املا رائج ہے۔]

۲۔ اہل دہلی اب بھی عموماً ''مرے پیچھے'' ''گیے پیچھے'' بولتے ہیں ، لیکن تحریر میں مدت سے متروک ہے۔

۳۔ ''پڑا'' کسی دوسرے فعل سے پہلے آ کر زور اور کثرت کے معنی پیدا کرتا ہے ، لیکن دہلی والوں کی بول چال میں اس کا استعمال ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے۔

۴۔ یعنی شعر و شاعری کے اثر سے

بڑے کوتکوں کی مشق بہم پہنچاتے ہین - جس شاعری سے ہم بحث کررہے ہیں، اس کے تین درجے ہیں : سننا ، سیکھنا ، کہنا - ان مین سےپہلے دو درجے تو ہمارے طرز تعلیم میں داخل ہین - جس کا شمار پڑھے لکھوں مین ہے ممکن نہین کہ حرف شناسی کے بعد اس کا پہلا سبق یہ نہ ہو :

اے داغ[٥] بردل از غم خال تولالہ را

شرمندہ ساخت آہوئے چشمت غزالہ را

جن باتوں کی بھننگ کان میں پڑنا نوجوانوں کے حق میں سم قاتل ہے، سبقاً سبقاً از بر کرائی جاتی ہیں اور جن خیالات کا ایک بار دل میں گزر جانا دنیا و دین دونوں کی تباہی کا موجب ہوسکتا ہے ، برسوں کی مشق و تمرین سے خاطر نشین کیے جاتے ہین ، تاکہ طبعی ہو جائین ، ناممکن‌الزوال اور فطری بن جائیں جن کا نکلنا محال - بے چارہ مبتلا اس عموم سے مستثنیٰ ، اس کلیے سے خارج نہ تھا ، بلکہ اس پر تو ایک دوسری خلقی بلا[٦] مسلط تھی کہ کم بخت صورت شکل کا اچھا، رنگ کا گورا، اعضا کا متناسب، یعنی شعر کا موضوع لہ واقع ہوا تھا - یہ تو عقل میں

٥- محمود نامہ فارسی کی ایک مشہور کتاب مبتدیوں کو پڑھائی جاتی ہے یہ اس کا پہلا شعر ہے * -

(ترجمہ :- اے محبوب تیرے چہرے کا تل اتنا خوشنما ہے کہ لالے کا دل اس کے غم سے داغ دار ہے اور تیری آہو صفت آنکھوں نے غزالہ کو شرمندہ کر دیا ہے-)

٦- اس بیان کو مصنف کی جالیاتی بے حسی کی دلیل ٹھہرانا یا ایک فاضل نقاد کے الفاظ میں یہ کہنا کہ ''اسے حسن اور حسن پرستی سے خاص عداوت تھی'' مصنف کے ساتھ بڑی زیادتی ہے - دراصل اس بگڑے ہوئے معاشرے کے حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ حسن صورت کو ایک 'خلقی بلا' کہنا پڑا -

نہیں آتا کہ تخلص تک نوبت پہنچی ہو اور شعر نہ کہا ہو ، مگر مخمس ، قصیدے اور مثنوی اور واسوخت اور غزل اور رباعی کا کیا مذکور، ہم تک تو مبتلا کا کوئی مصرع بھی نہیں پہنچا۔ قیاس چاہتا ہے کہ اگر اس نے شعر گوئی کی ہوگی تو اوائل عمر میں ، کیونکہ تیس برس کی عمر سے تو ہم اُس کو خانہ داری کی ایسی مصیبتوں میں پھنسا ہوا پاتے ہیں کہ ایسی حالت میں فراغ خاطر اور اجتماع حواس جوشرط شاعری ہے میسر ہو نہیں سکتا ۔ مبتلا کے اوائل عمر کا کلام غالب[۷] ہے کہ حسن ادا اور شوخی اور نزاکت سے خالی نہ ہو اور اس میں تو شبہ ہی نہیں کہ جب وہ مشاعرے میں غزل پڑھتا ہوگا تو میر انشا اللہ خاں[۸] کی طرح واہ واہ اور سبحان اللہ اور مکرر پڑھنے کی فرمائشوں کا بڑا غل ہوتا ہوگا ۔ مبتلا کا زمانہ کچھ ایسا متقدم نہیں ہے؛ کچھ نہیں تو سو دو سو اس کے دیکھنے والے اب بھی شہر میں زندہ اور موجود ہوں گے ۔ پس اگر ہم جستجو کرتے تو اس کا کلام تھوڑا بہت کسی نہ کسی جگہ سے ملتا پر ملتا[۹] ، مگر ہم نے اس قصے کے آگے اس کے کلام کا کچھ خیال نہیں کیا ۔

۷- یعنی گمان غالب ہے-

۸- میر انشاء اللہ خاں بھی بڑے خوبصورت اور طرح دار تھے- داڑھی مونچھ کا کہیں پتا نہ تھا کہ شعر کہنے لگے ۔ مشاعرے میں آدھے سے زیادہ میر انشاء اللہ خاں کے ہوا خواہ ہوتے تھے* ۔

۹- ملتا پر ملتا ، جاتا پر جاتا ، یعنی ضرور ملتا یا ضرور جاتا ۔ یہ اہل دہلی کا روزمرہ ہے ۔

پہلی فصل

مبتلا کی ولادت اور طفولیت

تمول کے اعتبار سے مبتلا ایک خوش حال باپ کا بیٹا تھا اور چونکہ اکٹھی نو بیٹیوں پر، جن میں سے پانچ زندہ تھیں باپ کے بڑھاپے میں بڑی آرزؤں اور تمناؤں کے بعد پیدا ہوا اس سے بڑھ کر اللہ آمین اور کس کی ہوگی ۔ بیٹے کا ارمان تو شروع ہی سے تھا ۔ ہر مرتبہ مانے جلنے دیکھنے بھالنے والے مولوی ، ملا ، نجومی ، رمال، حتیٰ کہ دائی ، جی کو خوش کرنے کو کہہ دیا کرتے تھے کہ اب کے ضرور بیٹا ہوگا ، مگر ایک عمر اسی میں گزر گئی۔ توقع کی ناامیدی کے واسطے، امید لگائی ناکامیابی کے لیے ۔ مبتلا کی نوبت میں تو یاس اس درجے کو پہنچ چکی تھی کہ سارے گھر میں کسی کو بیٹے کا شان گمان تک بھی نہ تھا۔ دم کیے پانی ، تعویذ گنڈے، ٹونے ٹوٹکے اور دوا درمن برسوں سے موقوف تھے ۔ مبتلا پیدا ہوا تو سب سے پہلے دائی کو معلوم ہوا کہ بیٹا ہے ۔ اس نے اتنی عقلمندی کی کہ لوگوں پر بیٹے کا ہونا فوراً ظاہر نہیں ہونے دیا ، ورنہ زچہ جس کو سکون اور قرار درکار تھا ، مارے خوشی کے پھولی نہ سماتی اور الٹے لینے کے دینے پڑ جاتے۔ بارے بتدریج سب کو خبر ہوئی ؛ سنتے کے ساتھ جو کھڑا تھا تو کھڑا اور بیٹھا تھا تو بیٹھا ، سجدے میں گر پڑا ۔ کسی کے منہ سے دعا نکلی ، کوئی لگا بے ساختہ زچہ

گیریاں گانے، کسی نے دوڑ کر چٹاچٹ زچہ اور بچہ کی بلائیں لے لیں۔ غرض گھر کیا، اسی وقت سارے محلے میں غل مچ گیا اور صبح ہوتے ہوتے تو گلی میں ڈولیوں سے اور گھر میں بیبیوں سے، تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ ہر چند بیٹے کا ارمان اس بلا کا تھا کہ کیسا ہی بدصورت بیٹا ہوتا چوم چاٹ کر ماتھے چڑھاتے، مگر اس خاندان میں ہمیشہ سے صورتوں سے پرچول رہا کرتی تھی۔ گھر میں جو آتا بچے کو دیکھنا چاہتا۔ یہ لوگ پرچھاویں اور نظر کے ڈر سے اس کے دکھانے میں مضائقہ کرتے تھے۔ جب بیبیوں کا بہت تقاضا ہوا اور گری پڑنے لگیں تو زچہ کے پاس گھر کی کوئی عورت بیٹھی تھی، اس نے کہا، ''خدا کے لیے بیبیو! ذرا ہوا کا رخ چھوڑو کہ دم گھٹا جاتا ہے۔ مرد بچے کی صورت کیا دیکھنا ہے؟ خدا عمر دے، پروان چڑھائے، الٰہی ماں باپ کا کلیجہ ٹھنڈا رہے،،۔ ایک بی بی باوجودیکہ خود بھی ہجوم کرنے والیوں میں تھیں بول اٹھیں ''لوگو بھیڑ کیا لگائی ہے، اللہ رکھے پانچ بہنوں کا بھائی ہے، انیس بیس کے فرق سے اپنی بہنوں میں ملتا ہوا ہوگا۔'' اتنے میں دائی اندر سے نکلی تو ساری بیبیوں نے اس کو گھیر لیا، ''کیوں بوا، بچہ پورے دنوں کا صحیح سلامت تو ہوا؟'' دائی '' ہاں، پورے دن بھی کیسے خوب بھر پور! ہاتھ پاؤں، بال، ناخن سب خاصے توانا، ماشاءاللہ پٹڑے کا پٹڑا۔ ان کے جتنے بچے ہوئے سب اسی طرح کے۔ خدا کے فضل سے کوکھ بہت صاف ہے۔'' بیبیاں '' کیوں بوا، بہنوں میں ملتا ہوا تو ہے؟،، دائی، '' بہنوں کو اس سے کیا نسبت، لڑکیاں بھی اچھی صورت کی ہیں، مگر اس سے پہلے کی دو لڑکیاں کہ ایک دو مہینے کی ہو کر اتر گئی اور دوسری دو سوا دو برس کی، بس دونوں آفتاب ماہتاب تھیں اور یہ تو خدا جیتا رکھے نور کا پتلا ہے۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں، اونچی اور

ستی ہوئی ناک ، پتلے ہونٹ ، چھوٹا دھانہ ، چمکتے ہوئے سیاہ گھونگروالے بال، کتابی چہرہ، صراحی دار لمبی گردن، سانچے میں ڈھلا ہوا بدن ۔ میری اتنی عمر ہونے آئی، تیرہ برس کی بیاہی آئی تھی، تب سے اپنی ساس کے ساتھ یہ کام کرنے لگی، خدا جھوٹ نہ بلوائے اتنے بچے میرے ہاتھ سے ہوئے کہ جن کا شمار نہیں ، مگر ایسا قبول صورت بچہ میں نے تو بڑے بڑے نامی گرامی امیروں کے ہاں بھی، جن کے حسن کی آج بڑی دھاک ہے ، نہیں دیکھا۔ بات یہ ہے کہ اللہ عمر دے اور بھاگوان ہو۔'' سب نے کہا ''آمین'' ! مبتلا کے پیدا ہونے کی روداد جو ہم نے اوپر بیان کی اُس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ مبتلا کے ساتھ ماں باپ اور عزیز و اقارب نے کیا کچھ چوچلے نہ کیے ہوں گے ۔ غرض وہ تمام خاندان اور سارے کنبے میں ایک انوکھی چیز سمجھا جاتا تھا اور حقیقت میں جس جس پہلو سے دیکھیے وہ انوکھی چیز تھا بھی ۔ جب سے پیدا ہوا سارے سارے دن ساری ساری رات گودوں ہی میں رہتا ۔ نہالچے پر لٹانے کی نوبت نہ آتی تھی ۔ اپنے ہی گھر میں ماں ، نانی ، خالہ ، ممانی ایک کم آدھی درجن سگی بہنیں ؛ اتنے آدمی لینے والے تھے کہ ایک سے ایک چھینے لیتا تھا ۔ باپ کا یہ حال کہ جتنی دیر ممکن تھا گھر میں رہتے ، اور جتنی دیر گھر میں رہتے خود لیے رہتے یا پیش نظر رکھتے۔ مبتلا کے پہلے پانچ، بلکہ سات آٹھ برس کی زندگی، یعنی جب تک وہ محتاج پرورش رہا ، اس قابل ہے کہ مستقلاً ان حالات کی ایک کتاب لکھی جائے، مگر ہم کو تو اس کے دوسرے ہی معاملات سے بحث کرنی ہے ۔ اس کی پرورش کے متعلق ہم اتنا ہی لکھنا کافی سمجھتے ہیں کہ اگرچہ خاندان کے لوگ سب کے سب دین کے پابند نہ تھے، مگر مبتلا کا باپ بڑا

نمازی اور پرھیزگار آدمی تھا - مولوی شاہ حجت اللہ صاحب کے وعظ سے اس کو ایسا عشق تھا کہ آندھی جائے مینہ جائے، طبیت درست ہو نہ ہو، جہاں سنا کہ مولوی صاحب کا وعظ ہے سب سے پہلے موجود - گھر کی بڑی بوڑھیاں بھی نماز پڑھتی تھیں ، با ایں ہمہ جو احتیاطیں مبتلا کی پرورش میں برتی جاتی تھیں ان سے ایسا مستنبط ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے پندار میں مبتلا کی تن درستی نہ صرف غذا سے اور آب و ہوا سے، بلکہ مکان سے، برسوں سے، مہینوں سے، دنوں سے، لیل و نہار کے خاص خاص اوقات سے، اپنے بیگانے کی نگاہ سے، آئے گیے کی پرچھائیں سے، لوگوں کی باتوں سے، دلی خیالات سے، تنہائی سے، تاریکی سے، چاندنی سے، کسوف و خسوف سے، کتے سے، بلی سے چھپکلی سے، دیو سے، بھوت سے، جن سے، پری سے ، غرض ہر چیز سے جو واقعی ہے اور ہر چیز سے جو ادعائی ہے ، معرض خطر میں ہے - ہم تو معاذ اللہ کسی کلمہ گو مسلمان پر کفر اور شرک کا الزام کیوں لگانے لگے، مگر بہ مجبوری اتنی بات کہنی پڑتی ہے کہ مبتلا کے ساتھ جو برتاؤ کیے جاتے تھے، واہمۂ شرک اور مظنۂ کفر سے خالی نہ تھے- یہ بات کہ جس خدا نے ہم کو پیدا کیا ہے وہی ایک وقت مقررہ تک جس کا حال اسی کو معلوم ہے ہماری زندگی اور تن درستی کی حفاظت کرتا ہے اور جس طرح بدون اس کے فضل و کرم کے ہم دنیا میں آ نہیں سکتے تھے، اسی طرح بغیر اس کی مدد اور حمایت کے ایک لمحہ دنیا میں رہ بھی نہیں سکتے - سوتے جاگتے، چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے ، کہیں اور کسی حالت میں ہوں ہم اس کی پناہ میں ہیں اور اس کا سایۂ رحمت ہمارے سر پر ہے- وہ ہر مرض میں ہمارا طبیب ہے اور ہر مصیبت میں ہمارا معین و مددگار، ہر تکلیف

میں ہمارا غمگسار۔ بدون اس کی مرضی کے نہ غذا میں تقویت ہے، نہ دوا میں تاثیر۔ بغیر اس کے حکم کے نہ زہر زہر ہے نہ اکسیر اکسیر۔ غرض یہ بات اُن لوگوں کے معتقدات میں تو ضرور ہوگی جو مبتلا کو پال رہے تھے، مگر ان کے برتاؤ مین توکل و انابت کی کوئی بات ہمارے دیکھنے میں نہ آئی، بلکہ ان کی تدبیریں سن کر حیرت ہوتی تھی کہ مبتلا کا پلنا اور پرورش پانا کیسا، یہ گراں جان ان نادان دوستوں کے ہاتھ سے بچ کیوں کر گیا۔ کوئی دکھ کوئی روگ نہ تھا کہ جس کو یہ لوگ اسباب غلط اور ادعائی نظر آسیب وغیرہ کی طرف منسوب نہ کرتے ہوں اور چونکہ تشخیص میں غلطی ہوتی تھی اسی وجہ سے جو تدبیریں کی جاتی تھین غلط در غلط، مگر مبتلا خلقۃً توانا پیدا ہوا تھا، ہمیشہ اس کی طبیعت امراض پر غالب آتی رہی۔ بہرکیف مبتلا کسی نہ کسی طرح خدا کے فضل سے پل پلا کر بڑا ہوا، یہاں تک کہ ان گنا برس[1] بھی خیریت کے ساتھ گزرا۔ مبتلا کی تعلیم و تربیت سے مستورات کو ظاہر میں تو کچھ سروکار نہ تھا؛ ہر چند وہ مکتب مین نہیں بیٹھا، کسی استاد سے اس نے سبق نہین لیا، تاہم ہمارے نزدیک (اور ہمارے نزدیک کیا، بلکہ واقع مین) ایک اعتبار سے اس کی تعلیم و تربیت بہت کچھ ہو چکی تھی۔ دنیا مین سارے لوگ پڑھے لکھے نہیں ہوتے اور نہ پڑھنے لکھنے پر زندگی یا معاش کا انحصار ہے۔ اصل چیز ہے عادت کی درستی، مزاج کی شایستگی، طبیعت کی اصلاح؛ سو جس وقت سے بچہ پیدا ہوتا ہے، اسی وقت سے وہ اخذ کر چلتا ہے ان لوگوں کی

---

۱ - آٹھویں برس کو ان گنا اور میٹھا برس کہتے ہیں* -

خو بو جو اس کو پالتے ، اس کو اٹھاتے بٹھاتے ، آن کو سلاتے ، اس کو کھلاتے پلاتے ہیں ۔ ظاہر میں معلوم ہوتا ہے کہ بچے ایک مضغۂ گوشت کی طرح پڑے ہیں ، نادان اور لایعقل ؛ نہیں نہیں ، وہ اپنے سارے حواس سے ، ظاہری ہوں یا باطنی ، بڑی کوشش کے ساتھ کام لے رہے ہیں ۔ چیزوں کو دیکھتے ٹٹولتے ، آوازوں کو سنتے اور جو دیکھتے سنتے ہیں اس کو حافظے میں رکھتے جاتے ہیں ۔ اس کی ایک آسان شناخت ہے کہ اگر بڑی عمر میں ہم کوئی دوسری زبان سیکھنی چاہیں تو کس قدر کوشش کرنی ہوتی ہے ۔ بعض بعض اوقات سارے سارے دن رٹنا پڑتا ہے ، اور ہم کو اپنی مادری زبان سے ، لکھنا آتا ہے تو لکھنے سے ، اس زبان کی صرف و نحو سے ، لغت سے بھی بڑی مدد ملتی رہتی ہے ؛ تب ہم کو کہیں برسوں میں جا کر وہ زبان آتی ہے ۔ تاہم ناقص و نا تمام بچے ، جن کو ہماری سہولتوں میں کوئی سہولت بھی حاصل نہیں ، کیا کچھ زحمت اٹھاتے ہوں گے ، کہ ذہین ہوئے تو برس کے اندر ہی اندر ورنہ ڈھائی تین برس کی عمر میں تو مٹھے ، لدھڑ کند ذہن تک طوطے کی طرح چرغنے لگتے ہیں ۔ کیا اتنی بات سے کہ کسی نے ہپا اور ما اور ابا اور اما دس بیس بار سکھانے کے طور پر ان کے سامنے کہہ دیا ، کوئی دعویٰ کر سکتا ہے کہ ہم نے ان کو بولنا سکھایا ، زبان کی تعلیم کی ؛ نہیں ، یہ سب بچوں کی ذاتی کوشش ہے ۔ پھر یہ خیال کرنا بھی غلط ہے کہ بچوں کی ساری ہمت صرف زبان کے سیکھنے میں مصروف رہتی ہے ۔ ایک زبان کیا ، بھلا برا ادب قاعدہ ، نشست برخاست ، رغبت اور نفرت ، سود و زیاں ، دوست دشمن ، خویش و بیگانہ ، محبت اور عداوت ، حیا اور غیرت ، غصہ اور لالچ ، حسد اور

رشک وغیرہ، وغیرہ سارے سبق ان کو ایک ساتھ شروع کرادئے جاتے ھیں۔ پس مبتلا جس کی عمر آٹھ برس کی ھوچکی تھی، پڑھ چکا تھا جو کچھ اس کو پڑھنا تھا، اور سیکھ چکا تھا جو کچھ اس کو سیکھنا تھا؛ ماں سے، باپ سے، نانی سے، خالہ سے، بہنوں سے، گھر کے نوکروں سے آئے گیے سے۔ عمر کے اعتبار سے اس کی تعلیم و تربیت کی ایسی مثال تھی کہ جیسے کپڑا مول لیا گیا، درزی نے قطع کیا، سیا اور کھڑا کرنے کے بعد اس نے پہنا کر بھی دیکھ لیا؛ صرف بخیہ کر دینا باقی ھے۔ اب اگر کپڑا بد رنگ یا گلا ھوا نکلے یا کہیں سے تنگ ھو جائے تو درزی اس میں کیا کمال کرے گا۔ کپڑا لیتے وقت یا قطع کراتے وقت یہ باتیں دیکھنے کی تھیں اور نہیں دیکھیں تو جھک مارو اور وھی پہنو؛ گلا ھوا کہ پہنا اور کھسکا، کچے رنگ کا جس میں پہلے ھی دن دھبے نمودار ھوں، تنگ کہ پہننے سے بدن میں بدھیاں پڑیں اور سانس اندر کا اندر اور باھر کا باھر رہ جائے۔ اب دیکھنا چاھیے کہ مبتلا پر زنان خانے کی تعلیم کا کیا اثر مترتب ھوا تھا۔ جوں جوں وہ بڑا ھوتا گیا ضدی، چڑچڑا، غصیلا، مچلا، ھٹیلا، زود رنج، مغرور، خود پسند، طماع، حریص، تنگ چشم، بودا، ڈرپوک، شوخ، شریر، بے ادب، گستاخ، کاھل، آرام طلب، جابر، سخت گیر، گھر گھسنا، زنانہ مزاج بنتا گیا۔ اس کو دنیا و مافیہا[۲] کی کچھ خبر تو تھی نہیں، کبھی وہ بے رت کے پھلوں اور بے موسم کے میووں کے لیے گھنٹوں لوٹتا اور پٹخنیاں کھاتا، پھرود ایڑیاں رگڑتا اور آخر کو ایڑیوں کے بدلے اپنے چاھنے والود اور ناز برداروں سے ناک رگڑوا لیتا تب بمشکل چپ کرتا۔

---

۲ - یعنی دنیا اور جو کچھ دنیا میں ھے * ۔

وہ جب جی چاھتا ، جو چیز چاھتا ، جتنی چاھتا ، کھاتا اور اپنی بے اعتدالیوں اور بے احتیاطیوں سے بیمار پڑتا اور الٹا ماں سے لڑتا ۔ ایک مرتبہ سنا کہ وہ اس بات پر خوب رویا اور بہت بکھرا کہ ھائے بادل کیوں گرج رھا ھے ۔ ھر چند سارا گھر اس بات کے اھتمام میں لگا رھتا تھا کہ کوئی امر اس کے خلاف مزاج نہ ھو ، مگر اس کو رونے اور بگڑنے کے لیے ھر وقت کوئی نہ کوئی بہانہ ، ایک نہ ایک حیلہ مل ھی جاتا تھا ۔ اس کی نا خوشی کا روکنا حقیقت میں انسان کے اختیار سے خارج اور آدمی کی قدرت سے باھر تھا ۔ کوئی جان نہیں سکتا تھا کہ وہ کس بات پر روٹھ جائے گا اور روٹھے پیچھے کسی کو خبر نہ تھی کہ وہ کیوں کر منے گا ۔ لاکھ اللہ آمین کیوں نہ ھو ، کہاں تک برداشت ، کتنا تحمل ، آخر رفتہ رفتہ لوگ اس کے لاڈ پیار میں کمی کرنے لگے ۔ سب سے پہلے بڑی اور بیاھی ھوئی صاحب اولاد بہنوں نے بے رخی ظاھر کی ۔ آخر تھیں تو اس کی بہنیں ، جب اس کی شوخی و شرارت سے عاجز آتیں جھڑک دیتیں اور گھرک بیٹھتیں ، بلکہ ایک تو ایسی جلے تن تھی کہ یہ اس کے پاس بھانجے کو دق کرنے اور بوٹیاں توڑنے گیا اور اس نے دور ھی سے ڈانٹا کہ ”خبر دار جو میرے بچے کو چھیڑا ھوگا ۔ میں ایسے چوچلے ایک نہیں سمجھتی ؛ دیکھ خدا کی قسم میں مار بیٹھوں گی ۔“ ماں کا بھی مبتلا کے ھاتھوں دم ناک میں تھا ، مگر سچ کہا ھے ، حبک الشئی یعمی و یصم[۳] ۔ وہ کھسیانی تو ھوتی تھی، مگر ادھر جوش آیا اور فوراً ٹھنڈی پڑ گئی ۔ تیوری پر بل پڑ چلا تھا کہ کھکھلا کر ھنس دی ۔ مبتلا کی برائیوں کو برائی سمجھنا تو درکنار وہ اس کی

---

۳ - انسان کو ایک چیز کی محبت اندھا اور بہرا کر دیتی ھے * ۔

طرف سے ساری دنیا کے ساتھ ہر وقت لڑنے کو تیار تھی۔ ایک مرتبہ مبتلا خدا جانے کس بات پر پیچھے سے ماں کی چوٹی گھسیٹے جاتا تھا ؛ سب سے بڑی بہن نے (جس کی پہلونٹی کی بیٹی مبتلا سے بھی دو برس بڑی تھی) دیکھ کر کہا ''سبحان اللہ کیا ماں کا وقر ہے! لاڈ پیار بہت دیکھے، مگر اتنا ناھموار ، اس درجے بے تمیز!! جب ماں کا یہ ھڈڑا کر رکھا ہے تو ھمارا تو سر مونڈ کر بھی بس نہیں کرے گا ۔ ھائے تو میرا بیٹا نہ ھوا ، تجھ کو ایسا ٹھیک بناتی کہ یاد ھی تو کرتا ۔'' باوجودیکہ بیٹی نے نصیحت کی بات کہی تھی ، مگر ماں پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے لپٹی اور سر ھو گئی ۔ ماں کی پردہ داری کی وجہ سے باپ کو مبتلا کی شوخیوں کی پوری پوری خبر نہیں ھونے پاتی تھی ، پھر بھی جس قدر حال چار و ناچار معلوم تھا ، اس سے انھوں نے اتنا تو سمجھ لیا تھا کہ اس کا اٹھان اچھا نہیں ۔ مبتلا کو چھٹا سال لگا تھا ، باپ نے اس کو مکتب میں بٹھانا چاھا ؛ عورتوں نے عذر کیا کہ آئے دن تو یہ بیمار رھتا ھے ، مکتب کی قید ، استاد کی تنبیہ سے اس کا نگوڑا اتنا سا جی رھا سہا اور بھی اداس ھو جائے گا ؛ ابھی جینے تو دو ، اور مبتلا کی ماں نے تو کھلم کھلا کہہ دیا کہ جب تک اصل خیر سے ان گنا نہ گزر جائے میں تو اس کو نہ پڑھاؤں نہ لکھاؤں ۔ غرض ، عورتوں کی ھٹ اور ھیکڑی نے مبتلا کے پورے تین برس کھوئے ، مگر سچی بات یہ ھے کہ مبتلا کا باپ اپنی طرف سے برابر اس کی کوشش میں لگا رھا ۔ اس پر بھی جو مبتلا تین برس تک آوارہ ھوتا رھا تو یہ اس کے باپ کا مساھلہ اور ضعف ، ماں کی نادانی اور حماقت اور خود مبتلا کی بد قسمتی اور کم بختی ۔ اتنا تھا کہ جب باپ کو مبتلا کی کوئی بے جا بات معلوم ھوتی تو ڈراتے دھمکاتے تو نہیں ، مگر نرمی اور دل جوئی کے ساتھ اس

کو سمجھا ضرور دیتے کہ بیٹا یہ حرکت بہت نا مناسب ہے اور خود اس کے ساتھ ظاہری پیار اخلاص اتنا نہ رکھتے کہ ماں کی چوٹی کے ساتھ ان کی داڑھی بھی کھسوٹنے لگتا ۔ مبتلا کو باپ کا کسی طرح کا خوف تو نہ تھا ، مگر یوں کہو کہ زیادہ میل جول نہ ہونے کی وجہ سے ایک طور کی جھجک، اور رکاوٹ تھی ۔ چاہو اس کو لحاظ سے تعبیر کر لو ۔ مگر کیا اتنا کرنے سے مبتلا کے باپ نے باپ ہونے کا فرض ادا کیا ؟ ہرگز نہیں ۔ اس نے عورتوں کو مبتلا کی شرارتوں کی پردہ داری کرنے دی ۔ اس نے بیٹے کے حالات سے پوری پوری خبر نہ رکھی ۔ اس نے جتنی خبر رکھی اس کا بھی تدارک جیسا چاہیے تھا نہ کیا ۔ اس نے مستورات ناقصات العقل کی رائے میں آ کر جلد سے جلد بیٹے کو پڑھنے کے لیے نہ بٹھایا اور اس کے اکٹھے تین تین برس ضائع ہونے دیے ۔ اتنا غنیمت ہوا کہ مبتلا کو اس کی ماں نے اپنے وہم کے پیچھے اکیلا دوکیلا[۴] گھر سے باہر نہیں نکلنے دیا ، ورنہ محلے مین دھوبی ، کنجڑے ، بھٹیارے ، قصائی، تیلی ، اس قسم کے لوگ بھی رہتے تھے ۔ اگر کہیں مبتلا ان لوگوں کے لڑکوں مین کھیلنے کودنے پاتا تو ساری خوبیاں جا کر ایک ذاتی شرافت باقی تھی وہ بھی گئی گزری ہوتی ۔ جب تک میٹھا برس ختم ہو مبتلا کے مزاج کی تلخی اضعافاً مضاعفة بڑھ گئی تھی ۔ ادھر ابھی سالگرہ کو دو تین مہینے باقی تھے کہ باپ نے بسم اللہ[۵] اور مکتب کی چھیڑ چھاڑ شروع کی ۔ بارے اس مرتبہ عورتوں نے بھی چنداں مزاحمت نہین کی اور سالگرہ اور بسم اللہ دونوں تقریبیں ایک ساتھ ہو گئیں ۔

---

۴ ۔ اکیلا کا تابع مہمل ۔

۵ ۔ بچوں کو جب پڑھنا شروع کراتے تھے تو مکتب نشینی کی ایک خاص تقریب میں کچھ رسمیں ادا کی جاتی تھیں ۔ یہ تقریب بسم اللہ کہلاتی تھی ۔

دوسری فصل

مبتلا کی تعلیم مکتبی اور اس کا اثر

اتنا تو ہوا کہ مبتلا کے لیے دروازے پر مکتب بٹھانا پڑا[1] ۔ شروع شروع میں تو میاں جی کے پاس تک جانے اور مکتب میں بیٹھنے کے لیے مبتلا نے خوب خوب فیل مچائے اور غضب بکھیرا ، مگر آخر سودے کی چاٹ اور پیسوں کے لالچ اور ماں کے چمکارنے پچکارنے سے جانے اور بیٹھنے تو لگا ۔ بیٹھے بیٹھے پڑھنا چنداں مشکل نہ تھا ۔ ذہن اور حافظہ دونوں خدا داد اس بلا کے تھے کہ جو دوسرے لڑکے ہفتوں میں کرتے تھے ، وہ بھی بڑی ریں ریں کے ساتھ ، مبتلا گھنٹوں میں کھیلتے کودتے ، چلتے پھرتے ، اٹھتے بیٹھتے کر لیتا ۔ کہتے ہیں کہ دو دن میں تو اس نے الف بے کے حروف مفرد ایسی اچھی طرح پہچان لیے تھے کہ کتابوں میں سے آپ ڈھونڈ ڈھونڈ کر بتاتا ۔ پڑھنا تھا کہ اس کے ساتھ واہ واہ شاباش شروع ہوئی ۔ اس سے دل کی امنگ بڑھتی چلی اور ہر دا کھلتا گیا ۔ مبتلا نہ مطالعہ دیکھتا[2] نہ سبق

۱- اس قسم کے خانگی مکتب کا رواج خوش‌حال گھرانوں میں عام تھا ۔ مکتب کے معلم ''میاں جی'' کہلاتے تھے ۔

۲- مکتب کی تعلیم میں یہ ایک نہایت مفید طریقہ رائج تھا کہ طلبہ آگے کا سبق تیار کر کے آتے تھے ۔ مکتبی اصطلاح میں اسے مطالعہ دیکھنا اور پچھلا سبق دہرانے کو آموختہ پڑھنا کہتے تھے ۔

یاد کرتا ، نہ آموختہ پڑھتا ، مگر ایک ھی دفعہ کے دیکھ لینے سے وہ سب ھم سبقوں میں میر ھی رھتا تھا ۔ بد شوق اور شوخی اور شرارت کی نسبت جو چاھو سو کہو ، پڑھنے لکھنے کے متعلق تو میاں جی کو اس کی شکایت کرنے کا موقع ملا نہیں ۔ پرلے سرے کی بے توجھی اور حد درجے کی بد شوق پر چھ برس میں اس کی فارسی کی استعداد ایسی ھو گئی تھی کہ مکتب کے لڑکے تو کیا خود میاں جی ، باوجودیکہ اچھے جید فارسی دان تھے اور درسی کتابیں بھی ان کو خوب مستحضر تھیں ، اس کو سبق دیتے ھوئے بھناتے تھے ۔ مبتلا کو مکتب کی تعلیم نے اتنا فائدہ تو پہنچایا کہ اس کو ایک دوسرے ملک کی زبان جس کے بدون اُردو کی تکمیل نہیں ھو سکتی ، اچھی خاصی آ گئی ، مگر اس تعلیم سے اس کو ایک بہت بڑا نقصان[۳] بھی پہنچا جس کو اندر باھر کسی نے جانا پہچانا نہیں ۔ یہ کہنا مشکل ھے کہ مبتلا کو اپنا حسین ھونا کب سے معلوم ھوا ۔ ھم اوپر لکھ چکے ھیں کہ اس خاندان میں صورت شکل کی بڑی پرچول رھتی تھی ۔ اس خاندان کی عورتوں کے نزدیک تو دنیا بھر کے ھنر ، سلیقے ، حسب نسب ، دولت ، تندرستی ، نیک مزاجی ، صاحب اولاد ھونا ، دین داری ، ساری نعمتیں اور برکتیں ایک طرف اور گورا رنگ اور نقشہ ایک طرف ۔ صورت شکل تو انسان کے اختیار کی بات نہیں ، خدا جس کو جیسا چاھتا ھے بناتا ھے ۔ ایک ھی ماں کے پیٹ سے دس بچے ھوتے ھیں اور کیا خدا کی قدرت ھے کہ دس کی دس شکلیں ، ورنہ ایک دوسرے سے ملتبس ھو کر کوئی پہچان نہ پڑے ۔ انسان کے چہرے کی بساط کیا اتنی ھی سی جگہ

۳- فارسی شعراء کے عاشقانہ کلام کے مطالعے سے کم سن مبتلا کے کردار اور ذھنی نشوونما پر جو برا اثر پڑا ، یہاں اس کی طرف اشارہ ھے۔

میں ہزاروں لاکھوں کروڑوں مختلف نقشے ۔ یہ سب اس کی قدرت کی دلیلیں ہیں ۔ آدمی اتنا سمجھے تو اپنے چہرے مہرے پر نہ ناز کرے ، نہ دوسرے پر ہنسے ، مگر مبتلا کے خاندان کو ایسے خیالات سے کیا واسطہ ، یہاں تو چھوٹے بڑے ، بڈھے ، جوان ، بیاہے ، کوارے ، سب کو صورت شکل کا پٹنا تھا ۔ آپس ہی میں اسی صورت شکل کے پیچھے ایک کی ایک سے نہیں بنتی تھی ۔ ایک ایک کو چڑاتی ، ایک ایک کی نقلیں کرتی ، اور اتفاق سے کنبے میں کوئی تقریب ہوتی اور یہ لوگ مہمان جاتے یا کہیں شامت کی ماری کسی نئی دلہن کو دیکھ آتے تو بس مہینوں ان کو صورتوں کا جھگڑا لگا رہتا ۔ یہاں تک کہ ان عورتوں کی ایسی عادتیں دیکھ کر لوگ ان سے ملنے میں مضائقہ کرنے لگے تھے ۔ مبتلا کا ایسے خاندان میں پیدا ہونا اور پرورش پانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ جب اس کو بات کے سمجھنے کا شعور ہوا تو شاید سب سے پہلی بات جو اس نے سمجھی یہی ہوگی کہ حسن صورت اس کو کہتے ہیں اور میں اس کا مصداق ہوں ۔ مگر جب تک مبتلا زنان خانے کی نگرانی میں رہا اس کی عمر ہی کیا تھی ، سات آٹھ برس ، اس وقت تک وہ اتنا ہی سمجھ سکتا تھا کہ میٹھی چیز سب کو بھاتی ہے اور چونکہ وہ اپنے ذائقے میں بھی اس کی لذت پاتا تھا ، اس نے سمجھا تھا کہ حقیقت میں بھانے کی چیز ہے ۔ آگ کو چھوتے ہوئے لوگ ڈرتے ہیں اور اس نے بھی شاید دو چار بار اس سے چھکا کھایا ہو ۔ اس سے اس کو معلوم تھا کہ آگ سے جل جاتے ہیں ۔ غرض جس چیز کی نسبت لوگوں کو کہتے سنا کہ اچھی یا بری ہے ، آپ بھی تجربہ کیا تو ثابت ہوا کہ جس چیز سے آرام پہنچے ، دل کو خوشی ہو ، اچھی ہے اور جس سے ایذا پہنچے ، تکلیف ہو ، بری ۔ حسن کی خوبی کی

نسبت اس کو ایسا یقین کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا ، کیونکہ اس کو حسن سے متلذذ ہونے کی اس وقت تک اہلیت ہی نہ تھی۔ مکتب میں بیٹھنے کے بھی ایک مدت بعد اس میں جوانی کے ولولوں کی تحریک شروع ہوئی اور جوں جوں یہ تحریک قوت اور اشتداد پکڑتی گئی ، اس پر پسندیدگئی حسن کی وجہ منکشف ہوتی گئی ۔ اسی کا تذکرہ گھر میں تھا اور اسی کا سبق مکتب میں اور اب لگا اندر سے دل بھی اسی کی گواہی دینے ۔ مبتلا نے جو زبان فارسی کے سیکھنے میں غیر معمولی ترقی کی اس کا بھی سبب یہی تھا کہ اکثر کتابیں نظم ، جن کو مبتلا کی صورت شکل کا آدمی بے مزامیر ذرالے سے پڑھے تو اچھے خاصے ثقہ[۴] مجرے کا مزا ملے ۔ مضمون دیکھو تو جھڑا[۵] عاشقی ، جس کے نام سے نو عمر آدمی کے منہ میں رال بھر آئے ۔ مادہ قابل ، طبیعت مناسب ۔ مبتلا کا تو حال یہ تھا کہ جو شعر عاشقانہ ایک بار بھی اس کی نظر سے گزرا دیکھنے کے ساتھ ہی کالنقش فی الحجر[۶] ہو گیا ۔ غرض فیضان مکتب سے حضرت میں ایک صفت اور پیدا ہوئی ، یعنی عاشق مزاجی ۔

۴- ثقہ کے معنی ہیں قابل اعتماد یا معتبر - مجرے کے ساتھ یہ لفظ اعلیٰ یا معیاری کے معنی میں استعمال ہوا ہے -

۵- دھلی کی عام بول چال میں یہ لفظ مسلسل ، مطلق یا بالکل کے معنی میں آتا ہے - پورب (نواح لکھنؤ) میں یہ لفظ ''جھاڑ'' یا ''جھاڑ'' کی صورت میں بولا جاتا ہے -

۶- گویا پتھر کی لکیر -

تیسری فصل

مبتلا کا مدرسے میں تعلیم پانا اور برے لڑکوں کی صحبت میں آوارہ ہونا

مبتلا کے باپ کی تو پہلے ہی سے یہ رائے تھی کہ اس کو شروع سے مدرسے میں بٹھایا جائے، مگر عورتوں کو مبتلا کی اتنی مفارقت بھی گوارا نہ ہوئی - ناچار پورے چھ برس میاں جی کو نوکر رکھ کر اس کو گھر ہی پر تعلیم کرایا - اب میاں جی کا بھی سرمایۂ معلومات ہو چکنے پر آیا اور فارسی کی درسی متداول کتابیں سب مبتلا کی نظر سے نکل گییں اور بات صاف تو یہ ہے کہ مبتلا کے سر میں اب اور ہوا بھری ہوئی تھی - اس کی آنکھیں ڈھونڈتی تھیں یاروں کے جلسے ، دوستوں کی صحبتیں ، اور وہ گھر پر میسر نہ تھیں - باپ نے کچھ اور سوچا مبتلا نے کچھ اور ، غرض سب کی صلاح سے مبتلا مدرسے[1] میں داخل ہوا -

---

۱- اگرچہ مصنف نے مدرسے کا نام نہیں لکھا ، لیکن جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ اُس زمانے کے لحاظ سے قدیم دھلی کالج کے سوا اور کسی درسگاہ سے منسوب نہیں کی جا سکتیں - شمالی ہند میں جدید طرز کا یہ پہلا تعلیمی ادارہ تھا جہاں السنۂ مشرقیہ کے علاوہ انگریزی اور دیگر علوم جدیدہ کی تعلیم ہوتی تھی - ذریعۂ تعلیم اُردو زبان تھی - طلبہ کی ترغیب و تشویق کے لیے ماہانہ وظائف اور سالانہ جلسے کے موقع پر انعامات اور تمغے دیے جاتے تھے - یہ ادارہ ۱۸۳۰ء میں قایم ہوا تھا اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا -

گو مبتلا نے چھ برس مکتب میں تعلیم پائی ، مگر مکتب کیا تھا برائے نام ۔ اس کا جی بہلنے کے لیے چار پانچ ریزگی لڑکے اور بٹھا لیے گیے تھے ، یعنی بحساب[۲] چودہ برس کی عمر تک مبتلا بھونرے مین پلا اور دنیا کی کسی قسم کی ہوا اس کو نہ لگنے پائی ۔ اب جو مدرسے کی عربی جماعت میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا لڑکوں کا جنگل کہ سات سات آٹھ آٹھ برس کی عمر سے لے کر بیس پچیس پچیس برس تک کے اچھے خاصے جوان ، ہر ذات کے ہر پیشے کے ، چار ساڑھے چار سو لڑکے ایک جگہ جمع ہوتے ہیں ۔ اگرچہ انگریزی ، عربی ، فارسی ، سنسکرت ، ریاضی کی جماعتیں علیحدہ ہیں اور ہر جماعت کا کمرا الگ ، مگر اوقات درس کے علاوہ سب ایک دوسرے سے بلا امتیاز آزادانہ ملتے بات چیت کرتے اور کھیلتے ہیں ۔ مبتلا کو یہ حال دیکھ کر بلامبالغہ ایسی خوشی ہوئی ، جیسے کسی جانور کو قفس سے آزاد کر کے باغ میں چھوڑ دیا جائے ۔ اب تک وہ یہی جانتا تھا کہ میاں جی ہوے ، مولوی ہوئے بڈھے ہی ہوتے ہوں گے ، کیونکہ اس نے اپنے میاں جی کو دیکھا تھا ، پلکیں تک سفید ۔ یہاں مدرسے میں آ کر دیکھا مدرس اکثر جوان کہ اب سے چار چار پانچ پانچ برس پہلے خود طالب علم تھے ۔ امتحان دیا ، کامیاب ہوے ، زمرۂ مدرسین میں داخل کر لے گیے ۔ اس کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ بعض مدرس اپنی جماعت کے بعض بعض طالب علموں سے بھی کم سن ہیں ۔ جس جماعت میں مبتلا داخل ہوا چونکہ عربی کی سب سے چھوٹی جماعت تھی ، اس میں طالب علموں کی بڑی کثرت تھی ۔ رجسٹر میں تو ستر لڑکوں کا نام تھا ، مگر پچاس پچپن ہمیشہ حاضر رہتے تھے ۔ ان میں سے ایک تہائی کے قریب مبتلا سے بہت بڑی عمر کے تھے ۔

۲- بحساب یعنی ایک حساب سے* ۔

جماعت کو جو مولوی صاحب پڑھاتے تھے ، جیسے ان کی
ت سب جماعتوں میں چھوٹی تھی ویسے ہی تمام مدرسوں میں
د بھی سب سے چھوٹے تھے ؛ عمر میں ، قد و قامت میں
ت و وجاہت میں ، یعنی قسمت سے مدرس بھی ملے تو یار
اد ۔ لونڈا تھا نکیلا اور طرح دار ، مدرسے کے احاطے میں پاؤں
دھرنا تھا کہ یاروں نے مبتلا کو ہاتھوں ہاتھ لیا ۔ بعضے تو
کی باندھ باندھ کر ایسی بری طرح گھورتے تھے کہ گویا
ھوں کے رستے کھائے جاتے ہیں ۔ پہلے ہی سے لڑکوں میں
، سی ٹولیاں تھیں ، اب ایک بڑی بھاری اور نئی ٹولی مبتلا
قائم ہوئی ۔ ایک جماعت بندی تو سرکاری تھی کہ جس قدر
کے ہم سبق ہوتے سب کے سب وقت واحد میں ایک استاد سے
تے ، مگر ایک جماعت بندی لڑکوں نے آپس میں ٹھہرا رکھی
، جس کو ہم نے ٹولی سے تعبیر کیا ۔ جس طرح سرکاری
ت بندی کے اوقات مقرر تھے کہ مثلاً جب ریاضی کا گھنٹہ
، عربی اور فارسی اور سنسکرت کی جماعتوں سے جو جو ریاضی
پڑھنے والا تھا ، ماسٹر صاحب کی خدمت میں آ حاضر ہوا ؛
طرح ٹولیوں کے اجتماع کے بھی خاص خاص اوقات تھے ۔
سے کے وقت سے ذرا پہلے کہ لڑکے سویرے مدرسے میں آ پہنچتے
جب ایک بجے نماز کے لیے ایک گھنٹے کی چھٹی ہوتی یا مدرسہ
ست ہونے کے بعد ۔ ان تین وقتوں میں جو لڑکا جس ٹولی کا
اس میں آ ملتا اور بعض پھٹیل بھی پڑے پھرتے تھے جو کسی
، میں نہ تھے ۔ یہ ٹولیاں ایک مجمع ناجائز تھیں اور ان کی
اض مشترکہ تمام تر بے ہودہ ۔ مدرسے کے سارے انتظام
ے تھے ۔ چیزیں وہ پڑھاتے جو دنیا میں بکار آمد[۳] ہوں ۔

۳۔ فارسی محاورہ ''بکار آمدن'' سے مشتق ہے۔ اب صرف ''کار آمد'' بولا
ہے۔

شوق کے مشتعل کرنے کو امتحان کا قاعدہ نہایت عمدہ تھا فرداً فرداً ایک ایک لڑکے کو الگ الگ سبق پڑھانے سے جماعت جماعت کو پڑھانے کا نہایت مفید طریقہ تھا - اس سے لڑکوں میں ایک طرح کی منافست پیدا ہوتی تھی کہ ایک پر ایک سبقت لے جانی چاہتا تھا - دوسرے ہم سبق ہونے سے ایک ، ایک کی مدد کر سکتا تھا - تیسرے لڑکوں کی لیاقت کا موازنہ اور مقابلہ بخوبی ہو سکتا تھا - لڑکوں کو حاضر باشی کا پابند کرنے کے لیے ترتیب نشست کا رد و بدل بھی بہت مؤثر تھا - پڑھائی اس قدر تھی کہ لڑکوں کے تمام وقت کو مشغول رکھنے کے لیے بخوبی کافی تھی - نوبت بہ نوبت مختلف مضامین کے پڑھانے سے طبیعت ملول اور کند نہیں ہونے پاتی تھی - غرض سبھی انتظام بھلے تھے ، مگر افسوس لڑکوں کے چال چلن اور اخلاق کی طرف کسی کو مطلق توجہ نہ تھی[۴] - ہر مدرس اس فکر میں رہتا کہ جس چیز کا پڑھانا اس سے متعلق ہے، اس چیز کے امتحان میں لڑکے برے نہ رہیں- جب تک کوئی لڑکا اس شرط کو پورا کیے جاتا ہے اگرچہ چوری چھپے ناجائز طور پر دوسرے سے مدد لے کر ہی کیوں نہ ہو، کسی کو اس کے کردار سے بحث نہیں - چوری کرو، جھوٹ بولو ، سربازار جوتی پیزار لڑو، گالیاں دو اور گالیاں کھاؤ، شرافت کو بٹا لگاؤ، بدمعاشوں میں رہو اور بدمعاش بنو، گیڑیاں کھیلو، پتنگ لڑاؤ، اکھاڑے میں جا کر ڈنٹر پیلو ، مگدر ہلاؤ، گاؤ بجاؤ، غرض جو تمہارا جی چاہے سو کرو ، مگر جو چیزیں پڑھائی جاتی ہیں ان میں امتحان اچھا دو تو سکالرشپ بھی ہے، انعام بھی ہے، سرخ روئی بھی ہے، آفرین اور تحسین بھی ہے، واہ واہ بھی

۴- یہ خرابی جو اس وقت تھی اب تک چلی آ رہی ہے ، کیونکہ ہمارے نظام تعلیم کی بنیادیں وہی ہیں-

ہے اور آخرکار نوکری بھی ہے ۔ مدرس خوش ، پرنسپل صاحب راضی ۔ مبتلا کی افتاد تو روز پیدائش سے بگڑی ہوئی تھی ۔ زنان خانے میں پرورش پاتا تھا کہ اس کے دل میں بدی کا بیج بویا گیا، مکتب میں تھا کہ بیج کا درخت ہوا ، اب مدرسے میں آکر وہ درخت پھولا اور پھلا۔ گھر میں بچھڑا تھا، مکتب میں بچھڑے کا بیل ہوا اور مدرسے میں بیل کا سانڈ ۔ کسی قسم کی آوارگی نہ تھی جو اس سے ..ی ہو اور کسی طرح کی بیہودگی نہ تھی جو اس نے نہ کی ہو۔ جس طرح مبتلا مدرسے کے برے لڑکوں کی صحبت میں بانکا بنا ، چھیلا بنا ، طرح دار بنا، مسخرہ بنا، کوچہ گرد بنا ، ننگ خاندان بنا، اور کیا کیا بنا ؛ اسی طرح مبتلا تخلص رکھ کر شاعر بنا ۔ اور فضیحتیں تو رفتہ رفتہ بھولی بسری ہوگئیں ، شاعری کی یادگار اس کا منحوس تخلص رہ گیا ۔ ہم کو تو اس کے نام سے اس قدر نفرت ہوگئی ہے کہ اس کے حالات کا دریافت کرنا کیسا سننے کو بھی جی نہیں چاہتا ؛ مگر خیر منہ پر بات آئی رک نہیں سکتی ۔ آٹھ برس یہ کم بخت مدرسے میں رہا، آخر کچھ نہ کچھ پڑھتا ہی ہوگا کہ عربی کی دوسری جماعت تک اس نے ترقی کی ۔ دس روپے مہینہ وظیفہ پاتا تھا ، برس کے برس انعام بھی ملتے رہتے تھے ۔ ایک سال سنا کہ ایسا اچھا امتحان دیا کہ تمغہ ملا۔ یہ کچھ تعجب کی بات نہیں اور نہ اس سے آوارگی کا الزام دفع ہوسکتا ہے ۔ ہم کو اس کی ذکاوت کا حال معلوم ہے ۔ وہ اس بلا کا ذہین تھا کہ مدرسے کی پڑھائی اس کے آگے کچھ حقیقت ہی نہ تھی ۔ برس میں ایک بار تو امتحان ہوتا تھا ، اکثر انگریزوں کے بڑے دن سے پہلے ۔ پس امتحان کے مہینے ڈیڑھ مہینے آگے سے وہ تیاری کرلیتا ہوگا، لیکن فرض کیا کہ وہ اچھی طرح پڑھتا ہی ہو تو بد وضع کو پڑھنے سے فائدہ، علم سے حاصل ؟ اس سے جاہل بمدراج بہتر، ان پڑھ کہیں بھلا ۔

مدرسے سے پھر سوا پھر رات گیے، بلکہ کبھی آدھی کبھی پچھلی رات کو تو اس کا گھر میں آنے کا معمول شروع سے تھا اور پھر اچھی طرح سورج نہیں نکلا کہ اس کے شیاطین الانس[۵] لگے گھر پر آ کر کنڈی کھٹکھٹانے، دستک دینے اور پکارنے، سیٹی بجانے۔ اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ تین تین چار چار دن تک برابر غائب۔ ماں کو یہ تمام تفصیلی حالات معلوم تھے، مگر اب اس کی محبت کا دوسرا رنگ تھا۔ بیٹے سے اس قدر ڈرتی تھی جیسے قصائی سے گائے۔ اس کے دل میں آپ سے آپ یہ خوف سما گیا تھا کہ بیٹا ہے ماشاءاللہ جوان، ایسا نہ ہو میری بات کا برا مان کر کہیں کو نکل جائے یا اپنے تئیں ہلاک کرے تو پھر میں کدھر کی ہوئی۔ اس ڈر کے مارے بے چاری کبھی چوں نہیں کرتی تھی اور مبتلا نے اپنے تئیں اس کے نزدیک ایسا ہوا بنا رکھا تھا کہ جب اس کی صورت دیکھتی ہکا بکا ہو کر رہ جاتی۔ پہلے سے بھی مبتلا کی شرارتوں کی باپ سے پردہ داری کی جاتی تھی۔ اب انھیں شرارتوں کی بدکرداریاں ہوگئی تھیں۔ ادھر شرارتوں میں ترقی ہوئی ادھر پردہ داری میں زیادہ اہتمام ہونے لگا، مگر باپ نے دھوپ میں ڈاڑھی سفید نہیں کی تھی، بڈھا اس کی چال ڈھال سے، اس کی گفتگو سے، اس کی کن انکھیوں سے تاڑ لیتا تھا، مگر بی بی کا مغلوب تھا اور خوب جانتا تھا کہ اس کو بیٹے کے ساتھ بلا کا شغف ہے اور یوں بھی ہر کام میں مساہلت کرنا اس کی ہمیشہ کی عادت تھی اور انھیں وجوہ سے اس نے مبتلا کی اصلاح کی طرف کبھی پوری توجہ نہ کی، اب جوان بیٹے کے کیا منہ لگتا۔ ایک

۵- یعنی شیطان کی طرح بہکانے والے، شریر دوست۔

کہتا تو دس سنتا۔ آخر اس کے سوائے اور کچھ نہ سوجھ پڑی کہ جس قدر جلد ممکن ہو اس کو پابند کردیا جائے[٦] ۔

٦- یعنی شادی کر دی جائے، تاکہ اس کی آزادی پر ایک طرح کی بندش لگ جائے ۔

چوتھی فصل

مبتلا کا بیاہ اور اس کا معاملہ بی‌بی کے ساتھ

یہ کب کی بات ہے کہ مبتلا کو مدرسے میں داخل ہوئے چوتھا برس شروع تھا ۔ خوش‌حال باپ کا بیٹا ، صورت شکل کا اچھا ، بلکہ حد سے زیادہ اچھا ، پڑھا لکھا ، کماؤ ، دس روپے[1] کا مدرسے میں وظیفہ دار ؛ اس روداد کے لڑکے کو بیٹیوں کی کیا کمی تھی ۔ قاعدے کے مطابق مبتلا کی طرف سے بیٹی والوں کے یہاں ابتداءً رقعہ جانا چاہیے تھا ، مگر مبتلا کے ظاہری حالات دیکھ سن کر لوگ اس قدر ریجھے ہوئے تھے کہ کئی جگہ سے بیٹی والوں نے منہ پھوڑ کر رقعہ منگوا بھیجا ۔ دستور کی بات ہے کہ خریداروں کی کثرت ہوتی ہے تو بیچنے والے کے مغز چل جاتے ہیں ۔ مبتلا کی ماں بہنوں کا یہ حال تھا کہ کہیں کی بات ان کے خاطر تلے آتی ہی نہ تھی، ورنہ کیا مبتلا جیسا اللہ آمین کا بیٹا سترہ اٹھارہ برس کی عمر تک کوارا بیٹھتا! اب تک تو اس کے ایک چھوڑ کبھی کے چار چار بیاہ ہو گیے ہوتے ۔ اس گھر کی

---

۱ ۔ کتاب میں جہاں کہیں رقمیں درج ہیں ، اُن کی قدر و قیمت کا اندازہ اس حساب سے لگانا چاہئے کہ اُس زمانے میں روپے کی قوت خرید آج کل کے مقابلے میں بیس پچیس گنا زیادہ تھی ۔

حوش حالی اتنی ھی تھی کہ قلعے[۲] کی تنخواھیں ، اسامیاں ، مکانات کا کرایہ ملا کر کل سو سوا سو روپے کی آمدنی تھی اور اس میں اتنا بڑا کنبہ ، مگر وہ تو مبتلا کا باپ ایسا منتظم اور کفایت شعار آدمی تھا کہ اس نے اپنے سلیقے سے گھر کا بھرم بنا رکھا تھا ۔ اس حالت پر جہاں کہیں سے پیام آیا ، چھوٹتے کے ساتھ ایک دم سے چاندی کا بھی نہیں سونے کے پلنگ کی فرمایش ایسے اصرار کے ساتھ ھوتی تھی گویا کہ نکاح کی شرط اعظم ھے ، اور پھر معاملے کی بات ھے جیسا لینا ویسا دینا ، ھیکڑی تو یہ تھی کہ لیں تو سنہرا پلنگ اور دینے کے نام ، پٹاری[۳] کے خرچ کے لیے ادھی نہیں ، کیونکہ ھمارے خاندان کا دستور نہیں ۔ مہر شرع محمدی، سو روپے کا چڑھاوا، سو روپے کا جھومر ۔ صورت شکل اپنی اپنی جگہ سبھی تلاش کرتے ھیں اور سمجھنے اور غور کرنے والے کو تو یہ بات ھے کہ باوجودیکہ ھر شخص خوبصورتی کا خواھاں ھے ، مگر بری بھلی ، کالی گوری ، یہاں تک کہ کانڑی[۴] ، کھدری ، اللہ کی بندیاں سبھی کھپی چلی جاتی ھیں ۔ ھم نے تو اتنی عمر ھونے آئی کسی کو صورت کی وجہ سے کواری بیٹھے نہ دیکھا ، تاھم چونکہ مبتلا ایک خوبصورت خاندان کا آدمی اور خود بھی بڑا خوبصورت تھا ، اگر

۲- قلعے والے، یعنی بہادر شاہ ظفر اور خاندان شاھی کے دیگر افراد خود ھی انگریزوں کے پنشن خوار تھے، لیکن سرکار دربار کے پرانے مراسم ، پرانے نام سہی ، اب تک برقرار تھے اور قدیم متوسلین کی تنخواھیں بھی قدرے قلیل جاری تھیں ۔

۳- دولہن کے پاندان کا خرچ یا جیب خرچ جو شادی کے وقت دولہا سے مقرر کرا لیتے یا نکاح نامے میں لکھوا لیتے تھے ۔

۴- نواح دھلی میں پنجابی لہجے کے اثر سے ''کانڑی'' بولتے ھیں ، لیکن تحریر میں ھمیشہ 'کانی' آتا ھے ۔

اس کے لیے خوبصورت بی بی تلاش کی جاتی تھی تو کچھ بے جا بات نہ تھی ، مگر تلاش کرنے کے بھی طریقے ہوتے ہیں کہ عورتیں چوری چھپے حیلے بہانے کسی نہ کسی طرح لڑکی کو یا تو خود کسی وقت دیکھ آتی ہیں یا اپنے دیکھنے کا موقع نہیں بنتا تو کسی کو بھیج کر دکھلوا لیا کرتی ہیں ۔ یہاں تو یہ ضد کہ ہم تو اپنی آنکھ سے دیکھ بھال کر کریں گے اور اپنے ہاتھوں سے لڑکی کے منہ میں مصری کی ڈلی دیں گے ۔ کیسی کیسی جگہ سے پیام آئے ، کہاں کہاں رقعہ گیا ؛ مگر کہیں لین دین پر تکرار ہوئی ، کہیں صورت پسند نہ آئی ، کہیں دیکھنے بھالنے کی شرط نامنظور ہوئی ؛ غرض کوئی بات ٹھہری ٹھہرائی نہیں ۔ پچاسوں پیام مسترد اور بیسیوں جگہ سے رقعہ واپس ۔ رشتے ناتے کی بات چیت ہو کر چھٹم چھٹا[۵] ہو جانا یا رقعہ واپس آنا کچھ آسان نہیں ہے ۔ بیٹی والے اس میں اپنی ہتک سمجھتے ہیں اور ان کو یہ خیال ہوتا ہے کہ ایک جگہ کا رقعہ واپس جائے گا تو دوسروں کو خدا جانے کیا کیا خیالات پیدا ہوں گے ۔ اکثر ایسے موقع پر دلوں میں رنجش آ جاتی ہے ۔ خیر ایک دو جگہ بمجبوری ایسا اتفاق ہو تو مضایقہ نہیں ، نہ کہ مبتلا کا رقعہ ، آج بھیجا اور اد بدا کر دس دن بعد الٹا منگوا لیا ۔ جب متواتر واپسی رقعے کی نوبت پہنچی تو سارے شہر میں ایک غل سا پڑ گیا اور جہاں جہاں سے رقعہ واپس منگوایا گیا ، ان کے ساتھ بیٹھے بٹھائے ایک طرح کی عداوت قائم ہوئی ۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ جس مشاطہ سے کہتے ، کانوں پر ہاتھ دھرتی ۔ جہاں رقعہ بھیجتے ، وہ لوگ لانے والے کے اندر آنے تک کے

۵- یعنی چھوٹ جانا ، ختم ہو جانا ۔ کھلم کھلا اور گتھم گتھا کے وزن پر کبھی کبھی بے تکلف بول چال میں آتا ہے ۔

روادار نہ ہوے ۔ پس اس خاندان کے ناز بے جا نے مبتلا کو ایسا نکو بنا دیا کہ اب کوئی اس کی بات کی حامی[۶] نہیں بھرتا تھا ۔ رقعے کا بے ردوکد واپس آنا تو ممکن نہیں ۔ ایک گھر کا تو ہم کو حال معلوم ہے کہ وہاں پہلے مشاطہ کی معرفت زبانی بات چیت ہوئی ۔ وہ لوگ ان کے کنبے دار ، بلکہ کچھ دور کے رشتہ دار بھی تھے ۔ مہینوں سوال جواب ہوتے رہے ۔ اکثر باتیں طے ہوکر بعض کی نسبت کچھ تکرار درپیش تھی کہ یکایک ان کی طرف سے رقعہ جا موجود ہوا ۔ بیٹی والے خوش ہوئے کہ گفت و شنید کے بعد جو رقعہ آیا تو بس اس کے یہی معنی ہیں کہ منظور کر لیا ۔ چنانچہ یہی سمجھ کر رقعہ تو رکھ لیا اور جواب میں زبانی اتنا ہی کہلا بھیجا کہ ہم کو بسرو چشم منظور ہے ، خدا انجام اچھا کرے ۔ ان شاءاللہ دو چار دن میں صلاح کر کے کوئی اچھی سی تاریخ ٹھہرا کر کہلا بھیجیں گے سمدھنیں آ کر لڑکی کا منہ میٹھا کر جائیں ؛ پھر اللہ خیر کرے ، جب ان کی مرضی ہو گی بیاہ برات ہو رہے گا ۔ ہم تو اس وقت چاہیں تو اس وقت تیار ہیں ۔ ہمارے یہاں ذرا دیر نہیں ۔ جو عورت یہ پیام لے کر گئی تھی ، مبتلا والوں نے اسی کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ پہلے ہماری شرطوں کے مطابق تحریری اقرارنامہ بھیج دیں ، تب تاریخ ٹھہرائی جائے ۔ تاریخ کا ٹھہرانا ایسا کیا آسان ہے ؟ یہ سن کر سب کو سخت تعجب ہوا اور اپنا سا منہ لے کر رہ گیے ۔ آخر مبتلا والوں کی طرف سے واپسی رقعے کا

۶۔ دوسرے ایڈیشن میں جو خود مصنف کی زیر نگرانی شائع ہوا تھا ، یہ لفظ اپنی صحیح صورت میں (ہائے ہوز سے) لکھا ہوا ہے۔ پہلے اور بعد کے تمام ایڈیشنوں میں ''ہامی'' کی جگہ ''حامی'' لکھ دیا گیا ۔ واضح ہو کہ ''ہامی بھرنا'' میں ہامی کو حامی لکھنا صحیح نہیں ۔ یہ لفظ غالباً ہاں سے بنا ہے اور عربی کے ''حامی'' سے اس کا کوئی تعلق نہیں ۔

تقاضا ہوا ۔ دن میں دو دو بار رقعے کے لیے آدمی جاتا اور ایسی سخت سخت باتیں کہتا کہ گویا رقعہ کیا ہے مہاجن کا قرضہ ہے ۔ خیر ہار کر رقعہ واپس تو کیا ، مگر اس طرح کہ مارے غصے کے نکال کر موہری پر پھینک دیا کہ کم خواب کی تھیلی ، جس میں رقعہ دستور کے مطابق لپٹ کر آیا تھا ، تمام کیچڑ میں لت پت ہوگیی ، اور کہا کہ ''جاؤ اس کو شہد لگا کر چاٹو اور دیکھو خبردار لڑکے کی ماں سے ضرور ضرور کہہ دینا کہ تم نے کنبے داری میں دو مہینے بات لگی رکھ کر آپ ہی رقعہ بھیجا اور پھر آپ ہی ان ہونی باتوں پر اصرار کر کے واپس منگوایا ؛ یہ کچھ بھلمنساہت کی بات نہیں ہے ۔ ہم نے مانا کہ ان کا بیٹا ان کے لیے چوہے کو ہلدی کی گرہ ، اللہ آمین کا ہے ، مگر دوسروں نے بیٹیاں کوڑے پر پڑی نہیں پائیں ۔ ایسی شرطوں سے جو نہ سنیں نہ دیکھیں ان کو شہر میں تو ان شاءاللہ بیٹی ملنے کی نہیں ۔ سونے کا پلنگ ان کو مانگتے ہوئے شرم نہیں آتی ۔ اس سے پہلے تین بیٹیاں بیاہ چکے ہیں اور ابھی اللہ رکھے آگے دو اور موجود ہیں ؛ بیٹیوں کو تو ڈھنگ کے نواری پلنگ بھی نہ جڑے ، بیٹے میں ایسا کیا سرخاب کا پر لگا ہے کہ بدون سونے کے پلنگ کے اس کو نیند نہیں آتی ۔ اے وہ نگوڑا ہیجڑا، زنخا ، جس کو سارا شہر تھڑی تھڑی کر رہا ہے ، خدا نہ کرے جو کوئی بھلا مانس اس کو بیٹی دے ۔ منہ پر ہاتھ پھیر کر دیکھیں ناک رہی یا کٹ گئی ۔ ہمارے نزدیک ، دنیا جہان کے نزدیک تو جڑ بنیاد سے کٹ گئی ۔'' جس گھر سے رقعے کی واپسی کا مذکور ہے ، اس گھر کی عورتیں ایسی ملنسار تھیں کہ سارے شہر میں ان کا حصہ بخرا چلتا تھا ۔ کہیں شادی بیاہ ہو ، کوئی دوسری تقریب ہو ، ان کے یہاں ضرور بلاوا آتا اور یہ بھی اپنے

یہاں کی چھوٹی بڑی تقریبات میں سبھی کو بلاتے ، سبھی کو یکساں پوچھتے تھے ۔ ان عورتوں نے ضد میں آ کر مبتلا کا اچھی طرح خاکہ اڑایا اور شہر میں خوب ڈھنڈورا پیٹا اور رسوا کیا ۔ غرض اس گھر کے بگاڑ نے رہی سہی اور بھی آس توڑ دی ۔ اب شہر میں مبتلا کی نسبت ناتے کا ہونا محال تھا ۔ بہت قریب کے رشتہ داروں میں جس قدر بیٹیاں تھیں ، مبتلا تھے تو بڑے لاڈلے ، دودھ پی پی کر ان سب کو رضاعی بہنیں بنا چکے تھے ۔ مبتلا کے نزدیک و دور کے رشتہ داروں میں وہی مثل تھی ''ازیں سو راندہ وزاں سو درماندہ'' اب صرف ایک گھر رہ گیا کہ ہو تو وہیں ہو ، ورنہ مبتلا ساری عمر کوارا پڑا پھرے ۔ مبتلا کی پھوپھی دلی سے دس بارہ کوس سید نگر میں بیاہی ہوئی تھیں ۔ وہ لوگ زمیندار تھے ، مگر زمینداروں میں سربرآوردہ ، بڑے بڑے سالم چھ گاؤں کے مالک ۔ ان کے بزرگ تو مہمان داری اور مسافر نوازی اور داد و دہش میں دور دور مشہور تھے ، مگر اب کثرت پٹی‌داری کے سبب نہ ویسی آمدنی تھی نہ وہ دل ۔ قرب شہر کی وجہ سے رعایا شوخ ، حصہ داروں میں طرح طرح کی تکراریں ، غرض ہمیشہ ان میں کے دو چار آدمی مقدموں کی پیروی کے لیے شہر میں موجود رہتے تھے ۔ جس طرح دائم‌المرض اپنی دوا کرتے کرتے حکیم ہو جاتا ہے ، اسی طرح یہ لوگ مقدمے لڑتے لڑتے ایسے قانون دان ہو گیے تھے کہ بیرسٹروں کو مات کرتے ، وکیلوں کی کچھ حقیقت نہ سمجھتے ۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر لڑائیاں مول لیتے اور تلاش کر کے جھگڑے خریدتے ۔ قرب و جوار میں یہ لوگ ایسے لڑاکو اور جھگڑالو مشہور تھے کہ لوگ ان سے رشتہ ناتا کرتے ڈرتے تھے ۔ رقعے کا پہنچنا تو بہت بڑی بات تھی ، اگر ان کے یہاں جھوٹوں بھی

تذکرہ ہوتا اور یہ چاہتے تو سچوں سر ہو جاتے اور کچھ ایسے قانونی اڑنگے لگاتے کہ کسی کی ایک نہ چلتی ، مگر مبتلا کو کوئی دوسرا گھر نہ تھا ۔ خدا نے ایسا ان کے غرور کو ڈھایا کہ کس کا پلنگ اور کہاں کا دیکھنا بھالنا ، مبتلا کی ماں گئیں اور منگنی ٹھہرا کان دبا کر چپکی چلی آئیں اور اگر ذرا بھی چیں چپڑ کرتیں تو فوجداری کے استغاثوں اور دیوانی کی نالشوں کے مارے ہوش بگڑ جاتے ۔ اب مبتلا کی منگنی کو منگنی نہ سمجھو ، بلکہ بیچ ڈالنا یا غلام بنا دینا یا عمر قید ۔ سمدھیانے تو برابر ھی کے اچھے ہوتے ہیں ؛ خیر اٹھارہ بیس تک کے فرق کا بھی مضائقہ نہیں ، مگر یہاں تو سید نگر والوں کی اس قدر ہیبت چھا رہی تھی کہ جیسے کسی بڑے جابر کوتوال کی ۔ اُدھر سے حکم ہوتے تھے ادھر سے تعمیل ؛ اُدھر سے فرمائش ادھر سے بجا آوری ؛ اُدھر سے ناز ادھر سے نیاز ۔ بعد چندے انھوں نے کہلا بھیجا کہ اگلے مہینے کی دسویں کو اس طرح سازوسامان کے ساتھ بارات یہاں پہنچے ۔ ویسا ھی ہوا ۔ بیس ہزار روپے کا مہر ماننا ہو گا اور مان لیا ۔ ہزار روپے جوڑے چڑھاوے کا نقد دینا ہوگا اور دیا ۔ پچیس روپے مہینہ پٹاری کا خرچ لکھوانا چاہا اور لکھوا لیا ؛ مگر بات یہ ہے کہ سید نگر والوں نے بیٹی کو دیا بھی تو اتنا کہ سونے کا پلنگ تو نہ تھا ، شاید ان کے ہاں کا دستور نہ ہوگا ؛ مگر گلے اور کانوں اور سر کا سارے کا سارا زیور دوھرا ملا ، جڑاؤ الگ ۔ شادی بیاہ اپنے نام کے مطابق کیا ۔ دلی میں اتنا جہیز ملنا مشکل تھا ۔ لوگ باھر کی سوبھا اور مال و اسباب کی فہرست دیکھ کر پانچ ساڑھے پانچ ہزار کا جہیز آنکتے تھے ، اوپر کا خرچ الگ ؛ سو گھر کا دھڑیوں گھی اور غلہ زمینداروں کے یہاں اس کا حساب کیا ۔ انیسویں برس مبتلا کا بیاہ ہوا ۔

جہیز کے اعتبار سے تو دلہن بہت اچھی پائی - ذات جماعت کچھ پوچھنی نہ تھی ، سگی پھوپھی کی بیٹی - رہی صورت ، کوئی خاص چیز تو چنداں بری نہ تھی، بلکہ الگ الگ دیکھو تو رنگ بھی گورا نہیں تو کھلتا ہوا چنپئی ؛ آنکھ ، ناک ، دھانہ ، ماتھا، مانگ، کسی میں کوئی عیب نہ تھا - ہاں چہرے کی مجموعی بناوٹ میں خدا جانے کیا بات تھی ، نزاکت اور جسم میں جامہ زیبی نہ تھی - ہزار بیبیوں میں بیٹھی ہو تو صاف پہچان[۷] پڑتی کہ باہر کی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ مبتلا کے پہلو میں رہی سہی اور بھی بے رونق معلوم ہوتی تھی - جن دنوں مبتلا کا بیاہ ہوا وہ اپنے آپے میں نہ تھا - نشۂ شباب میں سرشار اور بدمست ، سیر تماشوں میں منہمک - وہ اپنے بیاہ برات کی خبر سن کر خوش ہوتا تھا ، مگر صرف اس لیے کہ ناچ[۸] دیکھنے میں آئیں گے - شادی کی تیاری دیکھ کر مسرت ظاہر کرتا تھا ، مگر اس غرض سے کہ گانا سنیں گے - وہ اگر سمجھ کو کام میں لاتا تو اس کی سمجھ رسا تھی اور جان سکتا تھا کہ بیاہ کیا چیز ہے اور بیاہ سے کس طرح کی ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں ، مگر وہ دنیا کے کام میں مطلق غور کرتا ہی نہ تھا - اس نے ایک لمحے کے لیے بھی بیاہ کے انجام کو نہ سوچا - اس نے نکاح کے وقت قبلت[۹] کہا ، گویا کہ کھیل ہے ؛ اقرار نامے پر دستخط کیے ، یعنی ہنسی ہے - اس کو بی بی کی طرف ملتفت ہونا چاہیے تھا اور ملتفت ہونے کی اس کی عمر بھی تھی ، مگر اس کی آنکھیں

۷- جیسے شہر والوں کے درمیان کسی جاہل دیہاتی کا گنوار پن چھپائے نہیں چھپتا - مشاہدے کی نزاکت قابل توجہ ہے - تربیت و تہذیب نہ ہو تو ظاہر بے عیب چہرہ بھی جاذبیت سے محروم رہتا ہے -

۸ - شادی بیاہ کی تقریبوں میں طوائف یا بھانڈ کے ناچ کا عام رواج تھا -

۹- میں نے قبول کیا - نکاح کے وقت ایجاب و قبول اسی طرح ہوتا ہے*-

ڈھونڈتی تھیں ناز و کرشمہ ، غمزہ و ادا ، مٹک چٹک ؛ وہ شریف زادیوں میں کہاں اور خصوصاً دیہات کی شریف زادیوں میں ۔ پس اس نے بی بی کو دیکھا نا پسندیدگی سے ، استکراہ سے ، اور نا خوشی سے اور بی بی کے ساتھ اس کی لشٹم پشٹم گزرتی گئی اور آپس میں ویسی محبت و موانست پیدا نہ ہوئی ، جیسے نئے بیاہے ہوئے دولہا دلہن میں ہونی چاہیے اور عموماً نہیں تو اکثر ہوا بھی کرتی ہے ۔ علاوہ اس کے مبتلا کو ابھی اپنی ہی پرداخت سے فرصت نہ تھی ۔ سو دلہنوں کی ایک دلہن تو وہ آپ بنا تھا ۔ بناؤ سنگھار میں ہر دم مصروف ، زیب و زینت میں ہر لمحہ مشغول ۔ وہ خود اپنی حسن صورت پر اس قدر فریفتہ تھا کہ آئینہ دیکھنے سے کبھی اس کو سیری ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس کو یہاں تک خبط نے گھیر رکھا تھا کہ راستہ چلتا تو مڑمڑ کر اپنے سایے کو دیکھتا جاتا[۱۰] ۔

۱۰- عنفوان شباب کی اس ذہنی کیفیت کو نفسیات کی اصطلاح میں نرگسیت کہتے ہیں۔

پانچویں فصل

مبتلا کی مصیبتوں کا آغاز اور اس کی بدکرداریاں

بیاہ تک مبتلا کی زندگی نہایت ہی بے فکری سے گزری ۔ اس نے چودہ برس کی عمر تک گھر میں ایسے عیش و آرام کے ساتھ ورش پائی کہ کم تر کسی کو نصیب ہوتا ہے ۔ مدرسے میں ں کے یار دوستوں نے ماں باپ سے بڑھ کر اس کی نازبرداریاں ئیں ، مگر اب اس کے عیش کی مدت، آرام کی مہلت پوری ہوچکی ہی ، اور یہی حال ہے دنیا کی تمام حالتوں کا کہ راحت ہے تو ک وقت خاص تک اور مصیبت ہے تو وہ بھی ایک معیار مقررہ ک ۔ نہ اس کو ثبات اور نہ اس کو قیام ؛ وہ عارضی اور یہ د روزہ ۔ جن کو خدا نے عقل سلیم دی ہے وہ ہر حالت کو ں طور پر انگیز کرتے ہیں کہ اس کے زائل ہونے پر ان کو جل نہ ہو ، تاسف نہ کرنا پڑے ۔ اتنا نہیں کھاتے کہ تخمہ ہو ، ے دوڑ کر نہیں چلتے کہ ٹھوکر لگے ۔ عادتوں کو طبیعت نہیں نے دیتے اور امور اتفاقی کو ضروری نہیں سمجھ لیتے ۔ لیاقت ہنر یا صفت یا جوہر یا خوبی یا مابہ‌الامتیاز یا سرمایۂ فخر و ناز ذریعۂ تعریف یا وسیلۂ تقریب جو کچھ سمجھو ، مبتلا کے ں ایک حسن صورت تھا اور بس ۔ یہی ایک چیز تھی

جس کی وجہ سے وہ ہر دل عزیز تھا - یہی عمل تھا ، یہی تسخیر تھی ، یہی کیمیا اور یہی اکسیر تھی - مسیں تو اس کی سترھویں برس بھیگنے لگی تھیں ، اٹھارھویں میں تو اس کی اچھی خاصی داڑھی نکل آئی : شعر

گیا حسن خوبان دل خواہ کا ہمیشہ رہے نام اللہ کا

اور داڑھی بھی نکلی تو اس کثرت سے کہ ماتھا اور ناک اور آنکھوں کی جگہ چھوڑ کر کہیں تل دھرنے کو جگہ باقی نہ رھی - جب داڑھی نکلنے کو ہوئی ، اگر مبتلا اس کو اس کے طور پر نکلنے دیتا تو برس سوا برس وہ اور بھی حسینوں کے زمرے میں گنا جاتا اور سبزۂ خط اس کی گوری رنگت پر خوب کھلتا ، مگر اس نے غلطی یہ کی کہ روئیں نمودار ہوتے ہی استرا پھروا دیا - استرے کا پھروانا تھا کہ پھد پھدا کر ایک کی جگہ دس روئیں اور روؤں کی جگہ کالے کرخت بال نکل پڑے اور چہرے کی جلد پر جو ماءالشباب کا ایک قدرتی روغن تھا وہ بھی گیا گزرا ہوا - اب رو کھی کھال رہ گئی اور اس پر ہزارھا بال - یہ پہلی مصیبت تھی جو مبتلا پر نازل ہوئی اور اس نے اس پہلی کیفیت کے اس قدر جلد زائل ہو جانے کا سخت رنج کیا اور جب اس کے ان دنوں کے خیالات پر نظر کی جاتی ہے تو اس کا رنج حق بجانب بھی تھا - رفتہ رفتہ زوال حسن کا اثر اس کی حالت پر مترتب ہونے لگا - جو لوگ اس کی ملاقات کے مشتاق رہتے تھے ، نفرت ، اور جو درپے تھے گریز کرنے لگے -

یار اغیار ہو گیے اللہ کیا زمانے کا انقلاب ہوا

گرم صحبتوں کی جگہ صاحب سلامت رہ گئی ، وہ بھی دور کی ، اختلاط کے عوض راہ گزر کی مٹ بھیڑ[1] وہ بھی اتفاق - اس کے

۱- یہ لفظ مٹ بھیڑ اور مڈ بھیڑ دونوں طرح رائج ہے -

طرز زیست نے ادعائی ضرورتوں کو اور ادعائی ضرورتوں نے خرچ کو اتنا بڑھا دیا تھا کہ مدرسے کا وظیفہ اور اس کا چہار چند اور اس کو بمشکل وفا کرتا ۔ اب ادھر تو اس کے اعوان و انصار دست کش ہوئے ، اُدھر جو گھر سے مدد ملتی تھی اس میں بی بی نے حصہ بٹوانا شروع کیا ۔ ضرورتیں اگر جائز اور واجبی ہوتیں گھر سے مدد ملتی ، مگر حاجتیں ناجائز ، اغراض بے ہودہ ، گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل ۔ جی للچاتا اور ناچار ضبط کرتا ۔ طبیعت بھر بھراتی اور بامجبوری پتے کو مارتا ۔ انگریزی کی کہاوت ہے کہ مصیبتیں[۲] ایک ایک کر کے نہیں آتیں ، یعنی جب آنے کو ہوتی ہیں تو بس ایک تار بندھ جاتا ہے ۔ مبتلا کے بیاہ کے بعد سے تو گویا اس کہاوت کے سچا کرنے کو موتیں کچھ ایسی تابڑ توڑ ہوئیں کہ پانچ برس کے اندر ہی اندر جتنے بزرگ تھے ، کیا مرد کیا عورت ، ایک کے بعد ایک سبھی تو رخصت ہوئے ۔ بہنیں بیاہی جا کر اپنے اپنے گھروں میں آباد تھیں ۔ بس اب تن تنہا مبتلا رہ گیا اور ایک بی بی کہ وہ بھی اس کی بے التفاتی کی وجہ سے پہلے تو اکثر میکے میں رہتی تھی ، چوتھے پانچویں مہینے مہمان داخل سسرال آ گئی تو آ گئی ۔ اب کوئی برس دن ہوا تھا کہ ماں اور باپ دونوں کے مر جانے سے بھائیوں نے ترکے سے محروم کرنے کے لیے بلانا چلانا مطلقاً موقوف کر دیا تھا اور بمجبوری نہایت کس مپرسی کی حالت میں مبتلا کے یہاں ڈھئی دئے پڑی تھی ۔ مبتلا پر مصیبتوں کا ایسا پہاڑ ٹوٹا تھا کہ اگر وہ ذرا بھی عقل سلیم رکھتا ہوتا تو ساری عمر اس تازیانے کو نہ بھولتا ، مگر اس کے دل پر تو مہر لگی ہوئی تھی اور آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا ۔ کیسی عبرت اور کس کا ڈرنا ، مطلق العنان

۲- Misfortunes never come alone.

ہوتے ہی لگا دلکی دوڑنے ، پویہ[۳] بھاگنے - یہاں تک کہ جن حرکتوں کو پہلے چراتا چھپاتا اب کھلے خزانے ان کے کرنے میں ذرا بھی نہ شرماتا - باپ کے مرتے ہی میدان خالی پا کر تعزیت کے حیلے اور غم گساری کے بہانے سے دوست آشناؤں نے پھر اس کو آ گھیرا اور پھر وہی اپنی قدیم پٹی اس کو پڑھا چلے - چہلم بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ جلسے شروع ہو گیے -

---

۳- دلکی اور پویہ گھوڑے کی چالوں کے لیے اصطلاحی الفاظ ہیں - ان استعاروں میں مطلق‌العنان کی رعایت ملحوظ ہے ، کیونکہ اس میں بھی مستعارمنہ گھوڑا ہے - (مطلق‌العنان کے معنی ہیں وہ گھوڑا جس کی باگ چھوڑ دی گئی ہو - استعارۃً یہ لفظ آزاد کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے-)

چھٹی فصل

مبتلا کے چچا کا حج سے واپس آنا

مبتلا کے حقیقی چچا میر متقی ایک مدت سے نواب رام‌پور کی سرکار مین نوکر تھے اور وہین ایک شریف خاندان میں انھوں نے اپنا نکاح بھی کر لیا تھا ۔ مبتلا ان دنوں مکتب میں پڑھتا تھا کہ میر متقی دلی ہو کر بھائی سے ملتے ہوئے حج کو گئے ۔ ارادہ تو صرف حرمین شریفین کی زیارت کا کر کے گئے تھے ، مگر وہاں پہنچ کر یہ خیال ہوا کہ سالہا سال کے ارادے مین تو اب بمشکل گھر سے نکلنا ہوا ، کیا معلوم اب زندگی میں پھر یہاں آنا نصیب ہو یا نہ ہو ، لاؤ لگے ہاتھوں جہاں تک ہو سکے زیارتیں تو کر لو ۔ پورے تین برس تو زیارتوں مین لگے، پھر تین برس تک متواتر ایسا اتفاق پیش آ آ گیا کہ جب واپسی کا ارادہ کرتے تھے بیمار ہو ہو جاتے تھے ۔ غرض ساتویں برس لوٹے تو بمبئی مین پہنچ کر انھوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ بھوپال مین اُستاد سے ، احمد آباد مین پیر سے اور دھلی میں بھائی سے ملتا ہوا رام پور جاؤں گا ۔ دھلی میں داخل ہوئے تو تھوڑی رات گئی تھی ، سیدھے بھائی کے دروازے پر آ کھڑے ہوئے ۔ کیا دیکھتے ہیں کہ پھاٹک بند اور طبلے کی تھاپ کی آواز اندر سے چلی آ رہی ہے ۔ سمجھے کہ ناچ ہو رہا ہے ۔ تھوڑی دیر میں بڑے زور کے قہقہے سنائی دیے ۔ معلوم ہوا کہ بھانڈ نقایں

کر رہے ہیں ۔ میر متقی کو پہلے ذرا سا دھوکا ہوا کہ میں نے گھر کی شناخت میں تو غلطی نہیں کی ۔ گلی کے نکڑ تک لوٹ کر گیے ، ادھر دیکھا اُدھر نگاہ کی ۔ بے شک سات برس کے عرصے میں تھوڑے بہت تغیرات بھی ہوئے، مگر نہ اس قدر کہ جہاں آدمی پیدا ہوا ، پرورش پائی ، بڑا ہوا ، رہا سہا ، اُس گھر کو نہ پہچانے ۔ پھر خیال ہوا کہ شاید بھائی نے اس گھر کو چھوڑ دیا ہو ۔ اسی سوچ میں کھڑے تھے کہ ایک شخص گلی کی طرف لپکا ہوا چلا آ رہا تھا[1] ، جب ان کے برابر آیا انھوں نے اُس سے پوچھا "کیوں صاحب یہ کون سی گلی ہے ؟" وہ یہ کہتا ہوا اپنی دھن میں چلا گیا کہ "اس کو سادات کا کوچہ کہتے ہیں" اب ان کو اس کا تو یقین کامل ہو گیا کہ گھر کے پہچاننے میں مجھ سے غلطی نہیں ہوئی ۔ اب اتنی بات اور رہ گئی کہ بھائی اُس گھر میں ہیں یا نہیں ۔ اُس شخص کی جلدی نے ان کو اس کے پوچھنے کی مہلت نہ دی ۔ اتنے میں دیکھا کہ ایک بوڑھے سے آدمی بغل میں بچھونا دبائے لکڑی ٹیکتے ہوئے اندر گلی سے آہستہ آہستہ چلے آ رہے ہیں ۔ ان سے تھوڑی دور پیچھے ایک جوان سا آدمی ہے اور وہ ذرا تیز چل رہا ہے ، یہاں تک کہ جب بڑے میاں کے برابر آیا تو کہنے لگا کہ "اے حضرت! خیر ہے ، یہ اس وقت آپ بچھونا لیے ہوئے کہاں جا رہے ہیں ؟ لائیے بچھونا مجھ کو دیجیے ، میں پہنچادوں" بڑے میاں نے کہا "نہیں بھائی تم کیوں تکلیف اٹھاؤ ، بچھونے میں ایسا کیا بوجھ ہے ۔ کیا کریں جب سے بیچارے میر مہذب مرے ، ان کا لڑکا ، خدا اس کو نیک ہدایت دے ، بری صحبت میں پڑ کر ایسا آوارہ ہو رہا ہے

۱- یہاں دو راہگیروں کے کردار کی ایک ایک جھلک قابل دید ہے۔

کہ سارے سارے دن اور ساری ساری رات گھر مین دھما چوکڑی مچی رھتی ھے - ھم ٹھہرے دیوار بیچ ان کے پڑوسی ، اتنا نہیں بن پڑتا کہ گھر مین دو رکعت نماز اطمینان سے پڑھی جائے - ناچار میں تو اس مسجد میں چلا جاتا ہوں - متقی ، بھائی کے مرنے کی خبر سن کر قریب تھا کہ چکر کھا کر وھین زمین پر گر پڑے ، مگر آدمی تھا دین دار اس نے انا للہ و انا الیہ راجعون[۲] کہہ کر ضبط کیا اور اپنے تئیں سنبھالا اور سوچا کہ اگر گھر چل کر دستک دوں پکاروں تو نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنے گا اور فرض کیا چیخنے چلانے سے دروازہ کھلا بھی تو رات گئی ھے زیادہ ، سب کو تکلیف ھوگی ؛ رونا پیٹنا مچے گا ، ماتم برپا ھوگا - بہتر ھے کہ رات کو کہیں پڑ رھوں - پھر خیال کیا کہ پاس کے پاس اسی مسجد میں ٹھہر جانا مناسب ھے کہ بڑے میاں سے اور حالات بھی دریافت ھوں گے - مسجد میں گیا اور وضو کر کے نماز پڑھی، دعا کے لیے ھاتھ اٹھائے - بھائی سے اس کو محبت تھی بہت ، یوں بھی ھمیشہ غایبانہ اس کے حق میں دعاے خیر کیا کرتا تھا ؛ اب جو حضرت موسیٰ کی دعا اس کو یاد آئی اور اس کے منہ سے نکلا :
" رب اغفرلی ولاخی و ادخلنا فی رحمتک وانت ارحم الراحمین[۳] "
جی بھر آیا اور بے اختیار اتنا رویا کہ ھچکی بندھ گئی - جس کے دل کو یکایک اتنا بڑا صدمہ پہنچا ھو اس کو بھوک کیا لگے اور نیند کیوں کر آے ؛ ساری رات گزر گئی کہ صحن مسجد میں ننگے سر بیٹھا ھوا کبھی کچھ پڑھ پڑھ کر بھائی کی روح کو

---

۲ - ھم اللہ ھی کے ھیں اور اسی کے پاس لوٹ کر جائیں گے *-
۳ - پروردگار مجھ کو اور میرے بھائی کو بخش اور ھم کو اپنی رحمت میں داخل کر اور تو سب سے بڑا رحم کرنے والا ھے * -

بخشتا تھا اور کبھی اس کی مغفرت کے لیے خدا کی درگاہ میں زار نالی کرتا تھا ۔ سفیدۂ صبح نمودار ہوتے ھی اول وقت فجر کی نماز پڑھی اور پھر اشراق تک معمولی اوراد میں مشغول رھا ۔ جب نافلۂ اشراق[۴] سے فارغ ھوا تو دیکھا کہ بڑے میاں بھی اپنا بچھونا لپیٹ لپاٹ کر گھر جانے کی تیاری کر رھے ھیں ۔ ان کو ضعیفی کے سبب ذرا دھندلا بھی نظر آتا تھا ۔ متقی نے ان کو پہچان کر السلام علیک کی اور قریب جا کر اپنے تئیں پہچنوایا اور رات کا ماجرا کہہ سنایا ۔ ملے تو میر مہذب کی صحبتوں کو یاد کر کے بڑے میاں بھی آب دیدہ ھوئے اور متقی تو رات سے رو رھا تھا ۔ سفر کا تکان ، ساری رات کا فاقہ ، جاگنا اور رونا ، آنکھیں سوج گئی تھیں ، منہ سے آواز نہیں نکلتی تھی ۔ بارے بڑے میاں نے بہت کچھ سمجھایا ۔ دنیا کے دستور کے مطابق صبر کی تعلیم کی اور کہا کہ ''میاں! مرحوم تو اللہ کے نیک بندے تھے، یہاں بھی اپنی اچھی گزار گیے اور ان شاء اللہ وھاں بھی ان کے لیے اچھا ھی اچھا ھے ۔ وہ اگر مرے تو اپنی عمر سے مرے اور ایک نہ ایک دن سبھی کو مرنا ھے ، بڑا رونا اُن کے فرزند ناخلف کا ھے کہ اپنے کردار ناسزا سے مرحوم کی روح کو ایذا دے رھا ھے ۔ اب تم باپ کی جگہ ھو، اس کو سنبھالو اگر ھو سکے، اُس کو رو کو اگر بن پڑے ۔ گھر کے نصیب اچھے ھیں کہ تم آ پہنچے، خدا کو کچھ بھلا کرنا منظور ھے کہ تم کو بھیجا۔ ابھی وقت ھے اگرچہ تنگ ھے، موقع ھے گو اخیر ھے ، اور تم یہاں مسجد میں اکیلے بیٹھ کر کیا کرو گے ، میرے ساتھ چلو ، تمھارے بھتیجے صاحب تو کہیں دوپہر تک اٹھیں گے، وہ بھی اٹھائے سے ۔ تب تک میرے گھر کچھ ناشتا کرو ، ھم بھی کوئی

---

۴ - طلوع آفتاب کے بعد کی نماز نفل* ۔

غیر نہیں ہیں ۔ تمھارے بھائی صاحب، خدا ان کو جنت نصیب کرے! ہم کو عزیزوں سے بڑھ کر سمجھتے تھے۔ کیا تم کو یاد نہ ہو گا ۔'' غرض میر متقی بڑے میاں کے ساتھ ساتھ چلے تو سارے رستے بھائی کا تصور پیش نظر تھا اور قدم قدم پر ایسا خیال ہوتا تھا کہ بھائی سامنے سے چلے آرہے ہیں ، پیچھے سے پکار رہے ہیں ، اس دروازے پر کھڑے باتیں کر رہے ، اس دکان والے سے کچھ کہہ رہے ہیں ، کیوں کہ یہ اتفاقات متقی کو بھائی کی زندگی میں صد ہا بار پیش آچکے تھے، ان ہی باتوں کی یادداشت اب تازہ ہوگئی ۔ متقی رات سے بہتیرا رو بھی چکا تھا اور اس نے ارادہ کرلیا تھا کہ اب اگر رونا آئے گا بھی تو ضبط کروں گا ، مگر جوں جوں گھر کی طرف پاؤں اٹھتا تھا، دل کی کیفیت متغیر ہوتی چلی جاتی تھی ، یہاں تک کہ دروازے پر پہنچ کر تو نہ تھم سکا اور بے اختیار پکار کر رویا ۔ رونے کی آواز سن کر پاس پڑوس کے لوگ جمع ہوگیے ۔ پھاٹک تو باہر کی طرف سے نہ کھلواسکے ، اندر ہی اندر کھڑکی کی راہ پہلے زنان خانے میں اور پھر مردانے میں خبر پہنچی۔ مبتلا اور اس کے جلسے کے شرکاء ابھی تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ کہروا[۵] دیکھ اور بھیرویں[۶] سن کر سوئے تھے ۔ میر متقی کا آنا سن کر سب کی نیندیں اچاٹ ہوگئیں اور سب کے ہوش اڑ گیے۔ جو لوگ اب سے ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے بھانڈوں اور رنڈیوں کو نچوا رہے تھے ، اب لگے آپ ناچے ناچے پڑے پھرنے ۔ چاہتے تھے کہ نکل بھاگیں ، مگر راستہ کہاں تھا ؛ پھاٹک پر تو خود میر متقی صاحب اور ان کے

---

۵ - کہاروں کی طرح کا ناچ جو بازاری عورتیں مردانی ٹوپی اوڑھ کر ناچتی ہیں* ۔

۶ - صبح کا راگ * ۔

ساتھ محلے کے چالیس پچاس آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ زنان خانے میں ہو کر جانا چاہتے تو پہلے مہرے پر گھر والی تھی کہ وہ میاں کے سامنے تو لومڑی یا بھیگی بلی جو کچھ تھی سو تھی، مگر ان بد ذاتوں کے حق میں، خاص کر اس وقت شیرنی سے کم نہ تھی۔ اس کے علاوہ زنان خانے سے اگر باہر جانے کا راستہ تھا تو دوسرے لوگوں کے گھروں میں سے ہو کر تھا۔ وہ بھلے مانس ان بلاؤں کا اپنے یہاں سے گزرنا کیوں جائز رکھتے۔ غرض وہ سب کا سٹ پٹانا اور ایک کا ایک سے پوچھنا اور ایک ایک کے سامنے ہاتھ جوڑنا، ایک ایک کے پاؤں پڑنا؛ ایک تماشا تھا قابل سیر، ایک کیفیت تھی لائق دید کہ رنڈیاں جو اپنے حسن کے غرور میں کسی کے ساتھ سیدھی بات تک نہ کرتی تھیں، اب ایک ایک کے آگے بچھی جاتی تھیں کہ خدا کے لیے کہیں ہم کو پناہ دو۔ ایک ایک کے پیچھے لپٹتی تھیں کہ للہ ہمیں نکال کہیں لے چلو۔ ایک پکارتی تھی "میں انعام اکرام سے باز آئی مجھے راستہ بتاؤ" دوسری چلاتی تھی "مجھے مجرے کی کوڑی مت دو، مگر کسی ڈھب سے گھر پہنچاؤ" رات کے جلسے میں ایک طائفہ چلبلا بھانڈ کا بھی تھا۔ ان کمبختوں کو فی الوقت خوب سوجھتی ہے۔ ادھر تو یہ تمام ہل چل مچی ہوئی تھی اور ادھر چلبلا بے طلب، بے فرمائش تیار ہوا: اپنے ساتھیوں کو جمع کر لگا نقل کرنے۔ (نقل) ادھر سے آدھر اور آدھر سے ادھر دوڑا دوڑا لوگوں کو ہٹاتا ہؤا دباتا ہؤا پھرنے لگا کہ" کیا ہے بے؟ کاہے کا غل ہے؟ کیوں شور مچا رکھا ہے؟

۷۔ اس زمانے کے بھانڈ نقالی کے فن میں اتنے ماہر ہوتے تھے کہ موقع و محل کے اعتبار سے برجستہ نقلیں گھڑ لینا ان کے لیے کوئی بڑی بات نہ تھی۔ یہاں مصنف کے حقیقت نگار قلم نے ان کی مضحک ادا کاری، پھبتی بازی اور حاضر جوابی کا بہترین مرقع پیش کیا ہے۔

دوسرا بولا '' ابے احمق ! تو نے نہیں سنا کہ حضرت کے چچا مکہ معظمہ سے تشریف لائے ہیں۔'' پہلا کون چچا ، ابو جہل یا ابو لہب؟'' دوسرا (پہلے کے منہ پر زور سے ایک طمانچہ مار کر) '' چپ مردود! کیا کفر بکتا ہے۔ ابے حضرت پیغمبر صاحب کے چچا نہیں، ہمارے (مبتلا کی طرف اشارہ کر کے) حضرت پیر و مرشد کے چچا۔'' پہلا '' ہاں! الحمدللہ ، پھر ڈرنا کیا ہے؟ آؤ ہم سب مل کر بھی ان کو چچا بنائیں ! حج نصیب ہونے اور سلامتی سے واپس آنے کی مبارک باددیں؛ ناچ دکھائیں، گانا سنائیں'' دوسرا (پہلے کے منہ پر طمانچہ مار کر) '' ابے توبہ کر توبہ ، کہیں اوپر سے چھت نہ گر پڑے! سید، آل رسول، مولوی ، حاجی جو ابھی خدا کے گھر سے پھرے ہوئے چلے آرہے ہیں ، کہیں ناچ دیکھتے ہیں (ناچ دیکھنا حرام) یا گانا سنتے ہیں؟ (گانا سننا ممنوع) ان کے نزدیک رنڈیاں جہنم کی چھپٹیاں ہیں اور بھانڈ دوزخ کے کندے۔'' پہلا '' ہائے میرے اللہ! رنڈیوں نے وہاں بھی بھانڈوں کو نہ چھوڑا ۔ نرے کندے ہوتے تو ذرا دیر میں تو جلتے، اور کیوں صاحب یہ سب لوگ (مبتلا اور اس کے ساتھیوں کی طرف اشارہ کر کے) کیا ہوں گے؟'' دوسرا '' ان کو کہتے ہیں کہ بھاڑ میں بھونے اور کڑھائی میں تلے اور بھٹی میں جلائے جائیں گے '' پہلا (دونوں ہاتھوں کو کلوں پر ہولے ہولے تھپڑ مار کر اور خوف زدہ آنکھیں بنا کر) ''الٰہی توبہ ، الٰہی توبہ ! خدا دوزخ کی آنچ سے بچائے اور بھانڈوں کو بھوت بنائے آسیب بنائے ، جو چاہے سو کرے، مگر دوزخ کے کندے نہ بنائے ! بھلا پھر یہ حاجی صاحب چاہتے کیا ہیں ؟'' دوسرا '' چاہتے یہ ہیں کہ نمازیں پڑھو، روزے رکھو، خدا کی بندگی کرو۔ جو روپیہ رنڈیوں اور بھانڈوں کو دیتے ہو غریبوں ، محتاجوں کو دو۔'' پہلا '' بھئی بات تو واجبی

ھے ۔ رنڈیوں کا دینا تو محض فضول ھے ؛ رھے بھانڈ ، ان سے بڑھ کر غریب محتاج اور کون ھو گا ۔'' یہ کہہ کر عمامہ باندھ، پائچے ٹخنوں سے اونچے کر، جہاں کھڑا تھا اللہ اکبر کہہ کر ھاتھ باندھ اور منھ ھی منھ میں کچھ بڑبڑانے لگا ، گویا امام بنا اور نماز شروع ھوئی ۔ مسخرہ پن تو یہ تھا کہ نیت باندھ چکا ھے اور پھر ایک طرف یہ کہہ رھا ھے کہ ''بس، بے تامل پھاٹک کھول دو اور مولوی یا حافظ یا حاجی یا زواریا واعظ جو ھوں ان کو آنے دو '' اور دوسری طرف کو اشارہ کررھا ھے کہ میرے پیچھے مقتدی بن کر کھڑے ھوجاؤ اور پھر بڑبڑانے لگا ۔ طائفے کے جتنے بھانڈ تھے سب صف بستہ ھو کر متقدی بنے اور اس کے پیچھے کھڑے ھوئے ۔ ذرا دیر گزری تھی کہ ایک نے صف میں سے نکل کر امام کی پیٹھ پر ایک دو ھتڑ مارا ، ایسے زور سے کہ تھوڑی دور آگے جا کر اوندھے منھ گر پڑا اور کہا '' ابے بدعتی ، یہ کیسی بے وقت اور بے رخی جماعت کی نماز پڑھ رھا ھے ؟ اگر مولوی[۸] اسمعیل کے مقلد سن پائیں تو مارے کفر کے فتووں کے آتو کر دیں ۔'' امام '' ابے تو کیا جانے ، یہ صلوۃ الخوف[۹] ھے '' اور پھر اسی طرح اپنی جگہ جا کھڑا ھوا ؛ گویا اتنی حرکت پر بھی نماز باطل نہیں ھوئی ۔ تھوڑی سی دیر کے بعد پیچھے کی صف سے پھر ایک شخص آگے بڑھا اور اس نے امام کا عمامہ اتار

---

۸ ۔ یعنی حضرت شاہ اسماعیل شہید جو گزشتہ صدی کی مشہور تحریک جہاد اور تحریک اصلاح رسوم کے قاید تھے ۔ ۱۸۲۱ء میں اپنے پیر و مرشد حضرت سید احمد شاہ دھلوی کے ساتھ بالا کوٹ کے مقام پر سکھوں سے لڑتے ھوئے شہید ھوئے ۔ شاہ صاحب موصوف ، جماعت اھل حدیث حضرات کو جو غیر مقلد ھونے کے مدعی ھیں ، طنزاً ''مولوی اسماعیل کے مقلد'' کہا گیا ھے ۔

۹ ۔ خوف کے عالم کی نماز جیسے لڑائی کے میدان میں * ۔

تڑاتڑ آٹھ دس بیس لتیڑے رسید کیے ۔ امام سر سہلاتا ہؤا یہ کہتا ہوا بھاگا کہ کفر کا فتویٰ آیا ؛ تو یہ لتیڑے مارنے والا کیا کہتا ہے '' ابے ڈر مت! فتویٰ نہیں تیری عبادت کا صلہ ہے ۔'' امام بولا '' عبادت کا صلہ ہے تو اس میں مقتدیوں کا بھی حق ہے ۔'' پھر تو اس سرے سے اُس سرے تک بلا امتیاز جوتی کاری ہونے لگی اور رنڈیاں اور بھڑوے اور میر محفل اور تماشائی ، سبھی پر آفت آئی ۔ کہتے ہیں کہ چلبلا بھانڈ کے طائفے کا بیس روپے روز معمول تھا اور مبتلا اس طائفے کا ایسا گرویدہ تھا کہ اگر خرچ مساعدت کرتا تو ہر رات اُن کا ناچ دیکھتا ، مگر اس پر بھی کئی سو روپے ان لوگوں کے چڑھ گیے تھے ۔ اب مبتلا کے چچا کا آنا سن کر بھانڈوں کو بالکل نا امیدی ہو گیی اور ایسی نقل کی ۔ نقل تو نہایت برجستہ تھی ، مگر طبیعت کس کی حاضر تھی اور دل کس کا ٹھکانے تھا کہ مزہ لیتا اور داد دیتا ۔ مبتلا کی تو ایسی سٹی بھولی کہ ننگے پاؤں کبھی اندر جاتا اور کبھی باہر آتا ، مگر کوئی تدبیر بن نہیں پڑتی تھی ۔ آخر اُس نے اپنے باپ کے پرانے نوکر وفادار کو آواز دی ۔ یہ بوڑھا آدمی ، اسم بامسمیٰ ، مبتلا کو بہت سمجھاتا رہتا تھا ، مگر نوکر کی بساط کیا ؛ جب وفادار نے بار بار کہنا شروع کیا ، مبتلا نے اس کو جھڑک جھڑک دیا ۔ وفادار نے دل شکستہ ہو کر مبتلا سے کنارہ کشی اختیار کی ۔ مردانے میں اس کے رہنے کی ایک کوٹھری تھی ، رات دن اسی کوٹھری میں پڑا رہتا ۔ اندر سے کچھ فرمایش آتی تو اس کی تعمیل کر دیتا ۔ مبتلا کے کسی کام کاج کو ہرگز ہاتھ نہ لگاتا ۔ آدمی تھا زمانہ دیدہ ، سمجھ چکا تھا کہ یہ لیل و نہار اس طرح پر تو سدا چلنے والا نہیں ۔ یا تو یہ رسم وراہ نہیں اور رسم وراہ یہ ہے

تو بندۂ درگاہ[۱۰] نہیں ۔ وفادار اکیلا کوٹھری میں بیٹھا ہوا دیکھتا نہیں تھا تو سنتا سب کی تھا ۔ اس کو میر متقی کا آنا اور ارباب جلسہ کا گھبرانا معلوم ہو چکا تھا ۔ خلاف عادت مبتلا کے بلانے کی آواز سن کر مطلب تو سمجھا ، مگر جان بوجھ کر چادر تان لیٹ گیا ۔ مبتلا نے ایک بار پکارا ، دوبار پکارا ، تین بار پکارا ، جواب ندارد ۔ اگر کبھی پہلے ایسا اتفاق ہوا ہوتا تو وفادار کی مجال تھی کہ مبتلا پکارے اور پہلی آواز پر جواب نہ دے ، مگر میر متقی کا آنا تھا کہ باہر سے اندر تک سب کا رنگ بدل گیا ۔ جو ناچیز تھے وہ اب عزیز تھے جو با اقتدار تھے وہ اب ذلیل و خوار تھے ۔ یہاں تک کہ مبتلا نے خود کوٹھری کے دروازے پر آ کر پکارا ''میاں وفادار ، میاں وفادار! جلدی اٹھو چچا آئے '' وفادار نے گھبرا کر پوچھا ''کیا چھوٹے میاں حج سے تشریف لائے ؟'' مبتلا ''ہاں'' وفادار نے میر صاحب مرحوم کو یاد کر کے ایک آہ کی اور آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور میر متقی کے صحیح و سلامت واپس آنے پر خدا کا شکر کیا اور دروازہ کھولنے کے ارادے سے دوڑا ۔ مبتلا نے لپک کر روکا کہ ''ذرا ٹھہرو ، ذرا ٹھہرو ۔'' مبتلا نے چچا کو دیکھا تو تھا ، مگر سات برس میں صورت بھول گیا تھا ۔ وفادار سے کہا کہ ''ذرا کواڑوں کی دڑاڑ میں سے جھانک کر تو دیکھو وہی ہیں ۔'' وفادار نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا اور کہا کہ ''بے شک وہی ہیں اور اب تو عین مین[۱۱] سرکار معلوم

۱۰- اپنے لیے از رہ انکسار بندہ یا خاکسار کی طرح بندۂ درگاہ (آپ کے آستانے کا غلام) بھی کہتے ہیں- یہاں رسم و راہ کے قافیے کی رعایت بھی ملحوظ ہے ۔

۱۱ - سرکار سے مراد مبتلا کے والد میر مہذب مرحوم ہیں جو میر متقی کے حقیقی بڑے بھائی تھے * ۔

ہوے ہیں ، مگر داڑھی میں تو وتی[۱۲] سفیدی نہیں ۔" مبتلا یہ سن کر وفادار کے گلے سے لپٹ گیا اور کہا کہ "خدا کے لیے کسی طرح مجھ کو اس فضیحت سے بچاؤ ۔ میں ان کمبختوں کو کہاں لے جاؤں اور کس طرح چھپاؤں ؟" وفادار کو مبتلا کا اضطرار دیکھ کر بہت ترس آیا اور اس نے کہا کہ "تھوڑی دیر کے لیے ان لوگوں کو پاخانے میں کھڑا کر دیجیے ۔ چھوٹے میاں آخر اندر جائیں گے اس وقت ان کو نکال باہر کریں گے ۔" واقع میں اس کے سوا کوئی تدبیر ہی نہ تھی ۔ آخر یہی کیا کہ جھپا جھپ ان سب کو پاخانے میں اوپر تلے ٹھونس ، آگے پیچھے دھکیل ، کنڈی لگا ، باہر کا پھاٹک کھول دیا ۔ میر متقی نے دوڑ کر بھتیجے کو چھاتی سے لگایا ۔ اس وقت کی کیفیت بھی جس جس نے دیکھی ساری عمر اس کو نہیں بھول سکتا ۔ بوڑھا (پھونس نہیں ، مگر ادھیڑ) اور جوان ، فرشتہ اور شیطان ، یا رحمت اور قہر ، یا نیکی اور بدی ، یا ثقہ اور رند ، یا حاجی اور پاجی ، یا چچا اور بھتیجا ، دونوں ایک دوسرے کے گلے لگے ہوے کھڑے رو رہے تھے ۔ مبتلا تو ڈاڑھیں مار رہا تھا اور میر متقی کی آنکھوں سے برابر آنسو جاری تھے اور چونکہ رنج کو بہ تکلف ضبط کرتے تھے ، بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی ۔ پچاس ساٹھ آدمی حلقہ باندھے ہوے گردوپیش تھے اور سب پر وقت طاری تھی ۔ کامل پاؤ گھنٹے کے بعد متقی نے مبتلا کو سینے سے جدا کیا اور سب کے ساتھ اس کو لے جا کر دالان میں بیٹھے ۔ تھوڑی دیر سب سکوت میں تھے ، آخر کسی نے میرصاحب مرحوم کا ذکر خیر نکالا ۔ پہلے ان کے محامد اخلاق کا مذکور رہا ، پھر علالت اور وفات کا ؛ آخر فاتحہ پڑھ کر لوگ رخصت ہوے ، میر متقی زنان خانے میں گیے ۔

---

۱۲ ۔ 'اتنی' کو اہل دہلی 'وتنی' اور عوام 'وتی' بولتے ہیں ' لیکن ایسا لکھنا جائز نہیں ۔

ساتویں فصل

مبتلا کے چچا میر متقی کا اپنی بھانجی، یعنی مبتلا کی بی‌بی کے سامنے تعزیت کے طور پر وعظ کہنا

ماموں کا آنا سن کر بھانجی کو ماں باپ اور ساس سسرے کا مرنا ، بھائیوں کا ظلم اور سب سے بڑھ کر مبتلا کا اس سے بے تعلق رہنا ، اپنی بے کسی ، گھر کی تباہی ، آیندہ کی ناامیدی ، غرض ساری داستان مصیبت اول سے آخر تک یاد آ گئی ۔ وہ دل ہی دل میں رونے کی تیاریاں کر چکی تھی ، جوں[1] ماموں نے اندر قدم رکھا اور بھانجی کے ساتھ نظر دوچار ہوئی ، اس نے کسی طرح لڑکھڑاتے ہوئے کھڑے ہو کر سلام تو کر لیا اور پھر تو ایسی بلکی کہ غش کھا کر گر پڑی ۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گیے ، دانت بچی ہو گیے ؛ لخلخے سنگھائے ، منہ پر گلاب کے چھینٹے دیے ۔ بارے ہوش آیا تو اس نے ایسے بین شروع کیے کہ سننے والوں کے کلیجے منہ کو آنے لگے ، دل دھل گیے ۔ آخر متقی نے سر پر ہاتھ پھیرا اور سمجھایا کہ مصیبت میں اس قدر رنج کرنا عبودیت کی شان نہیں ہے ۔ رنج مصیبت کو نہ ٹال سکتا ہے اور نہ اس کو ہلکا کر سکتا ، بلکہ الٹا مصیبت کو بڑھاتا ہے

۱۔ عام محاورے میں 'جوں ہی' آتا ہے اور یہ زیادہ فصیح ہے۔

جیسی محبت ماں کو اکلوتے بیٹے کے ساتھ ہوتی ہے اس سے لاکھوں کروڑوں درجے بڑھی ہوئی محبت خدا کو اپنے تمام بندوں کے ساتھ ہے۔ اگر خدا نہ چاہے تو کیا بندے آپ سے آپ پیدا ہو جائیں اور اپنے اختیار سے زندگی کریں؟ ایسا خیال کرنا تو کفر کے علاوہ غلط صریح بھی ہے۔ بندے بھلے اور برے، امیر اور غریب، قوی اور ضعیف، حاکم اور محکوم، بادشاہ اور رعیت، یہاں تک کہ ولی اور پیغمبر، سب کے سب اس قدر عاجز اور بے اختیار ہیں کہ بدون خدا کی مرضی کے ایک پتا ہلانا چاہیں تو نہیں ہلا سکتے۔ ایک ذرے کو جگہ سے سرکانا چاہیں تو نہیں سرکا سکتے، کسی انسان کا نفع و ضرر نہ خود اس کے اختیار میں ہے نہ کسی دوسرے انسان کے۔ دنیا میں جس کسی کو جس کسی کے ساتھ کسی طرح کی محبت ہے، اس کے یہی معنے ہو سکتے ہیں کہ جس کے ساتھ محبت رکھتا ہے اس کا فائدہ چاہتا ہے، نہ یہ کہ اس کو فائدہ پہنچاتا ہے یا پہنچا سکتا ہے۔ اس واسطے دنیا کی ساری محبتیں از برائے[۲] نام ہیں؛ سچی اور اصلی محبت خدا کی ہے کہ ساری نعمتیں اور ساری برکتیں جو ہم کو حاصل ہیں، یہاں تک کہ زندگی اسی کی دی ہوئی ہے۔ بایں ہمہ انسان کو اس زندگی میں ایذائیں بھی پہنچتی ہیں، مگر ان میں ضرور انسان کا کوئی نہ کوئی فائدہ مضمر ہوتا ہے؛ مثلاً طبیب کہ وہ کسی مریض کا علاج کرتا ہے؛ کبھی اس کو کڑوی دوا پلاتا ہے اور کبھی اس کی فصد لیتا اور کبھی بیمار کے زخم کو شگاف دیتا اور کبھی شاید اس کے عضو کو کاٹ بھی ڈالتا ہے، مگر ایسا کرنے سے کیا کوئی شبہ کر سکتا ہے کہ طبیب اپنے بیمار کے ساتھ عداوت رکھتا

۲- 'برائے خدا' یا 'برائے نام' کی جگہ از برائے خدا یا از برائے نام کہنا غلط ہے۔ مصنف نے یہاں محاورۂ عوام کی پیروی کی ہے۔

ہے ۔ اسی طرح جو تکلیفیں ہم کو دنیا میں پہنچتی ہیں ـــ اور بلا شبہ خدا کی مقدس مرضی سے پہنچتی ہیں ـــ ظاہر میں تکلیف ہیں اور باطن میں آرام ، ابتدا میں ایذائیں اور انجام میں راحت ۔ اول تو اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ تکلیف حقیقت میں بھی تکلیف ہے یا نہیں ۔ فرض کرو کہ کسی عورت کا شوہر مر جائے ؛ ظاہر میں بیوگی ایک بڑی مصیبت ہے ، مگر کیا یہ ممکن نہیں کہ مرد زندہ رہتا اور بیوی پر سوکن لا کر اس کو زندہ درگور کرتا ، یا بیوی سے اس کا دل ایسا پھرتا کہ جب تک جیتا اس کو سخت ایذا دیتا ، یا ایسے امراض میں مبتلا ہوتا کہ سارے گھر کی زندگی دشوار کر دیتا اور اسی طرح کے اور بہت سے احتمالات ہیں جن کی وجہ سے ایک عورت اپنی بیوگی کو ترجیح دے سکتی ہے سہاگ پر ؛ بس جب تک انسان کو علم مستقبلات ، یعنی علم غیب نہ ہو ؛ اور وہ اس کو نہ ہوا ہے اور نہ ہوگا ، وہ کسی حالت کو جو اس پر یا کسی پر طاری ہو برا کہہ نہیں سکتا ۔ دنیا کے بہت سے واقعات کو ہم پسند کرتے ہیں ، مگر جس طرح ہماری معلومات نا تمام ہیں ، اسی طرح جو نتیجے ہم اپنی معلومات سے نکالتے ہیں ناقص ۔ ادھوری روداد[۳] اور اس پر فیصلہ ، ناکافی تحقیقات اور اس پر تجویز ، اور مانا کہ جو تکلیف ہم کو پہنچی حقیقت میں تکلیف ہے ، تو کیا شفیق باپ اپنے پیارے بیٹے کو ، منصف اور رحم دل بادشاہ اپنی عزیز رعیت کو ، تادیب یا تنبیہ یا اصلاح یا کسی دوسری مصلحت سے ایذا نہیں پہنچاتا ؟ ہمیشہ ایسی ایذائیں پہنچتی رہتی ہیں ؛ نہ فریاد نہ شکایت ۔ پس اگر خدا کی طرف سے ایک ایذا پہنچ جائے (جانے

۳۔ روداد، فیصلہ، تحقیقات ، تجویز ـــ یہ سب الفاظ عدالتی اصطلاحوں کے طور پر استعمال ہوئے ہیں ۔

دو اُس کے بے شمار احسانوں کو اور بھول جاؤ اس کی نا محصور نعمتوں کو) تو بندہ کیوں منہ پھلائے، کس لیے بڑبڑائے؟ سب سے بڑا فائدہ جو مصیبت سے انسان کو پہنچتا ہے، یہ ہے کہ مصیبت دل میں بالتخصیص عجز و انکسار کی صفت پیدا کرتی اور خدا کو یاد دلاتی ہے، اور حقیقت میں مصیبت کے وقت بندہ خدا کی طرف رجوع کرتا ہے، تو وہ مصیبت نہیں رحمت ہے، لیکن خدا کو یاد کرنے اور اس کی طرف رجوع کرنے کے یہ معنے نہیں ہیں کہ شکایت کرو اور اس سے ناراض رہو، بلکہ اس کے یہ معنے ہیں کہ اس کی رحمت پر پورا بھروسا اور اعتماد کر کے صمیم قلب سے یقین کر لو کہ جو کچھ ہوا خوب ہوا، مناسب ہوا اور یوں ہی ہونا چاہیے تھا۔ یہ تو درجہ رضا اور تسلیم کا ہے اور اسی کا نام صبر جمیل ہے اور آدمی کو جس کا عقیدہ ضعیف اور دل کمزور اور جس کی ہمت کوتاہ اور جس کا ارادہ متزلزل ہے، اس درجے پر پہنچنا دشوار ہے، مگر اعلیٰ علیین پر نہیں پہنچ سکتے تو ایک سیڑھی دو سیڑھی جتنا ہو سکے کچھ تو اچکو، کسی قدر تو ابھرو، کہ اسفل‌السافلین کفران سے نکلو۔ یوں کہنے کو تو زبان سے سبھی کہتے ہیں کہ دنیا فانی ہے، چند روزہ ہے، خواب ہے، سراب ہے، سایہ ہے، سحاب ہے، برق بے تاب ہے، مگر مصیبت کے وقت بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے کہ زبان[۴] ہمارے دل کا سچا ترجمان نہیں۔ کیا کوئی فانی ایک فانی حالت کے لیے اتنا غل مچاتا اور اس قدر روتا پیٹتا ہے؟ مصیبت پر جو منفعت ہم نے ہمیشہ مترتب ہوتے دیکھی وہ تو یہ ہے کہ مصیبت آدمی کے مستقبل کو اس کی ماضی سے ضرور بہتر

۴- زبان کی تانیث پر اساتذۂ دہلی بھی متفق ہیں؛ تعجب ہے کہ مصنف نے اسے مذکر کیوں لکھا۔

کر دیتی ہے ، یعنے اگر انسان کاہل تھا تو مصیبت کے بعد ضرور چست و چالاک ہو جاتا ہے ، آرام طلب تھا تو جفاکش ، بھولا تھا تو سیانا ، مسرف تھا تو کفایت شعار ، بد پرہیز تھا تو محتاط ، جلد باز تھا تو دھیما ، آوارہ تھا تو نیک کردار ۔ جس آدمی پر کبھی مصیبت نہیں پڑی نہ اُس کی عقل کا ٹھکانا ، نہ اس کی رائے کا بھروسا ، نہ اس کا دین درست ، نہ اس کے اخلاق شائستہ ۔ اسا کے علاوہ آدمی کا دستور ہے کہ ایک حالت کیسی ہی عمدہ کیوں نہ ہو ، اگر ساری عمر یکسانی کے ساتھ چلی جائے تو اس حالت کی عمدگی کا احساس نہیں رہتا ، بلکہ اکتا کر خود اس حالت سے نفرت کرنے لگتا ہے ۔ ایک باورچی کو میں جانتا ہوں جو نمکین اور میٹھے چاول ، یعنے بریانی متنجن وغیرہ پکانے میں کامل استاد تھا ۔ شہر میں کہیں نہ کہیں شادی یا غمی کی کوئی نہ کوئی تقریب لگی ہی رہتی تھی ؛ جس کے یہاں چاولوں کی پخت ہوتی اسی باورچی سے پکواتا اور اس کو مزدوری کے علاوہ دستور کے مطابق تہ دیگی کی چوٹی دار رکابی بھی ملتی ۔ وہ ایک رکابی ایسی ہوتی تھی کہ اس کا سارا گھر اس کو کھا کر اٹل ہوجاتا ۔ پس ان لوگوں کو دونوں وقت عمدہ سے عمدہ بریانی اور بہتر سے بہتر متنجن کھانے کو ملتا تھا ۔ پس یہ ایک حالت تھی کہ اگر کسی غریب آدمی کے سامنے جو بریانی متنجن کو ترستا ہو، بیان کیجیے تو سنتے کے ساتھ ہی رال ٹپک پڑے ، مگر اس باورچی اور اس کے اہل و عیال کا کیا حال تھا کہ منتیں کر کے بریانی متنجن کی رکابیاں ہمسائے کے لوگوں کو دیتے اور ان سے روٹی چٹنی مانگ کر کھاتے ۔ پس ہم نے تندرستی کی قدر بیماری سے جانی ، وطن کی پردیس سے ، تونگری کی مفلسی سے ، آرام کی دکھ سے ، راحت کی مصیبت سے ۔ تو جو شخص حقیقی راحت کا خواہاں ہے ،

ضرور ہے کہ مصیبت کا بھی مزا چکھے ۔ مصیبت زدہ کے لیے سب سے بہتر تدبیر یہ ہے کہ وہ دوسرے مصیبت مندوں پر نظر کرے ؛ مثلاً اگر اس کو صرف بیوگی کی شکایت ہے تو پائے گی کہ اس جیسی اور اس سے بدتر لاکھوں بیوہ عورتیں اور بھی ہیں ۔ شاید یہ ایک مدت خانہ داری کرنے کے بعد بیوہ ہوئی ہے اور ہزارہا اللہ کی بندیاں ایسی بھی ہیں ، جنھوں نے شوہر کی صورت تک نہیں دیکھی ۔ پس وہ بیوگی کے علاوہ لاولد بھی ہیں اور شاید ان کو روٹی کا بھی کہیں سے آسرا نہ ہو ۔ پس بیوہ اور لاولد کے علاوہ محتاج بھی ، نگھری ندری بھی اور شاید دکھیا ، بیمار اور شاید اندھی اور لولی اور اپاہج بھی ۔ کسی کو اگر کھجلی کی ایذا ہے تو وہ دیکھے گا اپنے ہی جیسے آدمی کوڑھی اور کوڑھ میں کیڑے اور کیڑوں کے ساتھ زخم اور زخموں میں سوزش ، العیاذباللہ[۵] ۔ جس کی آنکھ میں ناخنہ ہے کیا اس کو اس سے تسلی نہیں ہوگی کہ دوسروں کی آنکھ میں ٹینٹ یا دوسرے کانڑے ، بلکہ اندھے بھی ہیں ۔ غرض دنیا کا حال یہی ہے کہ ایک سے ایک بہتر ہے ، پس کیوں کوئی مغرور ہو ، اور ایک سے ایک بدتر ہے تو کس لیے کوئی ناصبور ہو ۔ بیٹی ! میں یہ نہیں کہتا کہ تم پر مصیبت نہیں پڑی ، پڑی ، مگر اس مصیبت پر جو تمھاری حالت ہے شکر کے قابل ہے کہ خدا کے فضل و کرم سے تندرست ہو ۔ عزت و آبرو کے ساتھ گھر میں بیٹھی ہو ۔ تم نے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا ۔ تم نے دروازے دروازے بھیک نہیں مانگی ۔ تم نے پیٹ کے واسطے کسی کی خدمت نہیں کی ، ٹہل نہیں کی ۔ گو ماں باپ کو خدا نے اٹھا لیا ، مگر ابھی تمھارے غمگسار ، تمھارے خبر گیر ، تمھارے سرپرست موجود ہیں اور

۵۔ خدا کی پناہ ۔ (معاذاللہ)

ان میں سے ایک میں بھی ہوں کہ باپ جتنی نہیں کروں گا تو اس سے پورا اطمینان رکھو کہ ان شاءاللہ اپنے مقدور بھر تمھارے حال کی اصلاح ، تمھارے معاملات کی درستی میں کسی طرح کی کوتاہی بھی مجھ سے نہ ہوگی۔ لاؤ اسی شہر سے ، بلکہ اسی محلے سے ، بلکہ اسی کوچے سے ، بلکہ تمھارے پڑوس سے جتنی عورتیں کہو بلا لاتا ہوں ، جن کو دیکھ کر تم ضرور رحم کروگی اور سمجھو گی کہ یہ مجھ سے زیادہ دکھیا ہیں۔ ایک حکیم کا قول ہے کہ دنیا میں ہر شخص خوش ہے ، اس واسطے کہ وہ اپنی حالت کو کسی دوسرے کی حالت کے ساتھ بدلنا نہیں چاہتا ۔ جس دن پہلے پہل میں نے یہ بات کتاب میں لکھی دیکھی تو میں ذرا اس پر ٹھٹکا ؛ پھر میں نے سوچا کہ اس کو میں اپنے ہی اوپر کیوں نہ آزماؤں ؛ تو میں نے اپنی جان پہچان کے پانچ چھ آدمی تجویز کیے جن کی حالت تو بنظر ظاہر میں اپنی حالت سے بہتر سمجھتا تھا ، لیکن اچھی طور پر غور کیا تو ایک لاولد تھے ، دوسرے بیٹے تو رکھتے تھے ، مگر ناھموار ، تیسرے دایم‌المرض ، چوتھے شدت سے کنجوس ، پانچویں بیوی کی بد مزاجی اور بد سلیقگی اور بد زبانی سے عاجز ، چھٹے لا مذہب[۶] ۔ غرض کسی کو بے داغ نہ پایا۔ تب اس حکیم کے مقولے کی تصدیق اور میرے دل کی تشفی

---

۶ ۔ لا مذہب سے مراد ہے ملحد ، خدا کا منکر؛ کہیں بے چارے اہل حدیث مت خیال کر لینا جن کو متزلزل التوحید براہ لعنت وہابی اور لا مذہب کہتے ہیں* ۔

[فقہی مسلک کو بھی عام محاورے میں مذہب کہا جاتا ہے۔ چونکہ اہل حدیث ائمہ اربعہ میں سے کسی کے مسلک کی تقلید نہیں کرتے ، لہذا بعض سنی عوام (خصوصاً بریلوی جماعت والے) انہیں طنزاً لا مذہب اور وہابی کہتے ہیں۔ اس طنز کے جواب میں مصنف نے حاشیے میں "متزلزل‌التوحید" کہہ کر اُن پر چوٹ کی ہے کہ وہ بدعات و رسوم کے پیرو ہیں۔]

ہوئی ۔ اور پھر ایک بات اور بھی سوچنے کے قابل ہے کہ غم کیسا ہی سخت اور صدمہ کتنا ہی بھاری کیوں نہ ہو، رفتہ رفتہ خود بخود اس کا اثر مضمحل ہوتے ہوتے آخر کار محو ہو جاتا ہے ۔ کبھی ہمارے باپ بھی مرے تھے ، ہم بھی ان کے فراق میں تمھاری طرح بہتیرا روئے دھوئے ، غمگین اور اداس رہے ، آخر بھول بسر گیے ۔ غرض انسان کو چار و نا چار صبر تو کرنا پڑتا ہے ؛ کیا کرے ، دیوار سے سر ٹکرا کر ، کوئیں میں گر کر ، افیون کھا کر حرام موت مر رہے ؟ مگر اس کو صبر محمود نہیں کہتے ، صبر محمود وہی صبر ہے کہ نزول مصیبت کے وقت ہو ، جب کہ رنج دل کو نچوڑتا اور کلیجے کو کھرچتا ہے ، آنسو ہیں کہ نکلے چلے آتے ہیں اور سانس ہے کہ پیٹ میں نہیں سماتا ۔ وہ بندے کے لیے سخت آزمائش کا وقت ہے ۔ معاذاللہ! اگر خدا کی شان میں شکایت کا کوئی کلمہ اس کے منہ سے نکل گیا یا اس کے دل میں خدا کی نسبت ، جل و علا شانہ ، بے رحمی یا بے انصافی کا خیال وسوسے کے طور پر بھی آ گیا تو بس دنیا خراب ، عاقبت برباد ۔ خسر الدنیا والاخرۃ وذالک ھو الخسران المبین[۷] ۔ متقی نے جو یہ باتیں عقل کی ، دین کی ، نصیحت کی بیان کیں تو بھانجی پر ایسا اثر ہوا کہ گویا گرتی ہوئی دیوار کو تھونی لگا دی، ڈوبتے ہوئے کو اچھال کر کنارے پہنچایا ، مرجھائے ہوئے درخت کو پانی دیا ۔

---

۷ - دنیا اور دین دونوں کا ٹوٹا اور یہی کھلا ہوا ٹوٹا ہے * -

آٹھویں فصل

میر متقی کا مبتلا کے امور خانہ داری کی اصلاح میں کوشش کرنا

متقی کا ارادہ تو یہ تھا کہ بھائی سے مل کر ہفتہ عشرہ رہ کر رام پور روانہ ہوں گا ، مگر سوچا کچھ ، اور ہوا کچھ۔ یہاں آ کر دیکھا تو بھائی کو مرے ہوئے چھ مہینے ہو چکے تھے اور بھتیجے صاحب نے وہ ادھم مچا رکھی تھی کہ خدا کی پناہ ۔ دو تین مہینے بھی متقی کے پہنچنے میں دیر ہوتی تو تنخواہوں کا ، کرائے کا ، رہنے کے موروثی مکان کا ، خاندان کی عزت و آبرو کا ، بزرگوں کے نام و نمود کا ، سب کا فیصلہ ہو چکا تھا ۔ باپ کا بیمار پڑنا اور مبتلا کا مدرسے سے اٹھنا ، وہ دن اور آج کا دن ، اس بندۂ خدا نے بھول کر بھی تو مدرسے کو یاد نہ کیا ۔ شروع شروع میں دو چار ہم جماعت بلانے کو آئے ، بعض مدرسوں نے بھی کہلا بھیجا ؛ مبتلا کس کی سنتا تھا ۔ رخصت کی ، غیر حاضری ہوئی اور غیر حاضر ہونا تھا کہ تڑ سے نام کٹ گیا ۔ بیٹھے بٹھائے اچھا معقول وظیفہ کھویا اور بات کی بات میں آیندہ کی ساری اُمیدیں ایک دم سے منقطع ہو گئیں ۔ جن جن سرکاروں سے تنخواہیں مقرر تھیں ، ضرور تھا کہ پیروی کر کے وارثوں کے نام ان کا اجراء کرایا

جائے ، مگر یہاں پیروی کرے تو مبتلا اور نہ کرے تو مبتلا ۔ اگر باپ کے مرنے پر مبتلا ان سرکاروں میں جاتا تو جن سرکاروں کا جیسا دستور تھا ، کہیں سے ماتمی خلعت ، کہیں سے نقد ، کچھ نہ کچھ ملتا پر ملتا اور تنخواہ بھی کہیں سے پوری کہیں سے ادھوری ، جاری ہوتی ہی ہوتی ، مگر مبتلا کو اپنے مشاغل لایعنی سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ ان باتوں کو سوچے اور خلعت یا نقد یا تنخواہ کے لیے سرکاروں میں دوڑ دھوپ کرے ۔ غرض جتنے معمولات تھے سب بند ہو گیے ۔ اب آمدنی کے نام سے تو رہ کیا گیا ، صرف کرایہ ۔ اول تو وہ تھا ہی کتنا ، مگر خیر جس قدر تھا اس کا بھی یہ حال ہوا کہ کسی کے دو روپے دینے ہیں اس نے مانگے ؛ نہ مہینہ دیکھا نہ حساب نہ کتاب ، قلم اٹھا کسی کرایہ دار کے نام چٹھی لکھ دی کہ اس کو دو روپے دے کر کرایے میں مجرا کر لو ۔ اب وہ چٹھی والا کرایہ دار کے سر ہوا ۔ ہر چند وہ کہتا جاتا ہے کہ '' بھئی ابھی مہینہ پورا نہیں ہوا '' یا '' میں نے اپنی گرہ سے مرمت کرائی ہے '' چٹھی والا ہے کہ ایک نہیں سنتا ۔ کرایہ داروں نے دیکھا کہ اللہی! شہر میں ہزارہا مکان اور لاکھوں دکانیں ہیں ، یہ چٹھی کا انوکھا اور نرالا دستور نہ دیکھا نہ سنا ۔ ایک میر صاحب[1] تھے ، اللہ بخشے! کہ ایک مہینے کا کرایہ دوسرے مہینے میں اور دوسرے کا تیسرے میں وصول ہوتا رہتا تھا ۔ بے چارے کبھی ایک سخن بھی تو زبان پر نہیں لائے ۔ انھی کے صاحب زادے ہیں کہ بے حساب بیٹھے بیٹھے چٹھیاں اڑاتے ہیں ، گویا کوتوالی کے پروانے ہیں یا تھانے کے حکم نامے ۔ غرض اکثروں نے بیدل

---

۱ - یعنی مبتلا کے والد میر مہذب مرحوم* ۔

کر مکان خالی کر دیے اور اُٹھ کر کہیں اور جا رہے اور جایداد اس قدر بدنام ہو گئی کہ کوئی دوسرا کرایہ دار رخ نہیں کرتا ۔ مبتلا کے ہاتھ لگ گیا تھا ماں کا زیور ، اسی میں یہ تمام گل چھرے اڑ رہے تھے ۔ پونے دو ہزار کا زیور اس مرحومہ کا تھا ، چھ مہینے میں سب خالصے لگ چکا ۔ اب مہینے سوا مہینے سے اُدھار پر گزران تھی ۔ متقی نے جو یہ حال بھائی کے گھر کا دیکھا تو کیونکر ممکن تھا کہ ان لوگوں کو ایسی حالت میں چھوڑ کر چلا جائے ۔ ناچار رام پور کا ارادہ سر دست فسخ کیا اور مبتلا کو ساتھ ساتھ سرکاروں میں لیے لیے پڑا پھرا ۔ کسی کے کار پرداز سے ساز باز کی ، کسی کے داروغہ کو جا گانٹھا ، سفارش کی جگہ سفارش پہنچائی اور سعی کے مقام پر سعی کرائی ۔ بعض جگہ اپنی وجاہت سے کام نکالا اور جہاں موقع بن پڑا بھائی کے حسن خدمات پر زور ڈالا ۔ غرض کئی مہینے کی دوادوش سے اتنا تو ہوا کہ میر مہذب کے زمان حیات میں جتنی تنخواہیں تھیں ، بلا کم و کاست پوری پوری کھل گئیں ، بلکہ بعض سیر چشم سرکاروں نے پچھلے چھ مہینے کی چڑھی ہوئی تنخواہ بھی بلا وضعات دی ۔ میر متقی نے ایک پیش‌بینی یہ کی کہ جس قدر ذاتی تنخواہ تھی ، یعنی بلا خدمت بطور معاش ملتی تھی ، اپنی بھانجی غیرت بیگم ، یعنی مبتلا کی بی بی[۲] کے نام جاری کرائی اور تنخواہ مشروط الخدمت[۳] مبتلا کے نام ۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ

۲- بیوی (زوجہ) اور بی بی (خواتین کے لیے کلمۂ احترام) ، یہ دونوں لفظ نذیر احمد کے یہاں اکثر اپنے معکوس معنوں میں آئے ہیں ۔ عام بول چال میں بھی کہیں کہیں ایسا سنا گیا ہے ، لیکن تحریر میں تو احتیاط ضروری ہے ۔

۳- وہ تنخواہ جس کے لیے خدمت گزاری یا حاضر باشی کی شرط ہو ۔

بی‌بی کے آگے مبتلا کی ذرا کنی دبی رہے۔ تنخواہوں کا پچھلا چڑھا ہوا روپیہ جس قدر ملا اس سے مکانات اور دکانات کی شکست و ریخت کی درستی کرا کے کرایے داروں کو بسا کر اُن کے سر خط بھی آدھے کرائے کے مبتلا کے نام اور آدھے غیرت بیگم کے نام لکھوا دیے۔ میر مہذب کے روز وفات سے آج تک بیوتات کا حساب بنیے کے یہاں سے ادھار چلا آتا تھا، حساب کر کے اس کا قرضہ چکایا اور آیندہ کے لیے اُچاپت کو مطلقاً بند کر کے یہ قاعدہ باندھ دیا کہ جو چیز درکار ہو، نقد بازار سے آ جایا کرے۔

نویں فصل

میر متقی بڑے بھانجے سید حاضر کو سمجھاتے ہیں کہ بہن کو محروم الارث مت کرو

غیرت بیگم کو بھائیوں نے ترکۂ پدری سے محروم کر رکھا تھا اور کس کی مجال تھی کہ ان بھڑوں کے چھتوں کو چھیڑے! وہ اس بلا کے لوگ تھے کہ اگر نالش کی بھنگ بھی ان کے کان میں جا پڑتی تو کہاں کے ماموں اور کس کی بہن اور کیسا بہنوئی ؛ سب کی عزت کے لاگو ہو جاتے۔ یہ ایک شعر جو مشہور ہے :

بہر جا جمع می آیند سادات فسادات فسادات فسادات

کہتے ہیں کسی نے سید نگر والوں ہی کی شان میں کہا تھا اور متقی کو وہاں کے لوگوں کے ہتھکنڈے بخوبی معلوم تھے اور مخاصمانہ طور پر بھانجوں کے ساتھ پیش آنا اور اُن کے مقابلے میں مدعی یا مدعا علیہ ہونا ، گو بھانجی ہی کا حق طلب کرنے کے لیے کیوں نہ ہو ، نہ ان کو شایاں تھا اور نہ غیرت بیگم کے حق میں مفید۔ سید نگر کے سب لوگ ، زمیندار اور رعایا ، یہاں تک کہ خوش باش ، اس قدر مفسد تھے کہ جھوٹ بولنا ، جھوٹا حلف اٹھا لینا ، جھوٹے گواہ ، جھوٹی روداد اور جھوٹی

دستاویزیں بنانا ، حاکم کو دھوکا دینا ، پرایا حق مار بیٹھنا ، لوگوں کو ناحق ستانا ، ان باتوں کو بڑا ہنر اور داخل ہوشیاری سمجھتے تھے اور جس طرح کوئی بڑا نامی جنرل اپنے دوستوں میں فخراً اپنی فتوحات کے واقعات کا بیان کرتا ہے ، یہ لوگ ہمیشہ دیوانی ، فوجداری کے مقدمات کے تذکرے کرتے رہتے تھے ۔ کوئی امیر اپنی مدح پر اتنا ناز نہ کرتا ہوگا جتنا ان کو ڈگریوں اور فیصلوں پر تھا ۔ ان لوگوں کی نظروں میں میر متقی صوفی و فقیہ تھے، مگر سادہ لوح اور سفیہ؛ عالم و فاضل تھے، مگر احمق ولایعقل ۔ میر متقی کا چھوٹا بھانجا سید ناظر ، جو غیرت بیگم سے بھی عمر میں چھوٹا تھا ، کچہری دربار کا کام دیکھتا تھا اور تمام معاملات مقدمات اسی سے متعلق تھے ، پس یہ گھر کا عقل کل تھا ۔ سید حاضر جو غیرت سے بڑا اور اکبر اولاد تھا ، سید نگر میں مکان کی خبرگیری کرتا تھا اور رعایا سے وصول تحصیل کرنا اور سیر[1] کا جتوانا بوانا ، غرض گاؤں کا سب کام کاج اس کے سپرد تھا ۔ ماموں کا آنا سن کر سید نگر سے سید حاضر تو فوراً اگلے ہی دن آ حاضر ہوا اور اس نے اس کا بھی انتظار نہ کیا کہ تعزیت کے لیے ماموں کی طرف سے تقدیم ہونی چاہیے ، لیکن جب وہ واپس جانے لگا تو میر متقی اس کے ساتھ ادائے رسم تعزیت کے لیے سید نگر گیے ۔ ناظر وہاں نہ تھا ۔ معلوم نہیں کسی ضرورت سے غیر حاضر تھا یا قصداً ماموں کی آمد سن کر ٹل گیا تھا ۔ میر متقی نے بتقریب تعزیت جہاں اور بہت سی باتیں سید حاضر سے کیں ، ان میں سے یہ بھی تھی کہ ''تم کو شروع سے خدا نے بڑا کیا، کیونکہ تم بھائی صاحب مرحوم کی اولاد میں سب سے بڑے ہو ، لیکن تم

---

۱ ۔ زمیندار کی خود کاشت زمین کو سیر کہتے ہیں * ۔

پہلے صرف ان کی نسل میں بڑے تھے اور اب خاندان اور برادری میں بھی بڑے ہو ، کیونکہ تم کو لوگ مرحوم کا جانشین سمجھتے ہیں اور تم ان کے جانشین ہو بھی ۔ انسان کو خدا نے ایسے طور کا مخلوق بنایا ہے کہ تمدن اس کو لازم ہے ۔ جس طرح تمدن اس کے وجود کی شرط ہے کہ اگر انسان مدنی الطبع نہ ہوتے اور آدمی آدمی کے ساتھ مل کر نہ رہتا تو آگے کو ان کی نسل نہ چلتی ، اسی طرح تمدن انسان کی حیات ، بلکہ اس کی ممات کی بھی شرط ہے ۔ تمدن نہ ہو تو انسان کی زندگی عذاب اور مرے پیچھے اس کی مٹی خراب ۔ تمدن کی ضرورت سے آدمی دو دو ، چار چار ، دس دس ، پچاس پچاس ، ہزار ہزار ، لاکھ لاکھ اور اس سے بھی زیادہ اکٹھے ہوکر رہتے ہیں ، اور خاندان اور قبیلے اور کنبے اور برادری اور گاؤں اور قصبے اور شہر اسی تمدن کے مظاہر ہیں ۔ تمدن سے لوگوں میں انواع و اقسام کے باہمی تعلقات قائم ہوتے ہیں ۔ ماں ، باپ ، بیٹا ، بیٹی ، میاں بی بی ، بھائی بہن اور جتنے دور و نزدیک کے رشتہ دار ہیں ، اور ہمسایہ اور ہم وطن اور حاکم و محکوم اور بادشاہ اور رعایا اور استاد اور شاگرد اور آقا اور نوکر اور افسر اور ماتحت اور زمیندار اور کاشتکار اور بائع اور خریدار وغیرہ ، یہ سب نام ہیں لوگوں کے باہمی تعلقات کے ۔ ہر تعلق کے ساتھ کچھ حقوق ہوتے ہیں اور کچھ ذمہ داریاں ؛ مثلاً باپ اور بیٹے میں یک طرح کا تعلق ہے ۔ باپ کا حق ہے کہ بیٹا اس کا ادب کرے اس کا حکم مانے اور اس کی ذمہ داری یا بعبارت دیگر اس کا فرض یہ ہے کہ بیٹے کو شفقت کے ساتھ پالے ، تربیت کرے پڑھائے لکھائے ، ہنر سکھائے جو اس کے کام آئے ۔ لوگوں کا یہ حال ہے کہ تمدن کے حقوق و فرائض میں اکثر ، بلکہ سب کے

کہتے ، الاماشاءاللہ مطفف ہیں ۔ مطفف عربی میں کہتے ہیں اس شخص کو کہ اپنا لینا ہو تو جھکی ہوئی تول لے اور دوسرے کا دینا ہو تو اڑتی ہوئی دے ۔ ایسے ہی لوگوں کی شان میں اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے : ویل للمطففین الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون واذا کالوھم اوزنوھم یخسرون الا یظن اولئک انھم مبعوثون لیوم عظیم یوم یقوم الناس لرب العالمین ۔ (افسوس ہے ڈنڈی ماروں پر کہ جب لوگوں سے ناپ کر لینا ہو تو پورا پورا لیں اور جب لوگوں کو ناپ کر یا تول کر دینا پڑے تو ان کو گھاٹا پہنچائیں ۔ کیا یہ لوگ اس بات کا خیال نہیں کرتے کہ ایک بڑا دن آنے والا ہے اور اس دن ان کو مر کر اٹھنا ہو گا ۔ اس دن لوگ پروردگار عالم کے رو برو کھڑے ہوں گے) اسی طرح دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں ، الاماشاءاللہ[۲] ، جو اپنے حق میں سے کسی بھائی کو رتی بھر چھوڑ دے ۔ لینے میں تو ایسا سیانا اور سخت گیر ، اور دوسرے کے حقوق ضائع ہوں ، تلف ہوں ، کچھ پروا نہیں ، ذرا دل پر میل نہیں ؛ دینے میں ایسا گھر کا بھولا اور شریر ! اس کش مکش اور مفسدے کے روکنے کے لیے اللہ صاحب[۳] جل شانہ، نے دوھرے انتظام کیے ۔ ایک سلطنت ظاھری کہ بادشاہ ہے اور اس کے پاس فوج ہے اور توپ ہے اور تلوار ہے اور قوت ہے اور پولیس ہے اور حاکموں کا ایک گروہ ہے اور جلاد ہے اور جیل خانہ

۲- سوا اس کے جسے خدا چاہے یا توفیق دے ، یعنی ایسے لوگ شاذ و نادر ہیں ۔

۳- صاحب کے معنی مالک اور آقا کے ہیں ؛ کثرت استعمال سے (یا انگریزوں سے منسوب ہو کر) صاحب کے لفظ میں مذہبی تقدیس و تعظیم کا وہ مفہوم باقی نہیں رہا اور اب کوئی اللہ صاحب یا پیغمبر صاحب نہیں لکھتا ۔

ہے اور بند ہے اور تازیانہ ہے ۔ اس انتظام کے تفصیلی حالات تم کو مجھ سے بہتر معلوم ہیں ۔ دوسری ایک سلطنت الٰہی ہے جس کو دین یا مذہب یا شرع کہتے ہیں ۔ اس میں توپ کا نام نہیں ، اعوان و انصار نہیں ، فوج اور سپاہ درکار نہیں ، مگر دنیا میں جس قدر امن اور جتنی عافیت ہے اسی الٰہی سلطنت کی بدولت ہے ۔ ظاہر بیں اور کوتاہ بیں ایسا سمجھتے ہیں کہ دنیا کا سارا انتظام حکام ظاہر کرتے ہیں ۔ استغفراللہ نہ کرتے ہیں اور نہ کر سکتے ہیں ۔ ملک کی ساری پلٹنیں کالوں کی اور گوروں کی اور سارے رسالے اور سارے توپ خانے اور سارے پولیس کے ملازم اور سارے حاکم ، سب کے مجموعے کو ملک کی مردم شماری پر پھیلا کر دیکھو تو کیا پرتا[۴] پڑتا ہے ۔ اگرچہ دس ہزار باشندوں پر ایک کا پرتا بھی نہیں بیٹھے گا ، مگر فرض کرو کہ دس ہزار پیچھے ایک ، تو کیا یہ بات سمجھ میں آنے کی ہے کہ ایک متنفس دس ہزار آدمی کے ضبط پر قادر ہو؟ آدمی تو آدمی ، اگر دس ہزار گدھے یا دس ہزار بھیڑ بکری بھی ہوں تو ایک چرواہا ان کو ایک جگہ کھڑا نہیں رکھ سکتا ؛ نہ یہ کہ ان کو جس کروٹ اٹھائے اٹھیں اور جس کروٹ بٹھائے بیٹھیں ۔ ہاں شاید تمہارے دل میں یہ بات خطور کرے گی کہ حاکم ایک کو سزا دیتا ہے تو دس ہزار کو عبرت ہوتی ہے ، لیکن خیال کرنے کی بات ہے کہ جن کو سزا ہوئی انھیں کو کیا عبرت ہوئی کہ دوسروں کو ہوتی ۔ ہم نے تو یوں سنا ہے ، خدا جانے جھوٹ یا سچ ، کہ بد معاش لوگ اول تو گرفت ہی میں نہیں آتے اور اگر کوئی شامت کا مارا قضارا ماخوذ بھی ہوا تو سید نگر والے (وکیل مختار) اس

۴۔ پرتا پڑنا یا پرتا بیٹھنا ، اوسط پڑنا یا اوسط بیٹھنا کے معنی میں آتا ہے ۔

کو سزا نہیں ہونے دیتے اور سزا بھی ہوئی تو ان کی عبرت اس سے ظاہر ہے کہ چھوٹتے ہیں تو دوسرے قیدیوں کو وصیت کر آتے ہیں کہ دیکھنا بھائی میرے چولھے کو ہاتھ نہ لگانا ، مہینہ پورا نہیں ہونے پائے گا کہ میں پھر آتا ہوں ۔ ہم کو تو کبھی اتفاق نہیں ہوا ، اور خدا نہ کرے کہ ہو ، مگر اخباروں میں اکثر دیکھا ہے کہ فلاں مقام پر فلاں خونی کو فلاں تاریخ فلاں وقت پھانسی دی گئی ، دو ہزار آدمیوں کی بھیڑ تھی ۔ عبرت ہو تو ایسی ہو ۔ یہ سب نالائق تماشائی تھے اور سنگ دل قصائی ۔ اس کے علاوہ ایک بدیہی دلیل ایسی ہے کہ اس سے تو تم کو میری بات کا پورا تیقن ہوجائے گا ۔ یہ ہلواہا جو بیلوں کو تھان سے کھول کر لیے جا رہا ہے اس کا کیا نام ہے ؟'' حاضر ''اس کا نام غریبا '' متقی ''ذرا اس کو بلانا '' حاضر نے بلایا تو اس نے ہل تو کندھے پر سے اتار کر وہیں رکھ دیا اور اسی ہل سے بیلوں کو اٹکا ، سامنے آ کھڑا ہوا ۔ متقی ''کیوں میاں تمہارا کیا نام ہے ؟'' غریبا ''میاں[۵] مجھ کو گریبا کہتے ہیں ۔'' متقی ''کون ذات ہو ؟ '' غریبا''گوجر'' متقی ''تم کتنی کھیتی کرتے ہو؟'' غریبا

۵- غریبا کی گفتگو مصنف کی فطری مکالمہ نگاری کی ایک عمدہ مثال ہے ۔ یہاں ہندی کے بہت سے الفاظ آئے ہیں جن کے معنی درج ذیل ہیں :-

ہلواہا :- ہل چلانے والا ملازم ۔ کھار :- شور زمین - مقام کا نام بھی ہو سکتا ہے: بہر صورت یہ لفظ 'لونیا' کی رعایت سے لایا گیا ہے۔ بھوما : نام - لونیا :- نمک فروش ۔ ہندو شودروں کی ایک قوم - یہ لوگ کبھی نمک کا بیوپار کرتے ہوں گے، لیکن اب عموماً مٹی کھودنے کا پیشہ کرتے ہیں - کہیں کہیں گورکن کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں - بھوما نام میں اسی معنی کی رعایت ملحوظ ہے۔ ادھواڑ :- نصف - بانٹیہ دار :- حصہ دار- کرپا :- مہربانی - نیدان :- نادان ۔ دیا :- رحم ۔ کرم - مسی کسی :- موٹا جھوٹا - موٹا اور سستا اناج - ٹہل :- خدمت ۔ کام ۔ بھیتر :- اندر - مراد اندرون خانہ - سہایتا :- مدد - ۔ مانس :- آدمی

''میری کھیتی الگ نہیں (سید حاضر کی طرف اشارہ کرکے) ھاجر (حاضر) میاں کا ھلواھا ھوں اور کھار میں ایک دو بیگھے کا کھیت بھوما لونیے کا ھے، اس میں ادھواڑ کا بانٹیہ دار[۶] ھوں۔'' متقی۔ ''بال بچے کتنے ھیں؟'' غریبا (مسکرا کر) ''بھگوان کی بڑی کرپا ھے، آٹھ!'' متقی ''کسی کا بیاہ برات بھی کیا ھے؟'' غریبا ''ابھی سب نیدان[۷] ھیں۔'' متقی ''اتنے کنبے میں کیوں کر گزرتی ھوگی؟'' غریبا ''ھاجر (حاضر) میاں کی دیا سے روکھی سوکھی، مسی کسی دو وخت نہیں تو ایک وخت مل ھی جاتی ھے۔ چھوٹے بڑے انھی کی ٹہل میں لگے رھتے ھیں۔ یہی سب کو پالتے ھیں۔ بھیتر سے بڑی سہایتا رھتی ھے۔'' متقی (اشارے سے غریبا کو پاس بلا کر آھستہ سے) ''کیوں بے، آج کل تو کھلیان تیار ھیں، رات بے رات موقع پا کر کھلیان پیچھے دو دو پولی بھی اٹھا لائے تو کسی کو کیا معلوم اور مزے میں تیرا کام ھو جائے۔'' غریبا (دور ھٹ کر) ''نا میاں! بھگوان برا کام نہ کرائے۔'' متقی ''کیوں، کیا جاگا چوکیدار سے ڈرتا ھے؟ اس کو ھم سمجھا دیں گے۔'' غریبا ''جاگا (گالی) کہاں کا سورما ھے، ایک ڈپٹ بتاؤں تو (گالی) دھوتی میں..... پر نہیں برا کام برا ھی ھے۔'' متقی ''ابے مسخرے! کسی کو کانوں کان تو خبر ھونے کی نہیں۔ یہ اچھا ھے کہ تن پر چیتھڑا نہیں پیٹ کو ٹکڑا نہیں؟'' غریبا ''مانس[۸] پڑا مت دیکھو، بھگوان سے تو کچھ چھپا نہیں۔'' اس کے بعد متقی نے استالت کی دو چار باتیں کرکے غریبا کو تو رخصت کیا اور سید حاضر سے کہا ''کیوں صاحب آپ نے دیکھا'' یہی انتظام الٰہی ھے کہ یہ بے چارہ نہ

---

۶ - یعنی آدھے کا ساجھی* -
۷ - یعنی نادان* -
۸ - یعنی انسان نہ دیکھے، مگر خدا تو دیکھتا ھے* -

تو پڑھا اور نہ لکھا اور نہ شاید ساری عمر کسی پنڈت برھمن کی صحبت میں بیٹھا ؛ ضرورت اس درجے کی کہ اگر سچ پوچھئے تو فمن اضطر فی مخمصة[۹] کا مصداق ھے ؛ اندیشۂ پاسبان سے مطمئن اور اس پر چوری کو سمجھتا ھے کہ برا کام ھے ۔ اصل میں برا سمجھنا اس کو چوری کے ارتکاب کا مانع ھے اور یہ سمجھ ، یعنی برے بھلے کا امتیاز ، جو خدا نے مرد، عورت، لڑکے، جوان، بوڑھے، خواندہ ، ناخواندہ ، ذھین، غبی ، شہری، دیہاتی سب بنی آدم کو علیٰ قدر مراتب دیا ھے ، ایک پاسبان الٰہی ھے جو ھر ایک پر مسلط ھے ؛ اس کو کراماً کاتبین[۱۰] کہو یا نفس لوامہ[۱۱] سمجھو یا جن الفاظ سے چاھو تعبیر کرو ۔ میرا عقیدہ تو یہ ھے کہ جرموں کا انسداد لاکھ حصے سلطنت الٰہی کی تاثیر سے ھے تو شاید ایک حصے حکومت ظاھری کی تدابیر سے ۔ حکومت ظاھری میں ایک بڑا نقص یہ ھے کہ حاکم کیسا ھی منصف کیوں نہ ھو چونکہ اس کو معاملے کی اصل حقیقت سے تو آگہی ھوتی نہیں ، ناچار اُسے روداد کی پابندی کرنی پڑتی ھے اور روداد کی کیفیت تو کوئی ھمارے سید نگری بھائیوں سے پوچھے کہ کہو تو مکھی کو بھینسا بنا دیں اور فرماؤ تو بھینسے کو مچھر بنا کر اُڑا دیں ۔ پس حاکم ظاھری کبھی پورا پورا انصاف کر ھی نہیں سکتا ۔ اس کا فیصلہ اندھے کی لاٹھی ھے ، لگی لگی نہ لگی نہ لگی ۔ برخلاف سلطنت الٰہی کے ، اس کا نشانہ ممکن نہیں کہ خطا کرے ؛ اس کا مجرم ھو نہیں سکتا کہ سزا سے بچ جائے ۔ کس کی مجال ھے کہ

---

۹ - قران کی ایک آیت کا ٹکڑا ھے جس کے معنی یہ ھیں کہ اگر کوئی شخص بھوک سے بے قرار ھو تو اس کو مردار بھی حلال ھے * ۔

۱۰ - فرشتے جو مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق اعمال نامہ لکھتے ھیں* ۔

۱۱ - آدمی کا دل جو اس کو برے کام پر ملامت کرتا ھے * ۔

اس کی ڈگری کو روکے ؛ کس کی طاقت ہے کہ اس کے محکم کو ٹالے ! اگرچہ خدائی فیصلوں کے لیے ایک دن مقرر ہے ، یعنی روز قیامت کہ اس دن اللہ جل وعلا شانہ ، عدل و انصاف کے تخت پر اجلاس فرمائے گا ، اور نیک اور بد اور سخی اور سوم اور ظالم اور مظلوم سب کا اخیر چکوتا کر دے گا - فریق فی الجنۃ و فریق فی السعیر۱۲ ، مگر کبھی مصلحت الٰہی اس کی بھی مقتضی ہوتی ہے کہ اس دنیا میں بدلہ مل جاتا ہے - یہی سید نگر ہے کہ اب سے بہت زیادہ دور بھی نہیں شاید بیس برس پہلے دس بارہ ہاتھی سادات کے دروازوں پر کھڑے جھولتے تھے اور اُن کی سخاوت اور داد و دہش اور مہمان نوازی اور مسافر پروری کی کیا شہرت تھی کہ کربلا اور بغداد اور حرمین۱۳ اور نجف اور کاظمین کے تک زوار ہر سال نام سن کر آتے تھے - میں ان دنوں اچھا خاصا ہوشیار تھا ، مجھ کو اب تک یاد ہے کہ اس بڑی مسجد میں دو ڈھائی سو طالب العلم رہتے تھے اور یہیں کے سادات ان کے کھانے ، کپڑے ، کتاب ، سب چیزوں کی خبرگیری کرتے تھے- طالب العلموں کے پڑھانے کے لیے بیش قرار تنخواہوں کے پانچ یا چھ اچھے جید حافظ اور مولوی نوکر تھے - سارے مہینے رمضان کے اور دس دن محرم کے غربا اور مساکین کے لیے اس قدر کھانے پکتے تھے کہ اس کا ٹھیک اندازہ کرنا مشکل ہے - بارہ کوس کے گردے کی تمام خلقت ٹوٹتی تھی اور کیا نیتوں کی برکت تھی کہ ہزار، دو ہزار، پانچ ہزار، جتنے آدمی ہوتے ، ہر شخص کو دو خمیری روٹیاں ایک پیالہ قلیے کا اور ایک خوانچہ کھیر

۱۲- ایک گروہ جنت میں اور ایک گروہ دوزخ میں* -

۱۳- حرمین : مکہ اور مدینہ - نجف : عراق میں ایک مقام جہاں حضرت علی کا مزار اقدس ہے - کاظمین : بغداد کے قریب ایک زیارت گاہ جہاں ساتویں اور نویں امام کے مقبرے ہیں-

کا وقت پر پہنچ جاتا ۔ میر بابا صاحب کا گھر اُن دنوں سب میں بڑھا چڑھا تھا ۔ ان کا حال سنا ہے کہ دونوں وقت گنے ہوئے پورے سو آدمی دسترخوان پر میر صاحب کے ساتھ کھانا کھاتے تھے اور کیسی خدا کی مہربانی تھی کہ گلی میں دیکھو تو کوڑیوں لڑکے ۔ سید نگر میں کبھی کسی سیدانی کو بانجھ اور چھ سے کم کسی کے بچے سننے میں نہیں آئے ۔ غلہ ہمیشہ ارزاں ، عام بیماری یا وبا کبھی سید نگر کے سوانے میں داخل نہیں ہوئی ۔ یکایک گوجروں سے سوانے کی تکرار ہوئی ، لٹھ چلا ، طرفین سے آدمی مارے گیے؛ بس اس دن سے سید نگر پر تباہی آئی ۔ یوں تو سادات اور گوجروں میں سدا سے چھیڑ چھاڑ ہوتی ہی چلی آتی تھی ، مگر اس مقدمے میں سادات سراسر برسر ناحق تھے ۔ ہمیشہ سے سید نگر کا سوانا اس تیس ہزاری باغ کی مشرقی کھائی تھی ۔ یہ باغ عین سوانے پر اسی غرض سے لگایا گیا تھا کہ گوجر حد سے متجاوز نہ ہوں ۔ تکرار اتنی ذرا سی بات پر ہوئی کہ میر بابا کے بڑے بیٹے میر مقتدر کے سائیسوں نے گوجروں کی رکھانت گھانس باغ کے پورب کاٹنی شروع کی ۔ گوجروں نے مزاحمت کی ، یہاں تک کہ داتاسنگھ نے جو گوجروں کا سرگروہ اور میر بابا کا مد مقابل تھا ، اپنا خاص کارندہ میر بابا کے پاس بھیجا ۔ وہ کارندہ میر صاحب تک پہنچنے نہیں پایا کہ بیچ میں میر مقتدر نے اس کو بہت کچھ سخت و سست کہا اور حق و ناحق ہزارہا گالیاں داتا سنگھ کو دیں ۔ میر مقتدر بڑے غصیلے اور بڑے ظالم اور بڑے سخت گیر اور بڑے جابر مشہور تھے ۔ کہتے ہیں کہ دوتین خون اُن کے ہاتھ سے ہوئے ، مگر دب دبا گئے ۔ انھوں نے ظلماً کئی بھلے آدمیوں کی ناموس بگاڑی اور عزت ریزی کی ۔ میر بابا کے خاندان میں جو سید لوگ ناتا نہیں کرتے اصل میں اس کا

سبب یہی ہے کہ میر مقتدر نے بلا امتیاز بہت سی عورتوں کو جبراً گھر میں ڈال لیا تھا ۔ کوئی ہندنی تھی ، کوئی چاری ، کوئی گوجرنی ۔ غرض میر مقتدر کے بعد سے ان کے خاندان کے نسب کا اعتبار اٹھ گیا ۔ بیٹے کے زور و ظلم نے میر بابا کی تمام نیکیوں کو بے قدر کر رکھا تھا ۔ نہیں معلوم دیدہ و دانستہ بیٹے کی حرکات ناشایستہ سے چشم پوشی کرتے تھے یا واقع میں مقتدر پر ان کا کچھ اقتدار نہ تھا ۔ میر مقتدر کا تمام علاقے میں ایسا زلزلہ تھا کہ کوئی بھلا آدمی سید نگر کی تھانہ داری پر آنے کے لیے رضا مند نہیں ہوتا تھا ۔ مجبور کیا جاتا تو نوکری سے استعفا دیتا ، مگر ادھر کا رخ نہ کرتا ۔ میں ایسا خیال کرتا ہوں کہ سیدنگر کو مقتدر کے ظلموں نے تباہ کیا اور نزاع سوانے کا ایک بہانہ تھا ۔ جب مقتدر نے داتا سنگھ کے کارندے کو برا بھلا کہا اور اس کے مالک کو علیٰ رؤس الاشہاد[۱۴] مغلظات سنائیں ، وہ بےچارہ اپنا سا منہ لے کر لوٹ گیا اور داتا سنگھ کے آگے جا کر اپنی پگڑی زمین پر دے ماری اور کہا کہ ''تم نے مجھ کو بےعزت کرایا اور خود بھی بےعزت ہوئے ۔ آج میر بابا کے بیٹے نے بھری کچہری میں مجھ کو اور تم کو دونوں کو فضیحت کیا اور ایسی ایسی گالیاں دیں کہ کوئی چار کو بھی نہیں دیتا ۔'' داتا سنگھ بڑی غیرت اور بڑے طنطنے کا آدمی تھا اور کسی بات میں میر بابا سے ہیٹا نہ تھا ۔ سن کر لال ہوگیا اور کہا کہ '' اس مسلمان کے چھوکرے کا اتنا مقدور ! خیر ، اب لڑائی ہے تو لڑائی ہی سہی ۔'' داتا سنگھ کے منہ سے اتنی بات کا نکلنا تھا کہ ڈیڑھ دو ہزار گوجر بھاری بھاری لٹھ کندھوں پر

---

۱۴ - لوگوں کے رو برو* -

دھر[۱۵] رکھانت پر جا موجود ہوئے۔ میر صاحب کے گھسیارے ان کو دور سے دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ سید نگر میں خبر ہوئی ، ادھر سے لشکر سادات نکلا۔ دوپہر کامل لٹھ چلا۔ دو پونے دو سو آدمی زخمی ہوئے۔ چار گھڑی رات جاتے جاتے سرکاری فوج توپ لے کر آ پہنچی۔ پکڑ دھکڑ شروع ہوئی ، تحقیقات ہونے لگی اور نتیجہ یہ ہوا :

قصاص	قید	
	میعادی	دائم الحبس
۷	۵۱	گوجر پور :- ۵
۱۸	۱۰۱	سید نگر :- ۲۲

ہنگاموں اور خانہ جنگیوں میں اکثر سزا کا پلہ دونوں طرف برابر رہتا ہے ، مگر سیدوں نے بڑا غضب یہ کیا کہ ادھر تو سوانے پر لڑائی ہو رہی تھی ، ادھر ڈھائی تین سو آدمی سید نگر سے نکل کنی کاٹ گوجر پور میں جا گھسے اور وہاں گوجروں کے مندروں کو توڑا پھوڑا ، عورتوں کو بے عزت کیا۔ یوں سیدوں کی طرف سے زیادتی بہت ہوئی اور سزا بھی بہتوں نے پائی۔ میر بابا نے تو جس وقت سرکاری فوج کا آنا سنا اسی وقت زہر کھا کر مر رہے۔ میر مقتدر کسی تدبیر سے بھاگ نکلے۔ گھر بار ضبط ہوا ، اسباب نیلام ہوا۔ بیٹوں میں تین یا چار نابالغ بچے تھے وہ تو بچے ، دو نے پھانسی پائی اور دو کالے پانی بھیجے

۱۵- رکھنا کے معنی میں دھرنا کہیں کہیں بول چال میں رائج ہے، لیکن تحریر میں متروک ہو چکا ہے۔

گیے ۔ میر مقتدر کے لیے پانسو روپے کا اشتہار ہوا ، مگر پکڑے نہ گیے۔ رفیق ، ان کا ایک خانہ پرورد آن کے ساتھ بھاگا ۔ دس بارہ برس بعد اکیلا واپس آیا ، بڑا نمازی بڑا پرہیزگار ۔ وہ بیان کرتا تھا آن کی مصیبتیں کہ سن کر رونگٹے کھڑے ہوتے تھے ۔ کہتا تھا کہ آخر کار کسی مقام پر بغداد کے علاقے میں میر مقتدر مرض موت میں مبتلا ہوئے ، مگر ایسی سختی کی موت ہم نے تو دیکھی کیا سنی بھی نہیں ۔ پورے پندرہ دن بول و براز بند تھا ؛ نہ مسہل اثر کرتا تھا نہ حقنہ نہ پچکاری ۔ دن اور رات مچھلی کی طرح تڑپتے تھے اور کسی وقت تالو سے زبان نہیں لگتی تھی ۔ بول و براز کے بند ہونے سے مادے میں سمیت پیدا ہوئی اور سمیت ظاہر جلد تک پھوٹ پڑی ۔ باوجودیکہ نہایت گورے چٹے آدمی تھے اور آن مصیبتوں میں بھی ایرانی معلوم ہوتے تھے ، سمیت کی وجہ سے سارا جسم ایسا ہو گیا تھا جیسے سیہ تاب ، اور سوزش اس بلا کی کہ کیچڑ میں لوٹے لوٹے پھرتے تھے ، مگر ایک لمحے قرار نہ تھا ۔ مرنے سے سات دن پہلے نہیں معلوم کیا بات تھی بے ہوشی میں وطن کے لوگوں کے نام لے لے کر کہتے تھے ، فلانا مجھ کو مارے ڈالتا ہے ، فلانا گرم سیخیں میرے پیٹ میں بھونکتا ہے ، فلانا[۱۶] مجھ کو تنور میں دھکا دیتا ہے ، فلانا میری کھال کھینچتا ہے ۔ رفیق کا مقولہ یہ تھا کہ جن لوگوں کے وہ نام لیتے تھے وہ تھے جن پر انھوں نے ظلم کیے[۱۷] تھے ۔ رفیق یہ دیکھ کر اس قدر مرعوب ہوا کہ گویا اسی دن سے اس نے ترک دنیا کیا ۔ غرض وہ کمبخت

۱۶- عام بول چال میں فلاں سے فلانا ہوگیا ۔

۱۷- اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسے ظالم اگر قانون کی گرفت سے بچ بھی نکلیں تو مختلف جسمانی و نفسیاتی امراض میں مبتلا ہو کر خود اپنے ضمیر کے ہاتھوں عبرت ناک سزائیں پاتے ہیں ۔

سوانے کا مقدمہ کیا ہوا تھا کہ سید نگر کے حصے کی قیامت آگئی ۔ آبرو اور جان اور مال کا جو نقصان ہوا تھا سو ہوا تھا ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ سادات سے خیر بالکل اٹھ گئی ۔ اب اس نواح میں سید کے معنے ہیں مفسد ، لڑاکا ، جھگڑالو ، مردم آزار ، جھوٹا ، جعلساز ، مفتری ، فتنہ پرداز ، اور واقع میں لوگوں کے افعال اور معاملات پر نظر کرتے ہیں تو جس قدر بدنامی ہو رہی ہے اس سے زیادہ کے مستحق ہیں ۔ گوجروں کے ساتھ لڑنے کا مزہ چکھ چکے تھے ، چاہیے تھا کہ لڑائی کے پاس نہ پھٹکتے ، مگر الٹا اثر یہ دیکھنے میں آیا کہ بھائی بھائی سے لڑنے لگا ، باپ بیٹے سے ، میاں بی بی سے ، پڑوسی پڑوسی سے ، حصہ دار حصہ دار سے ، زمیندار کاشتکار سے ؛ گویا لڑائی ان کے خمیر میں داخل ہے یا بے لڑے ان کو نیند نہیں آتی یا کھانا ہضم نہیں ہوتا ۔ شرافت نجابت کے دعوے اتنے لمبے چوڑے کہ کسی کو اپنا کفو نہیں سمجھتے ، مگر معاملات ایسے کہ پاجی سے پاجی کو شرم آئے اور کمینے سے کمینے کو عار ۔ سید نگر کی کھیوٹ نکال کر دیکھو ، جھڑا عورتوں کے نام ہیں ، کسی کی جورو کسی کی بیٹی کسی کی بہن ۔ دیوانی فوجداری میں ، مہر اور نان و نفقہ اور طلاق کے جتنے مقدمے ایک سید نگر کے ہوں گے شاید ساری لفٹنٹی[۱۸] کے نہ ہوں ، مگر ان تمام فسادات کے نتیجے کیا ہیں ؟ تم لوگوں کے گھروں میں اسٹامپ[۱۹] کے

---

۱۸ - جس طرح کمشنر سے کمشنری بن گیا ، اسی طرح لفٹنٹ گورنر کے صوبے کے لیے لفٹنٹی بولا جانے لگا ۔ اس زمانے میں دھلی و نواح دھلی کا علاقہ صوبۂ پنجاب میں شامل تھا اور صوبے کا حاکم اعلیٰ لفٹنٹ گورنر کہلاتا تھا ۔

۱۹ - مراد ایسے دستاویز جو سرکاری اسٹامپ والے کاغذ پر لکھے جاتے ہیں ۔

بڑے بڑے پشتارے بہت نکلیں گے ، بیبیوں کے جسم پر چاندی کا تار نہیں ۔ باوجودیکہ دیہاتی پہناوا ہے ، گٹھڑی[۲۰] میں سلیقے کا کوئی کپڑا نہیں ۔ جوار ، باجرا ، سانواں ، کودوں[۲۱] جو کچھ سیر میں پیدا ہوا ، اسی پر تمہاری گزران ہے ۔ تمہارا علاقہ شہد کی مکھیوں کا چھتا ہے ؛ جتنے پیدا ہوتے گیے اسی میں بھرتے گیے ۔ میں اگر تمہارے علاقے کا مہتمم بندوبست[۲۲] ہوتا ، بیگھ بسوا بسوانسی کچوانسی[۲۳] سب موقوف کر کے کسور اعشاریہ میں تمہارا کھیوٹ[۲۴] بناتا ۔ یہ حال تو تمہاری حصہ داریوں کا ہو گیا ہے ، اس پر طرہ یہ ہے کہ جس حصے کو دیکھئے کثرت انتقالات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک کباب ہے اور اس میں ہزارہا چیونٹیاں ۔ سید زادوں کو دیکھا تو اس سرے سے اس سرے تک ایک ہوشیار نہیں ، کسی میں آیندہ کی فلاح کے آثار نہیں ۔ یہ وبال ، یہ نکبت ، یہ ذلت ، یہ افلاس سب تمہارے ہی اعمال کی سزا

۲۰- پہلے دیہات میں صندوق کا استعمال عام نہ تھا ، عورتیں اپنے کپڑے گٹھڑی میں باندھ کر رکھتی تھیں ۔

۲۱- ان سب کا شمار موٹے یا معمولی قسم کے غلے میں ہوتا ہے ۔ سانواں اور کودوں کو چاول کی طرح پکا کر کھاتے ہیں ۔

۲۲- محکمہ بندوبست آراضی (Settlement) میں موجودہ افسر مال کے رتبے کا حاکم جس کی نگرانی میں آراضی کی پیمائش و تشخیص اور مالیہ کے تعین کے بعد کھیوٹ کے کاغذات تیار کرنا ہوتے تھے ۔

۲۳ - زمین ناپنے کے پیمانے ہیں ۔ بیگھ سب سے بڑا اور کچوانسی سب سے چھوٹا ہے ۔ ان سب میں علی الترتیب ۱ اور ۲۰ کی نسبت ہوتی ہے ۔

۲۴ - من جملہ کاغذات پٹواری وہ کاغذ جس میں مالکان آراضی کی حقیت ، نوعیت اور اُن کے حصے درج ہوتے ہیں ۔ یہاں طنزاً یہ بات کہی گئی ہے کہ آپس کے جھگڑوں سے کھیت اتنے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکے ہیں کہ بیگھ ، بسوا وغیرہ کے عام پیمانوں میں کھیوٹ بنانا دشوار ہوگا اور کسور اعشاریہ کا استعمال کرنا پڑے گا ۔

ھے ، اور اگر یہ پوری سزا ھوتی تو تم سستے چھوٹ گیے تھے ، یقین جانو سزا نہیں ھے ، بلکہ تمہید سزا ۔ جب سزا کا وقت آیے گا تو یہ تمہارا قانون اور قاعدہ کچھ نہیں پوچھا جائے گا ۔ حقوق کے متعلق ایک بات اور ھے جس کو میں چاھتا ھوں کہ تم اس کی طرف زیادہ توجہ کرو ۔ وہ یہ ھے کہ انسان کے ذمے دو طرح کے حقوق ھیں ، حقوق اللہ اور حقوق العباد ۔ لوگ حقوق العباد کی نسبت بڑی غلطی میں پڑے ھیں اور ان کو آسان سمجھ لیا ھے ، حالانکہ بڑی ٹیڑھی کھیر ھے ۔ اگر کسی آدمی سے اللہ کے حقوق ضائع ھوں ، اور سبھی سے ھوتے ھیں ، تو بندے کا خدا سے کیا مقابلہ ؟ حقوق اللہی کا ضیاع اکثر سہو اور غفلت اور نادانی اور کوتاہ اندیشی کی وجہ سے ھوتا ھے ، اور امید ھے کہ خداوند غفور و رحیم بندوں کے ضعف پر نظر فرما کر ان کے قصور معاف کرے ، اور کرے گا ؛ مگر حقوق العباد کا یہ حال نہیں ھے ۔ اس میں ایک بندہ زور سے ، ظلم سے ، ھیکڑی سے ، زبردستی سے دوسرے بندے کو ستاتا ، اس کا دل دکھاتا ، اس کو ایذا پہنچاتا ھے اور اس قصور کا معاف کرنا نہ کرنا اسی بندۂ مظلوم کے اختیار میں ھے ؛ مگر انصاف کرو دنیا میں کتنے لوگ اس کی پروا کرتے ھیں ۔ لاکھوں مظلمے ھیں جن کو بندگان خدا مرتے وقت اپنے سروں پر لاد کر لے جاتے ھیں ۔ بات یہ ھے کہ دین کو کھیل اور مذھب کو ھنسی سمجھ رکھا ھے ۔ منہ سے کہتے ھیں کہ مرنا برحق ، نکیرین[۲۵] کے ساتھ سوال و جواب کا ھونا برحق ، عذاب قبر برحق ، قیامت برحق ، مرے بعد پھر زندہ ھونا برحق ، رتی رتی کا حساب دینا برحق ، جنت برحق ، دوزخ برحق اور

---

۲۵ - قبر کے فرشتوں کو نکیرین کہتے ھیں* -

کردار حق تھو[۲۶] ! سید حاضر ! مجھ میں تم میں قرابت کا ایک تعلق ھے اور جیسا میں نے تم سے کہا ، تعلق سے پیدا ھوتے ھیں حقوق اور فرائض ۔ میں اس کو اپنا فرض تعلق سمجھتا تھا کہ تمھارے فرائض کو تم پر بالاجمال ظاھر کردوں ، سو میں نے اپنا فرض ادا کیا ۔'' یہ کہہ کر متقی بھانجے سے رخصت ھوا اور چلتے چلتے کہہ گیا کہ افسوس ھے سید ناظر سے ملاقات نہ ھوئی ، ان شاءاللہ پھر کسی دن آؤں گا ۔'' میر متقی نے اچھے خاصے پھر سوا پھر سید حاضر کے ساتھ باتیں کیں ۔ اس تمام وقت میں سید حاضر کا یہ حال تھا کہ ماموں کے منہ پر اس کی ٹکٹکی بندھی ھوئی تھی اور ھمہ تن گوش ھوکر ان کی باتوں میں مستغرق تھا ۔ جو لفظ ماموں کے منہ سے نکلتا اس کے دل میں کالنقش فی الحجر بیٹھتا چلا جاتا ۔ حاضر کے کان مطلقاً ایسی باتوں سے آشنا نہ تھے ، اس پر میر متقی کا بیان کہ گویا ایک دریا ھے کہ موجیں مار رھا ھے یا ریل ھے کہ فی گھنٹہ سو میل کی رفتار سے دوڑ رھی ھے یا بھری برسات میں ساون بھادوں کا بادل ھے کہ امڈا چلا آ رھا ھے ، اور پھر باتیں ، کھری سچی ستھری جن میں ذرا اونچ نیچ نہیں ۔ دنیا کے فایدوں کی ضامن ، دین کی درستی کی کفیل ، بھلائی کی اصلاح ، بہتری کا مشورہ ۔ سید حاضر بت کی طرح چپ بیٹھا سنتا رھا ۔ اگرچہ گاؤں کا کام کاج کرتا تھا ، مگر کون سا گاؤں؟ سید نگر! جہاں کے پرچونئے ساھوکاروں کے ، شکمی کاشتکار تعلقہ داروں کے ، جاھل محض لیاقت شعاروں کے ، اھل مقدمہ وکیل مختاروں کے کان کترتے تھے ، مگر متقی نے اتنا کچھ کہا اور سید حاضر سے چوں کرتے نہ بن پڑی ۔

---

۲۶ - یعنی کردار تھوکنے کے قابل* ۔ (اس معنی میں 'حق تھو' نہیں بلکہ 'آخ تھو' کہتے ھیں ۔

دسویں فصل

سید حاضر کا میر متقی کے وعظ سے متاثر اور متنبہ ہو کر بہن کو اُس کا حق دینے پر آمادہ ہونا اور دونوں بھائیوں کی اسی بات پر باہمی رنجش

میر متقی کے چلے جانے کے بعد بھی سید حاضر دیر تک سکتے کے عالم میں تھا ۔ اپنے یہاں کے معاملات میں سے جس معاملے پر نظر کرتا تھا ، کسی کو دغل فساد سے ، اتلاف حقوق‌العباد سے ، خالی نہیں پاتا تھا ۔ جن باتوں پر اس کو بڑا ناز تھا اب اس کی نظر میں نہایت ذلیل اور پاجی پن کی دلیل معلوم ہوتی تھیں ۔ وہ گھبرایا ہوا دالان میں ٹہل رہا تھا اور اس قدر بےقرار تھا کہ جاڑے کے دن اور شام کا وقت اس کو پسینے پر پسینے چلے آتے تھے ، اور دیکھتا تھا کہ کھانا اور پینا اور اوڑھنا اور بچھونا اور سامان اور مال و متاع اور نقد و جنس حتیٰ کہ اپنا گوشت پوست ، کوئی چیز بھی لوث حرمت سے پاک نہیں ۔ پاتا تھا کہ بدکرداری اور بد معاملگی ہماری برادری اور ہمارے خاندان میں ابا عن جد[1] چلی آتی ہے ۔ اگرچہ حاضر و ناظر دونوں ، باپ کے مرنے سے معاملات کرنے لگے تھے ، مگر حاضر

---

۱ ۔ یعنی یہ بطور میراث باپ دادا سے متوارث چلی آتی ہے ۔

نے احتساب کیا تو اتنے ہی دنوں میں صد ہا مظلمے ان کے نامۂ اعمال پر چڑھ چکے تھے اور ان میں اکثر ایسے تھے جن کا تدارک محال تھا اور تلافی ناممکن ۔ ہم کو حاضر کی اتنی ہی بات سے تعلق ہے کہ جہاں اس کو اپنے وقت کے اور بہت سے معاملے یاد آئے ان میں سے ایک معاملہ غیرت بیگم کا بھی تھا ۔ اگرچہ غیرت بیگم کے معاملے میں ابتداءً تحریک ناظر کی طرف سے ہوئی اور اسی کو اس میں زیادہ اصرار بھی تھا، مگر پھر بھی حاضر کا اتنا قصور تو تھا ہی تھا کہ بڑا بھائی ہو کر اس نے ناظر کر سمجھایا نہیں ۔ غیرت بیگم کا خیال آنا تھا کہ فوراً گھوڑا کسوا ، سوار ہو ، راتوں رات شہر میں ناظر کے مکان پر جا دستک دی ۔ اگلے دن کسی مقدمے کی پیشی تھی اور ناظر آدھی رات تک گواہوں کی تعلیم[۲] اور کاغذات کی درستی میں مصروف تھا ۔ ابھی اچھی طرح نیند بھری نہ تھی کہ بھائی کی آواز سن کر چونک پڑا اور لگا پوچھنے ''خیر تو ہے ! آپ ایسے سویرے کیونکر آئے،'' حاضر ''خیر ہے ، تم باطمینان وقتی ضرورتوں سے فارغ ہو لو تو میں اپنے آنے کی وجہ بیان کروں ، گھبرانے کی کوئی بات نہیں ۔'' تھوڑی دیر بعد جب دونوں بھائی ایک جا ہوئے تو حاضر نے پوچھا ''چھوٹے ماموں آئے ہیں ، تم ان سے ملے ؟'' ناظر ''ماموں کا آنا تو مجھ کو معلوم ہوا ، مگر میں ملا نہیں اور ملنے کا ارادہ بھی نہیں ۔'' حاضر ''کیوں؟'' ناظر ''میں جانتا ہوں ، وہ آپا کا جھگڑا ضرور نکالیں گے اور مجھ کو کسی طرح آپا کا حصہ دینا منظور نہیں ۔ بے فایدہ باتوں ہی باتوں میں تکرار ہو پڑے گی ۔'' حاضر ''کیوں بے چاری غیرت نے ایسا قصور کیا کیا ؟ کیا وہ ہماری حقیقی بہن اور متروکۂ پدری میں عنداللہ

---

۲ ۔ گواہوں کو سکھانا پڑھانا ، تاکہ جرح میں اکھڑ نہ جائیں ۔

اور عندالرسول حقدار نہیں ہے؟'' حاضر کے منہ سے یہ سوال سن کر ناظر کے کان کھڑے ہوئے ۔ آدمی تھا معاملہ فہم، معاملہ شناس، فوراً تاڑ گیا کہ بھائی ماموں سے ملے اور ماموں نے پٹی پڑھائی ۔ تو کہتا کیا ہے کہ ''اگر ماموں کوئی فتویٰ مکے سے لکھوا کر لائے ہوں تو اس کو اپنی قدوری[۳] میں چپکا رکھیں ۔ ان کو شاید یہ معلوم نہ ہوگا کہ یہاں شریف مکہ[۴] کا حکم نہیں چلتا ، انگریز بہادر کی عملداری ہے ۔ میں نے برسوں کی جستجو میں پریوی کونسل اور عدالت ہائے عالیہ ہائی کورٹ اور چیف کورٹ اور جوڈیشل کمشنر کے فیصلوں اور میکناٹن اور سرہنری لا کی شرع محمدی سے وہ وہ نظائر اور احکام چھانٹ رکھے ہین کہ اگر آپا سے جہیز واپس نہ کرا لوں تو سید نہیں چار'' حاضر کو بھی بھائی کی اس قدر خشونت دیکھ کر نہایت استعجاب ہوا ، کیونکہ اس نے آج تک حاضر کے رو در رو ایسی شوخ چشمی کے ساتھ کبھی بات نہیں کی تھی ، اور بولا کہ ''تم ماموں سے ناحق بدگمان ہوتے ہو، میں اُن سے ملا بے شک ، اور وہ تعزیت کے لیے سید نگر تشریف لے گیے بلا شبہ ، مگر غیرت بیگم کا نام تک ان بے چارے نے نہیں لیا اور افسوس ہے کہ تم نے ان کی شان میں خورد ہو کر اس قدر گستاخی کی اور وہ بھی غائبانہ ؛ پس تم نے ایک بزرگ کا حق تلف کیا ۔'' ناظر ''انھوں نے آپا کا نام نہ لیا ہوگا الکنایۃ[۵] ابلغ من الصراحۃ ، اور فرض کیا کہ میں نے گستاخی کی تو قانون نے صرف ایک ہی گستاخی کو جرم قرار دیا ہے ، یعنی حاکم عدالت کے ساتھ گستاخی کرنا

---

۳ - علم فقہ کی ایک کتاب کا نام ہے* ۔

۴ - ترکوں کے عہد میں حاکم مکہ کا لقب ۔

۵ - یعنی بعض اوقات صراحت سے اشارہ زیادہ مؤثر ہوتا ہے* ۔

جبکہ وہ عدالت کا اجلاس کر رہا ہو ، اور ظاہر ہے کہ مامون اس کے مصداق نہیں ہو سکتے ۔'' ناظر کے اس جواب سے حاضر کو سید متقی کی اس بات کی تصدیق ہوئی کہ حکام ظاہر کے انتظام سے پورے طور پر حقوق العباد کی حفاظت نہیں ہو سکتی ۔ سید متقی کے وعظ سے سید حاضر کے خیالات دفعۃً اس قدر متبدل ہوگیے تھے کہ دونوں بھائیوں میں التیام کا ہونا محال تھا ۔ ناظر اپنے اُسی پرانے موروثی ڈھرے پر چلتا تھا کہ قانونی گرفت بچا کر جہاں تک اور جس طرح ممکن ہو اپنا فایدہ کرنا چاہیے ۔ کسی کا حق تلف ہو تو مضائقہ نہیں ، کسی کا دل دکھے تو پروا نہیں ، عاقبت تباہ ہو تو کچھ حرج نہیں اور سید حاضر کو اب اس بلا کا اہتمام تھا کہ ایک غیبت کو بھی وہ اتلاف حق سمجھا ۔ غرض یہ جو سنا کرتے تھے کہ الدنیا والدین ضرتان[۶] ۔ یا ــــــ

هم خدا خواهی و هم دنیائے دوں
ایں خیال ست و محال ست و جنوں[۷]

اب وہ معما حل ہوا کہ حقیقت میں وہ یہ دنیا ہے کہ جیسی ناظر کی تھی ، جس میں حلال و حرام کا امتیاز نہیں ، جائز و ناجائز کا تفرقہ نہیں ، خدا و رسول کا خوف نہیں ، روز قیامت کا اندیشہ نہیں ۔ ناظر کی اتنی ہی باتوں سے حاضر کو پورا تیقن ہو گیا کہ اس کو سمجھانا یا اس کے ساتھ بحث کرنا محض بے سود اور لاحاصل ہے ۔ اس پر قانون کی پھٹکار ہے اور اس کے سر پر پڑھا

---

۶ ۔ دنیا اور دین دو سوکنیں ہیں* ۔

۷ ۔ پہلے ایڈیشن میں اس کے بعد 'یا' کے ساتھ رباعی کا ایک شعر اور ہے :

دنیا خواهی و دیں همی طلبی ایں ناز بخانۂ پدر باید کرد

دوسرے ایڈیشن میں مصنف نے یہ شعر حزف کر دیا ۔

ہوا جن سوار ہے ، اس لیے زیادہ رد و کد مناسب نہ سمجھ کر اس نے دو ٹوک بات ناظر کو سنا دی کہ ''تم اُس کو ماموں کا اغوا سمجھو یا میرا حمق ، میں تو غیرت بیگم کا حق اب ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رکھ سکتا۔'' ناظر ''دیکھیے ایسا کیجیے گا تو مجھ سے آپ سے بگاڑ ہو جائے گا۔'' حاظر ''اگر اتنی ہی بات پر کہ میں ایک حق دار کا حق مارنا نہیں چاہتا ، تم مجھ سے بگڑو تو تمھاری خوشی۔ اگرچہ تمھارے بگڑنے کا مجھ کو سخت افسوس ہوگا ، مگر اُس سے ہزار درجے زیادہ افسوس ہوگا اگر غیرت بیگم کا حق غصباً میرے پاس رہے۔'' ناظر ''یہ آپا کی خصوصیت کیا ہے؟'' حاضر ''خصوصیت پوچھو تو وہ ہماری حقیقی بہن ہے ، مگر ایصال حق کے لیے اُس کی مطلق خصوصیت نہیں ، ان شاءاللہ سب حق داروں کے ساتھ میں ایسا ہی معاملہ کروں گا۔'' ناظر '' تو آپ سیدھی بات یہی کیوں نہیں کہتے کہ آپ ترک دنیا پر آمادہ ہیں۔'' حاضر ''اگر مغصوبات کا واپس کر دینا تمھارے نزدیک ترک دنیا ہے تو مجھ کو اس سے انکار نہیں۔'' ناظر ''بیٹھے بٹھائے یہ آپ کو ہوا کیا ہے ! پہلے تو میں ماموں کو مولوی اور حاجی اور جیسا ان کا نام ہے متقی سمجھتا تھا ، اب معلوم ہوا کہ تسخیر یا سحر کے بھی عامل ہیں۔'' حاضر ''ماموں کی شان میں تمھاری طرف سے یہ دوسری گستاخی اور دوسری غیبت اور دوسرا اتلاف حق ہے۔'' ناظر ''میں آپ کو آگاہ کیے دیتا ہوں کہ یہ گھر کی تباہی کے سامان ہیں۔'' حاضر ''جس گھر کی آبادی دوسروں کے حقوق کے غصب کرنے پر موقوف ہو اس کا تباہ ہونا بہتر ہے۔'' ناظر ''آپ نے انجام کار پر بھی نظر کر لی ہے ؟ '' حاضر ''انجام کار پر نظر کرنا ہی مجھ کو تو اس ارادے کا باعث ہوا ہے۔'' ناظر ''تو آپ مجھ کو بھی اپنے ساتھ برباد کرتے ہیں۔ کیسی کیسی

تدبیروں سے میں نے ملکیت کو درست کیا ، اب ایک ڈھنگ پر آ چلی تھی تو آپ ساری عمارت کو جڑ بنیاد سے ڈھائے دیتے ہیں۔'' حاضر ''کیا تم نے مجھ کو مجنوں قرار دیا ہے یا مخبوط الحواس سمجھا ہے ؟ دنیا میں کوئی شخص بھی ایسا ہے جو دیدہ و دانستہ اپنے پاؤں میں آپ کلہاڑی مارے یا سمجھ بوجھ کر اپنے رہنے کے مکان میں آپ آگ لگائے ؟ فرق صرف اتنا ہی ہے کہ اس بات کا میں نے قطعی فیصلہ کر لیا ہے کہ دنیا کو دین پر ترجیح نہ دوں اور جس دنیاوی فائدے میں دین کا ضرر ہے اس کی طمع نہ کروں ۔ اگر ایسا کرنے سے میری دنیا برباد ہوتی ہو تو ہو اور اگر مجھ پر دنیاوی تباہی آتی ہے تو آئے ۔ جب میں نے دین کے خلاف دنیاوی فائدے کا لالچ نہ کیا تو دنیاوی نقصان کی میں کیا پروا کر سکتا ہوں ۔ ناظر ! میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میں تمہارے فائدوں کو بہت ہی عزیز رکھتا ہوں ، مگر وہیں تک کہ وہ فائدے جائز طور پر حاصل کیے جائیں ۔ غصب اور ظلم اور دغا اور فساد اور اتلاف حقوق العباد کو نہ میں اپنے لیے جائز رکھتا ہوں اور نہ تمہارے لیے ۔'' ناظر ''یہی تو میں کہتا ہوں کہ آپ پر ماموں نے جادو کیا'' حاضر ''اگر تمہارے نزدیک یہ جادو ہے تو یہی جادو تمام پیغمبر صلواۃ اللہ وسلامہ علیہم اجمعین[۸]، تمام اولیاء ، تمام انبیاء ، تمام اتقیاء کرتے آئے ہیں ، مگر جادو ایک مکروہ لفظ ہے اس کا استعمال بزرگان دین کے حق میں میرے نزدیک تو درست نہیں۔'' ناظر ''اچھا تو ایک کام کیجیے ، آپ اپنے حصے کا بٹوارہ کرا لیجیے اور علیحدہ ہو جائیے ۔'' حاضر ''میرا ذہن اس طرف منتقل ہوا تھا ، مگر اس صورت میں مشکل یہ ہے کہ جب تک ملکیت تمام مظالم سے پاک نہ ہو ، میں اس میں سے حصہ لے

---

۸ - اُن سب پر خدا کی رحمت اور سلامتی ہو ۔

نہیں سکتا ۔'' ناظر ''آپ نے ساری ملکیت کا ٹھیکہ نہیں لیا ۔ اپنے مذہب کے رو سے حصہ پدری میں سے جتنا حصہ آپ اپنا سمجھتے ہوں الگ کر لیجیے ۔'' حاضر ''والد مرحوم کی جگہ میرا اور تمہارا اور غیرت بیگم تینوں کا نام لکھا جانا چاہیے ۔ للذکر[۹] مثل حظالانثیین ۔ ہم دونوں نے ناحق اور ناروا بہن کو محروم کر کے اپنے ہی نام چڑھوائے تو نصف نصف ہم دونوں کا ہوا ، بس سرکاری کاغذات میں میرا نصف حصہ لکھا ہے ، اس میں بھی تو غیرت بیگم کا ایک عشر[۱۰] شامل ہے جس کو میں اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتا ۔'' ناظر ''آپ بٹوارے کی درخواست میں لکھ دیجیے کہ اگرچہ میرے نام نصف حصہ لکھا ہے، مگر حقیقت میں میرا دو خمس ہوتا ہے ، اسی قدر کا میں بٹوارہ چاہتا ہوں ۔ حاکم آپ کی درخواست تصدیق کر کے آپ کے دو خمس کا بٹوارا کر دے گا ۔'' حاضر ''تو غیرت بیگم کا یہ ایک عشر بھی تمہاری طرف منتقل ہو جائے گا ؟'' ناظر ''آپ کا اس میں حرج کیا ہے ؟ غیرت بیگم کا مطالبہ میرے سر رہے گا ۔'' حاضر ''تو اس کے یہ معنی ہیں کہ میں غیرت بیگم کا ایک عشر جو میرے نام ہے ، تمہارے نام منتقل کر دوں ؟'' ناظر ''خیر معنے مطلب تو میں سمجھتا نہیں ، ایک راہ کی بات جو میں نے آپ کو بتائی ، اگر آپ کو مجھ سے پرخاش نہیں ہے تو جس طرح میں نے بیان کیا درخواست لکھئے اور پیش حاکم اس کو چل کر

---

۹ - مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے* -

۱۰ - قانون وراثت کی رو سے جایداد کا خمس ، یعنی ۵/۱ غیرت بیگم اور دو دو خمس (۵/۲) دونوں بھائیوں کو ملنا چاہیے، لیکن بہن کو اس کے حق سے محروم کر کے بھائیوں نے جایداد کا نصف نصف حصہ لے لیا - اس طرح ہر بھائی کے حصے میں بہن کے حصے (۵/۱) کا نصف ، یعنی ایک عشر (۱۰/۱) شامل ہے -

تصدیق کرائیے ۔ باقی مراتب میں دیکھ بھال لوں گا ۔ آپ کو وہی دو خمس ملے گا جو آپ چاہتے ہیں ۔'' حاضر ''غیرت بیگم کا ایک عشر میں تمہارے نام تو منتقل نہیں کرا سکتا ، وہ بھی تو ناجائز ہے ۔ حق‌دار کو تو اس کا حق نہ ملا ۔ ہاں اگر کہو تو درخواست میں یہ بات بیشک لکھ دوں کہ میرے نام جو نصف حصہ لکھا ہے اس میں دو خمس میرا ہے اور ایک عشر غیرت بیگم کا ۔'' ناظر ''اس سے تو میری نصفی میں فتور پڑے گا ۔'' حاضر ''پڑے گا تو تم جانو ، میرے اختیار کی بات نہیں ۔'' ناظر ''آپ کے اس اصرار سے ثابت ہوتا ہے کہ صرف تقاضائے دین داری نہیں ہے ، بلکہ ماموں کے سب فساد ہیں ۔'' حاضر ''تم بار بار ہر پھر کر ماموں کو ان کی پیٹھ پیچھے برا کہتے جاتے ہو ، مجھ کو اس بات سے سخت تکلیف ہوتی ہے ۔ میں نے تم سے کہا کہ ماموں نے غیرت بیگم کا نام تک نہیں لیا اور تم نے میرے کہنے کو سچ نہ جانا ۔ فرض کرو ماموں ہی نے مجھ کو غیرت بیگم کا حق مغصوب واپس کر دینے پر آمادہ کیا ، تو کیا احقاق حق میں کوشش کرنا فساد ہے ؟'' ناظر یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا ''بہت خوب ، معلوم ہوا ! آپ آپا کو اُن کا حصہ دیجیے اگر آپ سے دیا جائے ، اور وہ لیں اگر ان سے لیا جائے ۔ اور ماموں جس غرض سے بھانجی کی خوشامد میں لگے ہیں مجھ کو معلوم ہے ۔ مبتلا بھائی کو انھوں نے دیکھ پایا ہے بھولا بیوقوف: چاہتے ہیں کہ بھانجی کے نام سے بڑے ماموں کی تمام املاک پر خود قابض ہو جائیں ، لیکن (موچھوں پر تاؤ دے کر) اگر ناظر کے دم میں دم ہے تو ماموں کو ایسا مزا چکھاؤں کہ سات برس بعد تو حج سے پھر کر آنا نصیب ہوا ، اب ان کو ہجرت ہی کرنی پڑے تو سہی ۔ آپا کا حصہ لینا ایسا کیا ہنسی کھیل ہے؟''

حاضر بے چارہ اپنا سا منہ لے کر سید نگر واپس گیا؛ غمگین اداس ۔ کیا خدا کی شان ہے کہ کل شاموں شام سید متقی کے وعظ سے حاضر متنبہ ہوا ، توبہ کی ، تلافی مافات پر آمادہ ہوا ، راتوں رات بھاگا ہوا بھائی پاس آیا ، ابھی جی کھول کر بھائی سے باتیں نہیں کرنے پایا تھا کہ سخت امتحان میں پکڑا گیا ۔ وہ خوب واقف تھا کہ ناظر ایک سانپ ہے ، اس بلا کا زہریلا کہ اس کا کاٹا پانی نہ مانگے ، اس کا ڈسا ہوا پھٹکا نہ کھائے ۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ناظر اگر بگڑا ، اور اب اس کے بگڑنے میں کسر ہی کیا باقی تھی ، تو کیسی زمینداری اور کس کی حصہ داری ، گاؤں کا رہنا دشوار کردے گا اور اس کے ہاتھوں سے زندگی و بال دوش ہو جائے گی ۔ یہ خیال کر کے وہ جی ہی جی میں اپنے آپ کو سمجھاتا تھا کہ تجھ کو بھائی کے ساتھ بگاڑنا کیا ضرور ہے ۔ اگر وہ غیرت بیگم کا حصہ نہیں دیتا نہ دے ، وہ جانے اس کا کام جانے ۔ اپنا اپنا کرنا اپنا اپنا بھرنا ۔ غیرت بیگم کو حصہ لینا ہو گا تو آپ سے آپ نالش کریں گی ۔

ع ۔ ہر کسے مصلحت خویش نکو می داند[۱۱] ۔

میری طرف سے اتنا ہی کافی ہے کہ ابھی سے غیرت بیگم کے حصے سے دست بردار ہو جاؤں اور اگر نالش ہو تو دعوے کی تردید نہ کروں ۔ پھر سوچتا تھا کہ اب تک جو غیرت بیگم حصے سے ۔ دخل رہیں اس کا وبال جیسا ناظر پر ویسا مجھ پر ، کیونکہ ہم دونوں نے مل کر غیرت بیگم کو محروم کیا ، بلکہ ایک اعتبار سے مجھ پر زیادہ اور ناظر پر کم ، کیونکہ میں پٹی کا نمبر دار ہوں اور پٹی کی تحصیل وصول میرے ہاتھوں سے ہوتی ہے ۔ علاوہ

---

۱۱ - ہر شخص اپنی مصلحت کو خوب سمجھتا ہے ۔

اس کے کیا یہ انصاف کی بات ہے کہ ہم دونوں بھائی تو بے زحمت اپنے حقوق پر قابض ہوں اور غیرت بیگم کو نالش کرنے پر مجبور کریں ، صرف اس وجہ سے کہ وہ عورت ہے پردہ نشین ، اور کوئی اس کے حق کی حفاظت کرنے والا نہیں ۔ دنیا میں آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لی تو خدا کو کیا جواب دیں گے ، اور مانا کہ میں غیرت بیگم کے حصے سے دست بردار ہو بیٹھا تو وہی بات پھر آئی کہ میں نے نہ لیا ناظر کو لینے دیا ۔ غیرت بیگم کو تو اُس کا حق نہ پہنچا ۔ علاوہ ازیں آج تک تو ایک غیرت بیگم کا معاملہ ہے ، اُس میں یہ حجت ہے ؛ ابھی تو ایسے ایسے صدھا معاملے نکلیں گے ؛ غرباء کے ، ضعفاء کے اور ایسے لوگوں کے جن کو سوا خدا کہیں پناہ نہیں ، اور ناظر کا منشاء تو معلوم ہو چکا کہ وہ تو سوائے قانون کے خدا اور رسول کسی سے ڈرنے دبنے والا نہیں ، تو بکری کی ماں کب تک خیر منائے گی؟ بھائی سے تو ایک نہ ایک دن بگڑے ہی گی ، اور آج اگر غیرت بیگم کے معاملے میں میں نے ذرا بھی اپنا ضعف ظاہر کیا پھر تو ناظر کی جیت ہے ۔ غرض یہ تزلزل ٹھیک نہیں ، بلکہ وسوسۂ شیطانی ہے ۔

گیارھویں فصل

سید حاضر نے بہ تقصائے دین داری علی رغم انف سید ناظر اپنی بہن کو اُس کا حق دلایا

ایسے ابتلاء کے وقت میں خدا نے حاضر کی مدد کی ۔ اس کو معلوم تھا کہ ناظر کے پاس سادہ اسٹامپ کا ایک بستہ ھے ، آخر ڈھونڈنے سے ملا ۔ کھول کر دیکھتا ھے تو اُس میں پرانے پچھلے سنوں کے متعدد قطعات ھیں ۔ سمجھا کہ ناظر نے کسی ارادۂ فاسد سے ان کو بہم پہنچایا ھے ۔ اس نے اٹھنی کا ایک قطعہ نیا سا دیکھ کر تو لے لیا اور باقی اس فساد کی پوٹ کو چولھے میں جھونک دیا ۔ جو قطعہ اس نے نکال لیا تھا اس پر ایک درخواست لکھی جس کی عبارت یہ تھی : (نقل درخواست) ”میں اور سید ناظر اور غیرت بیگم تینوں حقیقی بھائی بہن ھیں ۔ غیرت بیگم کا نام پٹی داری میں داخل ھونے سے رہ گیا ۔ میں پٹی کا نمبر دار ھوں اور میرے ھاتھوں پٹی کی تحصیل وصول ھوتی ھے ۔ غیرت بیگم کے حق اور قبضے کو میں تصدیق کرتا ھوں ، اس لیے غیرت بیگم کا نام ایک خمس حصے پر چڑھا دیا جائے ۔“ اور اسی وقت درخواست کو رجسٹری کرا حاکم پرگنہ کے نام روانہ کر دیا ۔ وھاں سے معمول کے مطابق اشتہار جاری

ہوا ۔ اشتہار کا آنا تھا کہ سید ناظر نے عذرداری کی ، مقدمہ لڑنے لگا ۔ کلکٹری میں تو سرسری کارروائی ہوتی ہے ، اور صرف قبضہ دیکھا جاتا ہے ۔ چونکہ نمبر دار پٹی نے ، جس کے ہاتھ سے پٹی کی تحصیل وصول تھی ، غیرت بیگم کے قبضے کی تصدیق کی ، اس سبب سے ناظر کی عذر داری نا منظور اور غیرت بیگم کا نام ایک خمس پر داخل ہونے کا حکم ہوگیا ، مگر سید ناظر محکمہ کلکٹری کو کیا مال[1] سمجھتا تھا ؟ جس وقت داخل خارج کا حکم پہنچا تو اس کے مختار نے تسلی کے طور پر اس سے کہا کہ نمبردار کے بیان مجرد پر حکم ہو گیا ہے؛ یہ حاکم کی رائے ہے ، اپیل کی بڑی گنجائش ہے ۔ ناظر نے کہا ''ارے میاں ! کہاں کی اپیل اور کس کا مرافعہ ، کل تو نہیں پرسوں تم کو والد کا تحریری وصیت نامہ لا کر دیتا ہوں ۔ اس کی بنیاد پر اثبات حقیت کا دعویٰ (خاک از تودۂ کلاں بردار[2]) دیوانی میں دائر کرو تو نمبر دار صاحب کی ساری شیخی کرکری ہو جائے گی ۔ ناظر وصیت نامہ لینے گھر دوڑا ہوا آیا اور اسٹامپ کے بستے کی تلاش میں سیدھا کوٹھری میں گھسا ، بستہ ندارد ۔ اس کا ماتھا ٹھنکا ۔ معلوم ہوا کہ ایک بستہ تو بڑے میاں کوئی ڈیڑھ مہینہ ہوا جلا چکے ہیں ۔ یہ سنتے ہی پیٹ پکڑ کر بیٹھ گیا ۔ حاضر ناظر کا

---

۱ - یعنی کوئی چیز نہ سمجھتا تھا ۔ یہاں لفظ 'مال' ایک خاص رعایت سے استعمال کیا گیا ہے ۔ کلکٹر (یعنی ڈپٹی کمشنر ، حاکم ضلع) اور اس کے ماتحتوں (ڈپٹی کلکٹر ، افسر مال ، تحصیلدار وغیرہ) کی عدالتیں ، عدالت مال (ریونیو کورٹ) کہلاتی ہیں ۔

۲ - مٹی ہی اٹھانی ہے تو بڑی ڈھیری سے اٹھاؤ ، یعنی کوئی عیب ہی کرنا ہے تو پھر چھوٹا یا معمولی عیب کیوں ہو ؛ کیوں نہ جعلی وصیت نامہ تیار کر کے دیوانی میں پوری جایداد کے حق ملکیت کا دعویٰ دائر کیا جائے !

جھگڑا ھمارے قصے سے متعلق نہیں ھے ؛ خلاصہ یہ کہ دونوں بھائیوں میں ایسی چلی ایسی چلی کہ سید نگر والوں میں بھی جو سنتا دانتوں میں انگلی رکھ لیتا تھا ۔ قاعدہ ھے کہ آٹے کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ھے ؛ سیدحاضر کے ساتھ غیرت بیگم اور غیرت بیگم کی لپیٹ میں سید متقی کی بھی شامت آئی ۔

بارھویں فصل

سید ناظر کے فسادات ، میر متقی کی نسبت عرضی گم نام، میر متقی کے سمجھانے سے اصلاح ذات البین کا ھونا

ناظر کو شروع میں صرف اسی پر اصرار تھا کہ غیرت بیگم کو حصہ نہ دوں ۔ سٹامپ کے بستے کا جلانا سن کر وہ بھائی پر نہایت برافروختہ ھوا ، اور اس نے دیوانی میں سالم حقیت پدری کا دعویٰ دائر کیا ، اس بیان سے کہ نہ حاضر میر باقر کا بیٹا ھے اور نہ غیرت بیگم میر باقر کی بیٹی ۔ اس نے بات یہ بنائی کہ میر باقر کا اکلوتا بیٹا میں ھوں ۔ میرے پیدا ھونے میں دیر ھوئی تو میر باقر لے پالک کے طور پر حاضر کی پرورش اور پرداخت کرنے لگے ، اور اس بیان کی تائید میں سٹامپ کے کاغذ پر ایک وصیت نامہ پیش کیا جس پر میر باقر کی مہر تھی اور اس کا سواد خط بھی میر صاحب کے خط سے اشبہ ۔ میر متقی کی نسبت ایک گم نام عرضی لفٹینٹی میں پہنچی کہ سلطان روم[1] کی طرف سے جاسوس بن کر آئے ھیں اور لوگوں کو چپکے چپکے جہاد کی ترغیب دیتے ھیں اور عنقریب ھندو مسلمانوں میں ان کے اغوا سے فساد عظیم ھونے والا ھے ۔

---

۱ - روم سے ترکی مراد ھے - چونکہ یہ علاقہ مسلمانوں سے پہلے رومیوں کے قبضے میں تھا اس مناسبت سے ایک مدت تک ملک روم کہلاتا رھا -

سید حاضر کو جب دیوانی کے دعوے کا حال معلوم ہوا تو عرضی دعوے کی نقل لے کر سید متقی کے پاس دوڑا ہوا آیا۔ سید متقی کو اس وقت تک داخل خارج کے سوا کچھ حال معلوم نہ تھا، دور سے حاضر کو دیکھتے ہی خوش ہو کر لگے تحسین و رضا کی باتیں کرنے۔ حاضر نے پاس آ کر ناظر کے عرضی دعوے کی نقل دکھائی تو انالله وانا الیه راجعون کہہ کر ایسے سناٹے میں گیے کہ بہت دیر ہوگئی اور بھلا یا برا کوئی لفظ ہی منہ سے نہ نکالا تو حاضر نے خود ابتدا کی اور کہا کہ میں اس غرض سے حاضر ہوا تھا کہ میں تو اپنے میں ناظر کے مقابلے کی طاقت نہیں پاتا۔ عزت کو، آبرو کو، سچائی کو، دین کو، ایمان کو، خوف خدا کو، سب کو ایک دم سے بالاے طاق رکھ دوں تو ناظر کے ساتھ لڑنے کا نام لوں اور یہ مجھ سے اب نہیں ہو سکتا۔ ہر چند رہ رہ کر غصہ آتا ہے اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اس مردک کو اسی قانون سے جس پر اس کو بڑا گھمنڈ ہے، اس کے کیے کی ایسی سزا دلواؤں کہ ساری عمر اس کو قید سے نجات نہ ہو اور اس کی تدبیریں سمجھ میں آتی ہیں اور میرے اختیار کی بھی ہیں۔ ناظر کتنا ہی قاعدہ داں اور ضابطہ شناس کیوں نہ ہو، آخر ہے تو مجھ سے چھوٹا، لیکن آپ کے ارشاد کے مطابق میں خدا سے عہد کر چکا ہوں کہ دنیا کے لیے دین کو نہیں بگاڑوں گا۔ اب دنیا میں ایک فضیحت نہیں ہزار فضیحت اور ایک نقصان نہیں ہزار نقصان کیوں نہ ہو جائیں اس عہد کو تو میں توڑ نہیں سکتا، مگر ناظر کے حملے سے بچنے کے لیے میں نے ایک تدبیر سوچی ہے کہ میر غالب کو تو آپ جانتے ہوں گے، وہ بھی ان دنوں سید نگر کے بڑے چلتے ہوئے پرزوں[۲] میں ہیں۔ سید نگر

---

۲ - بہت زیادہ ہوشیار اور تیز طرار آدمی کو چلتا پرزہ کہتے ہیں۔ یہاں 'ہوئے' زاید اور خلاف محاورہ ہے۔

خاص میں ان کا بھی تھوڑا سا حصہ ہے - ان کی وکالت آج کل بڑے زوروں پر ہے - چند روز ہوئے مجھ سے کہتے تھے کہ اگر کوئی حصہ بکتا ہو تو مجھ کو خبر کرنا ، تو میں نے یہ تجویز سوچی ہے کہ اپنا حصہ ان کے ہاتھ فروخت کر دوں - جواب ترکی بہ ترکی ، وہ ناظر سے سمجھ بوجھ لیں گے ، اتنا ہی خیال ہے کہ گاؤں میں حصہ ہے تو رعایا پر سو طرح کی حکومت ہے ، مگر جس طرز پر مجھ کو آئندہ زندگی کرنی[۳] منظور ہے اس کے لیے مجھ کو حکومت درکار نہیں - آپ سے اتنی بات پوچھنی تھی کہ اگر آپ کی صلاح ہو تو غیرت بیگم کے حصے کی بھی بات چیت میں غالب سے کی جائے - میں نہیں سمجھتا کہ غیرت بیگم کو ناظر چیں لینے دے گا - یہ سن کر میر متقی نے کہا کہ ان معاملات کو تم مجھ سے بہتر سمجھتے ہو - قرابت کے اعتبار سے بھی تم نزدیک تر ہو اور تمہارے معاملے کی سچائی کا یہی بڑا ثبوت ہے کہ تم نے بے فریاد بے نالش ، غیرت بیگم کو اس کا حق دیا اور دلوایا اور بلکہ حق کے واسطے تم نے بھائی سے بگاڑی اور اس بگاڑ کے نتائج کی پہلی قسط یہ عرضی ہے جو تم نے مجھ کو دکھائی - خدا ہے اور حق ہے اور وہ حق سے راضی ہوتا ہے اور وہی حق‌داروں کی حمایت کرنے والا ہے اور ان شاءاللہ آخر حق کو غلبہ ہے - الحق یعلو[۴] - اس بات میں تم اپنی بہن سے مشورہ کرو ، لیکن اگر میری رائے پوچھتے ہو تو شروع سے تم نے غلطی کی - تم نے وہ کیا اور آئندہ بھی وہی کرنا چاہتے ہو جو دنیا میں سبھی راست معاملہ کیا کرتے ہیں ، اور بلا شبہ شرع کی رو سے تم پر کوئی الزام

---

۳ - زندگی کرنا (زندگی کردن کا ترجمہ) اب متروک ہے - زندگی بسر کرنا بولتے ہیں -

۴ - سچ کا بول بالا -

ہیں ، مگر الزام کے عاید نہ ہونے سے تم کسی تحسین کے بھی مستحق نہیں ہوسکتے - مجھ سے اگر تم نے پہلے پوچھا ہوتا تو میں یہ صلاح دیتا ، اور اب بھی ..... تم کو اور غیرت بیگم دونوں کو صلاح دیتا ہوں کہ اگر کر سکو تو اپنے اپنے حق سے دست بردار ہو جاؤ - ایسی کون سی بڑی مالیت ہے ؟ خدا نے تم کو بہت کچھ دے رکھا ہے - ناظر کو موروثی کجوانسیاں مبارک ، لے کر وہی بڑے آدمی بنیں - آخر وہ بھی تو کوئی غیر نہیں - گھی کہاں گیا کھچڑی میں ، تین بہن بھائیوں کے پاس نہ رہا ایک کے پاس رہا - بلا شبہ حصہ کو کتنا ہی جزوی کیوں نہ ہو چھوڑنا مشکل ہے ، خصوصاً جبکہ موروثی ہو اور اسی گاؤں کا ہو جس میں رہنا سہنا ہے اور چھوڑنا بھی اس حالت میں کہ گلی گلوچ تک کی نوبت پہنچ چکی ہو ، لیکن تم خود کہتے ہو کہ اب بدون فضیحت کے اس کا سنبھالنا ممکن نہیں - حصہ منتقل کر دینے کی تجویز جو تم نے سوچی ہے صرف من سمجھوتی ہے - آخر اس کی تحقیقات ہو ہی گی ، تمہارے مقابلے میں ہو یا خریدار کے ، کہ تم دونوں میر باقر کی اولاد ہو جیسا کہ واقعی ہے ، یا نہیں ہو جیسا کہ ناظر نے عرضی دعوی میں لکھا ہے - اگرچہ کامل یقین ہے کہ آخر کار تم کو ناظر کے مقابلے میں ظفر ہو گی ، لیکن پھر ہمیشہ کے لیے وہ تم سے چھوٹ جائے گا اور تم اس سے اور مدت العمر تم کو باھمی خرخشوں سے نجات ملنے کی امید نہیں ، مگر جو تدبیر میں بتاتا ہوں اس کا انجام ، جہاں تک میری سمجھ میں آتا ہے ، ان شاء اللہ یہی ہونا ہے کہ حصے کا حصہ تمہارے پاس رہے گا اور تم بھائی بہن پھر ایک ہوجاؤ گے - تھوڑی دیر کے لیے فرض کرو کہ ناظر نے کل حصہ لیا ، مگر اس طرح کہ وہ لینا چاہتا ہے ، یعنی جھوٹ بول کر، جعل بنا کر ؛

بھائی کو ، بہن کو ، ماں کو ، باپ کو ، یعنی اپنے آپ کو رسوا اور فضیحت کرنا کیسا ، صاف صاف گالیاں دے کر ، تو ناظر یہ حصہ لے کر تم کو تو خیر چھوڑ ھی دے گا ، مگر کیا بیوی بچے ، رشتہ دار ، کنبہ دار ، قبیلہ ، برادری ، خاندان ، دوست ، آشنا ، جان پہچان ، ایک دم ساری دنیا کو چھوڑ دے گا ؟ ایسا تو نہیں ہو سکتا ، مگر سمجھتے ہو کہ دنیا اس کو کیا کہے گی ؟ لعنت کرے گی ۔ یگانے اور بیگانے سب اس کے منہ پر تھوکیں گے ۔ لڑکے اس کے پیچھے تالیاں پیٹیں گے ۔ سب کی نظروں میں وہ خوار اور بے اعتبار نکو اور انگشت نما ہوگا ۔ در و دیوار اور کوچہ و بازار سے اس پر پھٹکار برسے گی ۔ یہ حصہ ڈھاک کے کوئلے کا ایک دھکتا ہوا انگارا ہوگا کہ وہ ہرگز اس کو مٹھی میں سنبھال نہ سکے گا ۔ مشکل سے مشکل مقدمات اور پیچیدہ سے پیچیدہ معاملات میں تم ایک مختار وکیل کے کہنے پر عمل کرتے ہو ، اس ایک بات میں خدا کی صلاح پر بھی چل کر دیکھو کہ کیا نتیجہ ہوتا ہے ۔ خدا کی صلاح کیا ہے : ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک وبینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم (یعنی اگر تجھ سے کوئی برائی کرے تو بھلائی کے ساتھ اس کا توڑ کر اور پھر دیکھ کہ یا تو تجھ میں اور اس میں دشمنی تھی یا بات کی بات میں وہ تیرے ساتھ گرم جوشی کرنے لگا) حقیقت میں جیسی میر متقی نے پیشین گوئی کی تھی ویسا ھی ہوا ۔ حاضر اور غیرت بیگم کی طرف سے ناظر کے دعوے کی کچھ تردید نہ ہوئی ۔ قاعدے کے مطابق دعویٰ یک طرفہ ڈگری ہو گیا ، مگر کیسی ڈگری کہ حاکم اور عملے اور اہل معاملہ اور چپراسی اور مذکوری سبھی نے تو ناظر کو ملامت کی ۔ جہاں گیا اس نے لتاڑا اور جس سے ملا اس نے لتھیڑا اور آخرکار ھار کر ، جھک مار کر ، کلنک کا ٹیکہ ماتھے پر لگا کر ، جس

قدر گالیاں تقدیر میں تھیں سن کر ، جتنی بدنامی قسمت میں تھی بھگت کر ، بصد منت و بہزار خوشامد ، ہاتھ جوڑ کر ، پاؤں پڑ کر ، وہی دو خمس حصہ حاضر کو اور وہی ایک خمس غیرت بیگم کو دیا اور ساری عمر کے لیے ناحق بیٹھے بٹھائے بھائی بہن کا کنونڈا بننا پڑا سو الگ ۔

تیرھویں فصل

میر متقی کا مبتلا کو سمجھانا اور اُس کی اصلاح حال میں کوشش کرنا

پچھلے بیانات سے بخوبی ظاھر ھو گیا ھو گا کہ غیرت بیگم کے جتنے معاملات تھے سبھی تو خدا نے میر متقی کے ھاتھ سے درست کرائے ، اور کیسی عمدگی اور خوشی اسلوبی کے ساتھ کہ نہ لڑائی نہ جھگڑا نہ قصہ نہ فساد نہ غل نہ شور ۔ تنخوا ھیں بھی جاری ھوگئیں ، مکانات اور دکانات کا بھی انتظام ھو گیا ۔ ناظر جیسے موذی کے پنجے سے حصہ زمینداری بھی چھٹا ، جس کے چھوٹنے کا کسی کو سان گمان بھی نہ تھا ، مگر ابھی غیرت بیگم کا سب سے بڑا معاملہ باقی تھا ، یعنی اس کے شوھر مبتلا کی اصلاح ، اس کی آوارگی کا علاج ، اس کی بد وضعی کی روک تھام ۔ عورت جب بیاھی گئی تو میاں ھی سے اس کا عیش میاں ھی سے اس کا آرام ، اور میاں ھی سے اس کی توقیر ھے اور میاں ھی سے اس کا اعزاز و احترام ۔ آپس میں پیار اخلاص ھو تو دنیا کی ساری مصیبتیں جھیلی جا سکتی ھیں اور جہاں دلوں میں محبت نہیں ؛ پہننے میں مزہ اور کھانے میں لذت نہیں ، دل میں امنگ نہیں ، سنگھار میں بہار نہیں ، پھولوں میں باس نہیں ، مہندی میں

رنگ نہیں ۔ میر متقی کچھ اس سے غافل نہ تھے ، مگر مبتلا کے بارے میں ان کو بڑی مشکل یہ پیش آ رہی تھی کہ ان میں اور مبتلا میں کئی سبب سے اختلاط اور واشدگی کا ہونا ممکن نہ تھا ۔ اول تو رشتہ کہ میر متقی مبتلا کے چچا باپ کی جگہ دوسرے عمروں کی بڑائی چھٹائی ۔ کہاں میر متقی پچاس پچپن برس کے بڈھے اور کہاں مبتلا بیس برس کا پٹھا ؛ تیسرے مبتلا کے ہوش میں میر متقی کو دھلی آتے ہوئے یہ تیسرا پھیرا تھا ، ایسی صورت میں احنبیت تو ہونی ہی چاہیے ؛ چوتھے وضع میں ، عادات میں ، خیالات میں ، ایک کو دوسرے سے مطلق مناسبت نہیں ۔ پس حال یہ تھا کہ میر متقی مردانے میں ہیں تو مبتلا زنان خانے میں ۔ ادھر میر متقی نے زنان خانے میں قدم رکھا اُدھر مبتلا آہٹ پاتے ہی جھٹ باہر نکل آیا ۔ رات دن میں صرف دو بار چچا بھتیجے بضرورت کھانے کے لیے دسترخوان پر جمع ہوتے تھے ؛ وہ بھی کس طرح کہ مبتلا نے چچا کے سامنے جانے کے لیے ٹوپی اور کپڑے اور جوتی سب چیزیں سادہ اور بھلے مانسوں کے استعمال کی الگ کر رکھی تھیں ۔ کھانے کے لیے طامی آئی اور اس نے جلدی جلدی رگڑ رگڑ کر منہ دھویا ؛ موچھوں کو جن پر سارے سارے دن مالش رہتی تھی ، بل نکال کر سیدھا کیا ، پٹیوں کو اُبھارا ، بالوں کی سج دھج کو بگاڑا ، کھانے کے نہیں چچا کے سامنے جانے کے کپڑے پہنے اور گربۂ مسکین بن کر ، جھکے ہوئے ، نیچی نظر ، مودب ، دسترخوان پر جا بیٹھے ۔ پھر میر متقی کا کھانا کوئی انگریزی ڈنر تو ہوتا ہی نہ تھا کہ کھانا میز پر آیا اور جتنے کھانے والے تھے اپنی اپنی کرسیوں پر چرغنے لگے ، دنیا بھر کی بکواس شروع ہوئی ؛ اور یہ بھی نہیں کہ کھانے کے ضمن میں باتیں کرتے جاتے ہوں ،

بلکہ یوں کہو کہ باتوں کے ضمن میں کھانا بھی کھاتے جاتے ہیں ۔ میر متقی مولوی آدمی ، دور سے کھانا آتا ہوا دیکھ کر کسی شغل میں ہوں چھوڑ چھاڑ ، پہنچوں تک ہاتھ دھو ، بسم اللہ الرحمن الرحیم کہہ کر اکڑوں ہو بیٹھے ۔ کھانا کھایا ، مگر اس کو بھی عبادت سمجھ کر ؛ خیال یہ کہ آداب الطعام میں سے کوئی ادب متروک نہ ہو ۔ پس ان کے دسترخوان پر بات چیت کا کیا موقع ۔ میر متقی مستعجل کہ کم کھاؤں ، مبتلا منتظر کہ اٹھ جاؤں ۔ الغرض ایسا کوئی موقع ہی نہیں بن پڑتا تھا کہ چچا بھتیجے میں جی کھول کر باتیں ہوں ، مگر میر متقی بلا کے تاڑنے والے تھے ۔ انھوں نے اتنی ہی دیر کی صحبت میں مبتلا کی حرکات و سکنات سے ، اس کی نشست و برخاست سے ، اس کی طرز عادات سے ، اتنا جان لیا اور ایسا پہچان لیا کہ مبتلا کے لنگوٹیے یار اور اس کے بھیدی اور راز دار بھی اتنا ہی جانتے ہوں گے ۔ مبتلا اگرچہ چچا کے سامنے اپنے آپ کو بہت ضبط کیے رہتا تھا ، مگر اسی دن کے لیے کہتے ہیں کہ آدمی بری لت نہ ڈالے اور عادت کو بگڑنے نہ دے ؛ مبتلا کو خبر تک نہ ہوتی تھی اور بے خیالی میں ادبدا کر چچا کے سامنے اس سے کوئی نہ کوئی حرکت ایسی سرزد ہو جاتی تھی کہ ہر روز ان کی نظروں میں اس کی قلعی کھلتی رہتی تھی ۔ مثلاً بیٹھے بٹھائے خود بالوں پر ہاتھ جا پڑا اور عادت کے مطابق لگا وہیں پٹیاں جمانے ۔ پھر جو ہوش آیا چچا کو کن آنکھیوں سے دیکھ ، کھجانے کے حیلے سے بالوں کو بگاڑ سیدھا ہو بیٹھا ، یا کھاتے کھاتے ایک مرتبہ انگرکھے کی چوکی کے شکن نکال لگا تن کر سینے کو دیکھنے ۔ اتنے میں چچا پر نظر جا پڑی اور جلدی سے پھر جھک کر ہو بیٹھا ۔ ایک مرتبہ تو اس نے کیا غضب کیا کہ

خدا جانے کس خیال میں مستغرق تھا کہ آپ ہی آپ لگا گنگنانے مگر میر متقی نے اس کو ایسے طور پر ٹال دیا کہ گویا سنا ہی نہیں ۔ مبتلا اپنے دل کو یوں سمجھا لیا کرتا تھا کہ چچا نے دھیان نہیں کیا یا اگر کیا تو آدمی سے ایسی لغو حرکتیں ہوا ہی کرتی ہیں ، اتنی ہی بات سے ان کا ذہن اس طرف کیوں منتقل ہونے لگا کہ پٹیاں جمانا یا اکڑنا یا گانا میری عادت ہے لیکن یہ اس کی غلطی تھی میر متقی کی آنکھ کبھی کسی چیز پر اچٹتی ہوئی پڑی ہی نہ تھی ۔ وہ جس چیز کو ایک نظر دیکھ لیتے اس کی تہہ تک پہنچ جاتے اور اس کے لم کو دریافت کرتے ۔ میر متقی نے مبتلا کی حرکات سے آخر یہ استنباط کیا کہ اس میں دو عیب بہت بڑے ہیں ، اول یہ کہ مذہب سے اس کو مطلق سروکار نہیں ۔ یہ جانتا ہی نہیں کہ خدا بھی کوئی چیز ہے اور آدمی اس کے بندے ہیں ۔ اس کو خبر ہی نہیں کہ آدمی کو کھانے اور سو رہنے کے سوا دنیا میں کچھ اور بھی کرنا ہے ۔ دوسرے حسن پرستی ۔ اس کے نزدیک دولت ، شرافت ، حسب نسب ، علم ، ہنر ، سلیقہ ، اخلاق ، دین‌داری ، غرض دنیا کے سارے کمالات ہیچ ہیں ، صرف ایک حسن صورت قابل قدر ہے اور بس ۔ میر متقی کا ایک قاعدہ اور بھی تھا کہ بڑے دھیمے آدمی تھے ۔ جب کسی خاص شخص کو نصیحت کرنا منظور ہوتا مدتوں اس کے حالات کی تفتیش میں لگے رہتے ، اور جب معلوم کر چکتے جس قدر معلوم کرنے کی ضرورت تھی تو ہفتوں غور کرتے کہ کس پیرایے سے اور کیسے وقت اس کو نصیحت کروں کہ موثر ہو اور یہی سبب تھا کہ ان کی نصیحت کبھی خالی گئی ہی نہیں ۔ مثلاً اگر ایک شخص تارک الصلواۃ ہے اور انھوں نے اس کو نماز کے لیے نصیحت کی تو پھر سفر یا

مرض دنیا کی کوئی کیسی ھی ضرورت کیوں نہ ھو ، اس نے مدت العمر نماز کو قضا نہیں ھونے دیا، یا اگر کوئی شخص منہیات شرعی میں سے کسی کا مرتکب ھے اور انھوں نے وعظ کہا تو پھر توبہ ھی کرا کے چھوڑا ۔ غرض میر متقی نے ایک دن موقع پا کر ، جوں ھی مبتلا کھانا کھا کر جانا چاھتا تھا ، اس کو روکا اور کہا ذرا ٹھہرو ، مجھ کو تم سے کچھ کہنا ھے ۔ مبتلا سمجھا کہ آج نماز گلے پڑی ؛ بیٹھ گیا تو میر متقی نے فرمایا : (وعظ) ''اگرچہ مجھ کو تمھارے حالات بالتفصیل معلوم نہیں، مگر جس قدر معلوم ھیں ان سے میرا خیال یہ ھے کہ تمھاری تعلیم جیسی درستی کے ساتھ ھونی چاھیے تھی نہیں ھوئی ۔ تمھاری تعلیم کا عمدہ حصہ وہ ھے جو مدرسے میں ھوا ۔ مدرسے کی تعلیم اس اعتبار سے کہ جو چیزیں پڑھائی جاتی ھیں دنیا میں بکار آمد ھیں ، بلاشبہ مفید ھے ؛ مگر افسوس ، بڑے سخت افسوس کی بات ھے کہ مذھب کی طرف بھول کر بھی کوئی توجہ نہیں کرتا ۔ مذھب کو سلسلۂ درس سے اس طرح نکال کر پھینک دیا ھے ، جیسے دودھ میں سے مکھی ، جس سے لوگوں پر یہ ثابت ھوتا ھے کہ مذھب ایک فضول اور لایعنی چیز ھے اور دنیا میں اس کی مطلق ضرورت نہیں ۔ پس مدرسوں کی تعلیم کا نتیجہ کیا ھے کہ نوجوان لڑکے فارغ التحصیل ، فضیلت کے خطاب اور لیاقت کی سندیں لے کر مدرسوں سے نکلتے ھیں ؛ ان کو تمام ملکوں کی نئی و پرانی تاریخیں خوب مستحضر ھوتی ھیں ، جغرافیے میں شاید ان کی معلومات اس درجے کی ھو کہ سمندر کی مچھلی ھیں یا پہاڑی کوے یا افریقہ کے ریچھ یا آسٹریلیا کے لنگور یا امریکہ کے بن مانس یا تبت کے دنبے یا تاتار کے مینڈھے یا عرب کے بدو یا یورپ کے فرنگی یا ھندوستان کے بھیل ۔ وہ انگریزی شاید ایسی عمدہ لکھ

سکتے ہوں گے کہ گویا ان کی مادری زبان ہے ۔ ریاضی میں وہ شاید وقت کے بطلیموس[1] ہوں ، علم ہیئات میں وہ اپنے زمانے کے فیثاغورس ، فلسفے میں افلاطون ، غرض ان میں علوم دنیا کی ایسی جامعیت ہو گی کہ شاید ان کی نظیر نہ ہو ؛ مگر وہ نہ مذہب کے معتقد ، نہ خدا کے بندے ، نہ رسول کی امت، نہ بادشاہ کی رعیت، نہ باپ کے بیٹے، نہ بھائی کے بھائی ، نہ دوست کے دوست ، نہ قوم کے ساتھی، نہ برادری کے شریک، نہ وضع کے پابند، نہ رسم کے مقلد ۔ ذرا نظر انصاف سے اس بات کو دیکھو کہ فی الحقیقت مدرسے کی تعلیم میں ایسے خیالات پیدا کرنے کا رجحان ہے یا نہیں ہے ۔ ہے اور ضرور ہے اور اس کا سبب ظاہر ہے کہ مختلف مذاہب کے نوجوان لڑکے ایک جگہ رہتے ہیں ۔ اپنے اپنے عقاید سے سب کے سب بے خبر ۔ عمروں کے تقاضے یہ کہ جہاں اور ہنسی کی باتیں کرتے ہیں ان میں ایک مذہب کا استخفاف بھی سہی ، اگرچہ اپنا ہی مذہب کیوں نہ ہو ۔ مدرسے کے حاکم یا مدرس کچھ مذہب کی پرواکرتے ہی نہیں ؛ طالب علموں کے لیے تو سب ، کیونکہ ان کا فرض خدمت نہیں ؛ اپنے لیے بھی بعض یا اکثر ، اس لیے کہ خود کسی مذہب کے قایل نہیں ۔ وظیفہ یا انعام یا دوسرے موجبات ترغیب ، مذہب پر کسی کا انحصار نہیں ۔ علوم جو پڑھائے جاتے ہیں اکثر جدید ، زمانۂ حال کے ایجاد ۔ کوئی مسئلہ نہیں جس میں متقدمین کی غلطی ، جس میں سابقین کی خطا ظاہر نہ کی جاے ، اور ایک بڑی خرابی آ کر یہ پڑی ہے کہ بہت سی باتیں ہیں تو علوم دنیا سے متعلق ، مگر لوگوں کی غفلت یا

---

۱ - بطلیموس اور فیثا غورس بھی مشہور یونانی حکماء میں سے ہیں۔ اول الذکر علم ریاضی اور موخرالذکر فلسفہ ، ہیئت ، ریاضی اور اقلیدس میں سر آمد روزگار تھا ۔

بے مبالاتی سے داخل مذہب ہوگئی ہیں۔ اب جو ان کی غلطی ثابت ہوتی ہے تو طالب علموں کو جو مذہب سے ہیں کورے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے باپ دادا جو مذہباً ایسی لغو اور بیہودہ باتوں کو تسلیم کرتے چلے آئے نرے احمق تھے اور ان کا مذہب ہی سراسر ہیچ اور پوچ ہے۔ ایک خرابی اور ہے کہ علوم جدیدہ جن کا مدارس میں بڑا زور و شور ہے سب ہیں ازقسم بدیہیات ؛ مشاہدات پر مبنی اور تجربیات پر متفرع ۔ ایسے علوم پڑھتے پڑھتے طالب علموں کو اس بات کی عادت پڑ جاتی ہے کہ وہ ہر چیز کا ثبوت ایسا ہی ڈھونڈنے لگتے ہیں جیسے اوقلیدس کے دعوؤں کا ، اور مذہبی باتوں کے لیے ایسا ثبوت نہ ہوا ہے اور نہ ہونا ممکن ہے ۔ حضرت موسیٰ سے بھی یہود ایسی ہی بے جا فرماعشیں کرتے تھے : لن نومن لک حتی نری اللہ جھرۃ (ہم تو جب تک خدا کو کھلے خزانے نہ دیکھ لیں تجھ پر ایمان لانے والے ہیں نہیں) لیکن مذہب کے لیے ایسے ثبوت کا بہم نہ پہنچ سکنا ضعف مذہب کی وجہ سے نہیں ہے ، بلکہ انسان کی ضعف خلقت کے سبب ۔ کیا اگر موسیٰ خدا کا دیدار یہود کو نہ دکھا سکے تو اس سے لازم آ گیا کہ خدا نہیں ہے ؟ نہیں خدا تو ہے ، مگر وہ آدمی کی آنکھ میں آنے کی چیز نہیں ہے ۔ مدارس کی تعلیم ، بلکہ سچ پوچھو تو عملداری[۲] کا خلاصہ ہے آزادی ۔ بلا شبہ آزادی ہر ایک فرد بشر کا ایک ضروری حق ہے ، مگر آزادی کی بھی کوئی حد ہونی ضرور ہے ۔ آدمی کی بناوٹ اس طرح کی واقع ہوئی ہے اور آدمی فی حد ذاتہ اس طرح کا مخلوق ہے کہ آزادی مطلق تو اس کو حاصل ہونی ممکن نہیں اور مناسب بھی نہیں ۔ کیا آزاد ہو سکتا ہے وہ بندہ نا چیز جس کا ہونا اس کے اختیار میں نہیں ؟ غیروں

---

۲ ۔ مراد انگریزی حکومت ۔

کا محتاج ، دوسروں کا دست نگر ، پہننے میں کھانے میں پینے میں مرنے میں جینے میں ۔ چند منٹ کے لیے ہوا نہ ملے تو ہلاک ، ایک وقت خاص تک غذا نہ پہنچے تو فنا ، تڑاقے کی دھوپ کا تحمل نہیں ، کڑاکے کی سردی کی برداشت نہیں ۔ حالت تو اس قدر خستہ و خراب اور اس پر آزادی کا پرسرخاب ؛ وہی مثل ہے جھونپڑے کا رہنا اور محلوں کے خواب شعر

باندھتے ہیں سرو کو آزاد اور وہ پا بہ گل
کیسی آزادی کہ یاں یہ حال ہے آزاد کا

میں اس میں لڑکوں کا زیادہ قصور نہیں پاتا ؛ سارا قصور ان کی تعلیم و تربیت کا ہے ۔ گھڑی جو تمھاری جیب میں ہے ، اس میں فولاد کی ایک کمانی کنڈلی کے طور پر تہہ کی ہوئی موجود ہے ۔ کنجی کے زور سے کمانی کی تہوں کو خوب کس دیتے ہیں ۔ اسی کو کوکنا کہتے ہیں ۔ کوکنے سے کمانی میں ایک قوت پیدا ہوتی ہے ۔ کمانی چاہتی ہے کہ کھلے اور اپنی اصلی حالت پر عود کر آئے ۔ اگر کوئی چیز مانع نہ ہو تو کمانی سڑ سے دم کے دم میں ڈھیلی پڑ جائے اور وہ قوت جو اس میں پیدا کی گئی تھی اکارت ہو ۔ اس کے روکنے کے لیے گھڑی میں ایک پرزہ لگایا جاتا ہے جس کا نام ہے رگیولیٹر ، اور اس قوت سے وقت کی شناخت کا عمدہ کام لیا جاتا ہے ۔ یہی حال ہے انسان کا کہ اس میں بھی ایک حالت کے مناسب خدا کی دی ہوئی چند قوتیں ہیں ۔ اگر ان قوتوں کا کوئی روکنے والا رگیولیٹر نہ ہو تو یہ تمام قوتیں بےکار ہیں ، بلکہ بجائے مفید ہونے کے الٹی مضر ۔ انسان کا رگیولیٹر ہے مذہب ، جو اس کو اندازۂ مناسب اور حد اعتدال سے گھٹنے بڑھنے گرنے ابھرنے نہیں دیتا ۔ مدرسوں کی تعلیم کوک ہے اور رگیولیٹر نہ دارد ۔ پس اس کا ضروری

نتیجہ ہے کہ آزادی کا خیال دل میں سماتے ہی لوگ ہر طرح کے قیود سے نکلنے کی خواہش کرنے لگتے ہیں ، یہاں تک کہ قید عبودیت سے بھی - سرے سے مدرسے کی تعلیم کے اصول ہی غلط ہیں کہ صرف دنیاوی علوم کے پڑھا دینے سے آدمی دنیا کے کام کا ہو جاتا ہے - اس سے تو یہ بات نکلتی ہے کہ دنیا اور دین دو چیزیں ہیں جداگانہ ، ایک کو دوسرے سے کچھ تعلق نہیں - ہم نہیں جانتے کہ جو لوگ ایسا خیال کرتے ہیں دین سے کیا مراد رکھتے ہیں ، مگر ہمارے نزدیک، بلکہ تمام اہل ادیان کے نزدیک دین کے معنی ہیں انسان کی اصلاح ، اور اس کے دو حصے ہیں ، اصلاح معاش اور اصلاح معاد - پس دین اور دنیا میں اگر ایک طرح کی منطقی مغایرت ہے جیسے عموماً کل و جز میں ہوا کرتی ہے ، اس کو تباین یا تناقض یا تنافر یا بے تعلقی سے تعبیر کرنا مغالطہ دہی ہے - کتنا ہی پڑھاؤ ، جب انسان میں دین نہیں، دیانت نہیں، حمیت نہیں، مروت نہیں محبت نہیں ، خلاصہ یہ کہ انسانیت نہیں ؛ اس پر بھی اگر وہ آدمی دنیا کے کام کا ہے تو اس دنیا کو خیرباد ہے اور اس کام کو سلام - ایک بات تعلیم کے متعلق اور بھی سوچنے کی ہے کہ انسان کو دوسرے حیوانات سے ایک وجہ امتیاز یہ بھی ہے کہ حیوانات کو جتنی عقل دی گئی ہے فطری ہے - تجربے یا امتداد عمر سے اس میں ترقی نہیں ہوتی - مثلاً بیا گھونسلا بناتا ہے کیسا عمدہ کہ انسان اس کی اگر پوری پوری نقل کرنا چاہے تو نہیں بن پڑتی ، مگر جیسا گھونسلا ایک بڈھا بیا بناتا ہے جو اپنی عمر میں شاید بیس پچیس گھونسلے بنا چکا ہو گا ، بجنسہ ویسا ہی گھونسلا پہلی بار ایک نوجوان بیا بنائے گا ؛ برخلاف انسان کے کہ اس کی عقل تجربے اور عمر

کے ساتھ کمال حاصل کرتی جاتی ہے ۔ اس مضمون کو سعدی نے کیا قل و دل طور پر ادا کیا ہے!

مرغک[۳] از بیضہ بروں آید و روزی طلبد
آدمی زادہ نہ دارد خرد و عقل و تمیز
آں بنا گاہ کسے گشت وبچیزے نہ رسید
ویں بہ تمکین و فضیلت بگزشت از ہمہ چیز

اس لیے انسان کی تعلیم و تربیت کا قاعدہ یہ ہے کہ ہر چیز اس کی عمر کا ایک مناسب وقت دیکھ کر سکھاتے ہیں ؛ مثلاً غیر ملک کی بولی ضرور ہے کہ بچپن میں سکھائی جائے ورنہ بڑے ہو کر زبان مشکل سے ٹوٹتی ہے ۔ چھوٹے بچے کو اگر منطق کے پیچیدہ مباحث سمجھانا چاہو تو سعی لا حاصل ہے ، اسی طرح دین کی تعلیم کے لیے بھی ایک وقت مناسب ہونا چاہئے اور وہ نہیں ہے ، مگر سن طفولیت ، کیونکہ آدمی کی عمر جس قدر بڑی ہوتی جاتی ہے، اسی قدر فطرت سے دور اور اسی قدر اس کا دل لوث دنیا سے آلودہ اور زنگ اغراض سے تیرہ ہوتا چلا جاتا ہے ۔ پھر شاید ایک وقت ایسا آئے کہ اس کے دل میں صبغت اللہ ، یعنی دین کا رنگ اٹھانے کی قابلت باقی نہ رہے ۔ نعوذ باللہ[۴] من شرور انفسنا و من سیات اعمالنا ۔ اسی حالت کی نسبت قرآن مجید میں فرمایا ہے : کلا بل ران علیٰ قلوبھم

---

۳ ۔ چڑیا کا بچہ انڈے میں سے نکلتے ہی دانہ چگنے لگتا ہے ، لیکن انسان کا بچہ عقل و تمیز کچھ نہیں رکھتا ۔ وہ (بچۂ مرغ) اچانک ایسا کچھ ہو گیا ، لیکن کسی مرتبے تک نہ پہنچا اور یہ (رفتہ رفتہ ترقی کر کے) وقار اور شرف میں ہر چیز پر سبقت لے گیا ۔

۴ ۔ ہم اللہ سے پناہ مانگتے ہیں اپنے نفس کی شرارتوں اور اپنے اعمال کی برائیوں سے* ۔

ما کانو یکسبون ۔ (اور کچھ بات نہیں ان کے دلوں پر ان کی بدکرداریاں جم گئی ھیں ۔) دنیا میں اور بھی ھزاروں لاکھوں اللہ کے بندے ایسے ھیں کہ جن کو دین کی طرف مطلق توجہ نہیں ، مگر بے توجہی دو طور کی ھے ۔ ایک وہ جس کا سبب کاھلی اور غفلت اور مساھلت ھو ۔ دوسری وہ جو دین کے استخفاف سے پیدا ھو ۔ یہی بے توجہی ھے جو نہایت خطرناک اور نہایت مذموم ھے اور یہی بے توجہی ھے جس کو مدارس کی تعلیم پھیلائی چلی جارھی ھے ، لیکن دین و مذھب لوگوں کی قدردانی اور تسلیم کا محتاج نہیں ھے ۔ ھمالیہ پہاڑ اپنی جگہ سے سرک جائے تو سرک جائے ، گنگا پورب کو بہتے بہتے پچھم کو بہنے لگے تو بہنے لگے ، مگر خدا کی باتیں نہ کبھی ٹلتی ھیں اور نہ کبھی کسی کے ٹالے ٹلیں گی ۔ دین تم سے چاھتا کیا ھے ؟ صرف اتنی بات کہ خدانے تم کو آدمی بنایا ھے ، آدمی بن کر رھو ؛ تم کو آنکھیں دی ھیں اور دیکھتے ھو ، کان دیے ھیں اور سنتے ھو ، زبان دی ھے اور بولتے ھو ، غرض ھر قوت سے وہ کام لیتے ھو جو اس کے کرنے کا ھے ۔ قوتوں میں سب سے قوی اور سب سے عمدہ عقل ھے ۔ اس نے تمھارا ایسا کیا قصور کیا ھے کہ اس کے کرنے کا کام اس سے نہیں لیتے ؟ روئے زمین پر خدا کی جتنی مخلوق ھے سب میں اعلیٰ اور افضل اور اشرف انسان ھے اور اس کی برتری اس سے ظاھر ھے کہ دوسری مخلوقات پر حکمرانی اور ان میں مالکانہ تصرف کرتا ھے ۔ دیکھو انسان کی بنائی ھوئی عمارتیں ، اس کے بسائے ھوئے شھر ، اس کے لگائے ھوئے باغ ، نہریں ، سڑکیں ، پل ، ریل ، تار ، دخانی بادبانی جہاز ، انواع و اقسام کی کلیں ، زندگی کے ساز و سامان ، مگر یہ برتری جو انسان کو استحقاقاً حاصل ھے ،

کیوں ہے ؟ اس کی جسمانی قوتیں تو حیوانات کی قوتوں سے بہت ضعیف ہیں ؛ مثلاً اس کی نظر سے گدھ کی نظر بہت تیز ہے ، اس کے شامے سے شکاری کتوں کا شامہ کہیں زیادہ قوی ہے ۔ وہ اگر ذائقے سے چیزوں کا صرف مزا پہچانتا ہے تو بعض جانور مزے کے سوا خاصیت طبی کی شناخت بھی کر لیتے ہیں ۔ توانائی کے لحاظ سے تو ہاتھی اور شیر وغیرہ کے سامنے وہ ایک مورضعیف سے بھی زیادہ کم زور ہے ؛ پھر انسان کی بڑائی کس چیز میں ہے ؟ عقل میں ۔ اب دیکھنا چاہیے کہ عقل کا کام کیا ہے ۔ یہ سمجھنا کہ عقل ہم کو صرف اتنے واسطے دی گئی ہے کہ کھانا ، پینا ، کپڑا ، مکان ، ساز و سامان بہم پہنچانے میں مدد کرے ، عقل کو ذلیل اور بے قدر کرنا ہے ۔ یہ تو عقل کے نہایت مبتذل کام ہیں ۔ جانور جن کے جثے ہمارے جثوں سے بہت بڑے ، ان کی بھوک پیاس ہماری بھوک پیاس سے کہیں زیادہ ہے ، ہماری جتنی عقل نہیں رکھتے اور ہم سے زیادہ آسودگی کے ساتھ زندگانی کرتے ہیں ۔ ساٹھ ستر برس کی زندگی اور معدودے چند ضرورتوں کے لیے ، ایسی عقل جو ماضی اور مستقبل کے قلابے ملائے اور زمین سے آسمان تک پاؤں پھیلائے ، کسی بڑے اور عمدہ کام کے لیے دی گئی ہے ، اور وہ نہیں ہے ، مگر یہ کہ مخلوق سے خالق اور فانی سے باقی اور دنیا سے آخرت کو پہچان کر اس گھر کے لیے تیاری کریں جہاں ہماری روح کو ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے ؛ لیکن فرض کرو کہ ہم ان خیالات کو اپنے ذہن میں نہ آنے دیں اور آنکھیں بند کرلیں دنیا وما فیھا سے ، جس کا ایک ایک ذرہ ہستی صانع اور ایک ایک واقعہ وجود سبب پر دلالت کررہا ہے ، تو اس سے واقعات کا بطلان تو نہیں ہوسکتا ۔ خدا ہے اور ہمیشہ کو رہے گا ۔ ہم اس کے

بندے ہیں اور کسی طرح اس کے فرمان سے باہر نہیں ہوسکتے ۔ ہم کو مرنا ہے اور جو کچھ دنیا میں کیا ہے اس کی جواب دہی کرنی ہے ۔ عمل اچھے ہیں تو تسلی ہے اور امن ہے اور عافیت ہے اور سکون ہے اور قرار ہے ، یعنی یہ کہ بیڑا پار ہے ؛ برے ہیں تو حسرت ہے اور افسوس ہے اور ندامت ہے اور پھٹکار ہے اور دھتکار ہے ، یعنی یہ کہ دکھ کی مار ہے ۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ اصل میں تو ہوتی ہے غفلت اور اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ، اختلاف مذاہب بے توجہی کا باعث ہوجاتا ہے ۔ آدمی دیکھتا ہے کہ دنیا میں سینکڑوں ہزاروں مذہب ہیں ، ہر ایک صرف اپنے آپ کو بر سر حق سمجھتا ہے اور باقی سب کو گمراہ اور کافر اور مردود اور ملعون اور جہنمی ، تو یہ دیکھ کر خواہ نخواہ اس کے دل میں خیال آتا ہے کہ پہلے ان ہزاروں مذاہب کے معتقدات سے واقفیت حاصل کروں، پھر ان کے سوال و جواب سنوں ، پھر ان میں محاکمہ کروں ۔ اس کے لیے میں کہا ، میری تو دس نسلوں کی عمریں بھی کفایت نہیں کرسکتیں ۔ اس سے بہتر ہے کہ مذہب کی پہیلی کو جس کا اتا پتا کچھ نہیں سوچو ہی مت ؛ لیکن یہ بھی ایک وسوسۂ شیطانی ہے اور انسان کے لا مذہب ہونے کے لیے حجت نہیں ہوسکتا ۔ دنیا میں جتنے مذہب ہیں ، جہاں تک مذہب کو دنیا سے تعلق ہے ، سب کا مقصود اصلی ہے آدمی کی اصلاح ، اور اختلاف اگر ہے تو ملکوں کی آب و ہوا ، لوگوں کی طبائع اور عادات اور ضرورتوں کے اختلاف کی وجہ سے ، اور فروع میں ہے نہ اصول میں ، جزئیات میں ہے نہ کلیات میں ۔ پس تم جیسے نوجوان آدمیوں کے لیے اس سے بہتر صلاح کی بات نہیں کہ جو جس شان میں ہے اسی شان میں رہ کر پابندی مذہب کو نہ چھوڑے ۔ اس

سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ نیکی کا خیال دل میں راسخ ہوجائے گا ، خدا سے لگاؤ پیدا ہوگا اور حق کی تلاش میں اس کو مزا ملے گا ۔ آدمی اگر اتنا کرے ، اور اس سے زیادہ کرھی کیا سکتا ھے ، تو ضرور خدا کی رحمت اس کی دست گیری کرے گی ۔ والذین[۵] جا ھدو ا فینا لنھدینھم سبلنا ۔ لوگ مذھب کی طرف سے جو اس قدر غافل اور مگرے بن رھے میں اس کی ایک وجہ یہ بھی ھے کہ خدانے اپنے بندوں کی آزمائش کے لیے دنیا کا انتظام ایسے طور پر رکھا ھے کہ دنیاوی حالات کے اعتبار سے نیک و بد اور پابند مذھب اور لا مذھب اور مومن و کافر اور موحد و مشرک کسی کا کچھ امتیاز نہیں ۔ خداوند تعالیٰ کی عام رحمتوں سے سب کے سب بلا تخصیص یکساں طور پر متمتع ھوتے ھیں ۔ وقت پر پانی سب کے واسطے برستا ھے ۔ ھوا کا ذخیرہ سب کے لیے موجود ھے ۔ رزق ھر ایک کی خاطر مہیا ھے ۔ صحت و مرض ، تمول و افلاس ، توالد و تناسل ، حیات و ممات ، غرض زندگانی کی بھلی بری تمام کیفیتیں ، جیسی مسلمانوں میں ویسی عیسائیوں میں ، ویسی یہود میں ۔ کوئی قوم ، بلکہ کوئی گروہ ، بلکہ کوئی فرقہ ، بلکہ کوئی متنفس اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ مذھب کی وجہ سے مجھ کو دنیا میں یہ خصوصیت حاصل ھے ، اور کہیں ایسی ایک ادنیٰ سی خصوصیت بھی پائی جائے تو تمام روئے زمین سے اختلاف مذاھب کے معدوم کر دینے کو کافی ھے ۔ یہ بے خصوصیتی ان لوگوں کے حق میں سم قاتل ھے جن کی طبیعتیں لا مذھبی کی طرف مایل ھیں ۔ غور کرنے کی تو ان لوگوں میں عادت ھوتی نہیں ؛ دنیا میں ھیں اور دنیا ھی کو

---

۵ - جن لوگوں نے ھمارے لیے کوشش کی ھم ضرور آن کو اپنی راھیں دکھائیں گے* ۔

دیکھتے ہیں ، اور سمجھتے ہیں بس جو کچھ ہے یہی دنیا ہے ۔ ذالک[۶] مبلغھم من العلم ؛ لیکن ذرا عقل کو کام میں لائیں تو معلوم ہو اور اندر سے دل آپ ہی آپ گواہی دینے لگے کہ نہیں ایک جہاں اور بھی ہے ۔ یہ دنیا خواب ہے اور وہ جہان اس کی تعبیر ، یہ مجاز ہے اور وہ حقیقت ، یہ نمونہ ہے اور وہ اصل ۔ جس طرح عقل دنیا سب کی یکساں نہیں اسی طرح عقل دین کے مدارج بھی متفاوت ہیں ۔ بعض لوگ وہ ہیں جو صرف موجودات دنیا سے خدا کو ، اور خدا سے اس کی عظمت کو ، اس کی عظمت سے اس کی معبودیت کو مانتے پہچانتے ہیں ، اور بعض موجودات سے نہیں ، بلکہ تغیرات سے اور تغیرات سے بھی نہیں ، بلکہ حادثات عامہ سے بھی متنبہ نہیں ہوتے ، تاوقتیکہ خود ان پر کوئی آفت نازل نہ ہو اور بعض حلول مصیبت پر بھی کہنے کے محتاج ۔ گویا بیل ہیں کہ آر بھی گھپوؤ اور ساتھ منہ سے بھی ٹٹکاری دو ، تب ان کو خبر ہو کہ چلنا چاہیے ۔ اے میرے پیارے بھتیجے ! اے مرحوم کی یادگار ! اے مغفور کی نشانی! مجھ کو بھائی کے مرنے کا اتنا رنج نہیں ہوا جتنا تمہارے دین کی تباہی کا ۔ بھائی اگر مرے تو عمر طبعی کو پہنچ کر مرے اور ایک دن مرنا ضرور تھا ۔ میں نے اپنی موت کے لیے دعا تو نہیں مانگی ، اس واسطے کہ موت کے لیے دعا مانگنا منع ہے ، مگر سات برس عرب میں رہا ، کوئی دن ایسا نہیں گزرا کہ میں نے اس سر زمین میں اپنے دفن ہونے کی تمنا نہ کی ہو ، مگر خدا کی مبارک مرضی یوں تھی کہ میں یہاں پھر آؤں اور بھائی کا مرنا سنوں ۔ جب سے میں نے بھائی کا مرنا سنا ہر روز ، بلکہ دن میں کئی کئی بار (دعا نہیں) دل میں تمنا کرتا ہوں کہ الٰہی اگر عرب کی مٹی سے میرا خمیر نہیں ہے تو مجھ

---

۶ - اُن کے علم کی رسائی یہیں تک ہے* ۔

کو با ایمان دنیا سے اٹھا کر اس شخص کے پہلو میں مجھ کو جگہ دے جو مجھ کو دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھا ، یعنی میرے بڑے بھائی اور تمھارے والد مرحوم ۔ میں نہیں جانتا کہ یہ تمنا بھی پوری ہو یا نہ ہو ، مگر بھائی کے مرنے کے بعد اب زندگی بے مزہ ہے اور اس ملک میں رہنا اس سے زیادہ بے مزہ ۔ یہ مت سمجھو کہ آدمیوں کے باھمی تعلقات اس زندگی تک کے تعلقات ہیں ؛ نہیں نہیں ، یہ تعلقات روحی تعلقات ہیں اور چونکہ روحوں کو فنا نہیں ، ان کے تعلقات کو بھی انقطاع نہیں ۔ یقین جانو کہ تمھاری اس طرز زندگی سے بھائی کی روح کو ایذا ہوتی ہے ، کیونکہ ان کو اس زندگی میں بھی تمھاری تکلیف کی بر داشت نہ تھی اور اس طرز زندگی کے ہاتھوں تم پر جو سخت بلا نازل ہونے والی ہے میں اس کو عقل سے جانتا ہوں اور تمھارے باپ اس کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں ۔ باپ سے ہو سکتا ہے کہ بیٹے کو کنوئیں میں گرتا ہوا دیکھے اور پروا نہ کرے باپ سے ممکن ہے کہ بیٹا جلتی ہوئی آگ میں کودے اور وہ کھڑا تماشا دیکھے مرحوم نے لوگوں کی نظروں میں سلامت روی اور نیک وضعی اور بھلمنساھت سے جو ایک وقار پیدا کیا تھا ، تم ھی اپنے دل میں انصاف کرو کہ تم نے اس کو بڑھایا یا گھٹایا ، روشن کیا یا مٹایا ؟ ایسے چاھنے والے ، ایسے شفیق ، ایسے مہربان ، ایسے دل سوز باپ کے احسانات کا یہی معاوضہ تھا ؟ ان کے سلوک اسی پاداش کے قابل تھے ؟ جو باتیں میں تم سے کہ رہا ہوں تم کو شاید پہلی بار ان کے سننے کا اتفاق ہوا ہوگا ، مگر میری ساری عمر ان ھی غوروں اور فکروں میں گزری ہے ۔ اس کو میں اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ شروع سے مجھ کو اچھے لوگوں کی صحبت رہی ۔ ہندوستان سے لے کر عرب

تک ہزارہا علماء اور شیوخ سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ملا اور جس سے جتنا فیضان قسمت کا تھا ، حاصل ہوا ۔ الحمدللہ علیٰ ذالک[۷] ۔ تم دیکھتے ہو کہ میں دین کے کاموں میں بھی جہاں تک مجھ سے ہو سکتا ہے ، اور افسوس ہے کہ قدر واجب کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہو سکتا ، لگا لپٹا رہتا ہوں ۔ اس پر بھی خدا کی عظمت اور اس کے جلال پر نظر کرتا ہوں تو مجھ کو اپنی نجات کی طرف سے بالکل مایوسی ہوتی ہے اور تنہائی میں ، خصوصاً رات کے وقت جب دنیا کی بے ثباتی ، قیامت کے حساب اور اپنی بے بضاعتی کے افکار ہجوم کرتے ہیں تو مجھ کو اس قدر وحشت ہوتی ہے کہ تم کو اس کا اندازہ سمجھنا مشکل ہے ۔ صرف اس کی رحمت بے انتہا کی توقع اس وقت دست گیری کرتی ہے ، جس سے دل کو تسلی ہوتی ہے ۔ یہ زحمت جو مجھ کو دین کے کاموں میں اٹھائے ہوئے دیکھتے ہو ـــ اگر اس کو زحمت سے تعبیر کرنا درست ہو تو ـــ اتنی مدد کرتی ہے کہ امیدواری رحمت کی ڈھارس بندھاتی ہے ۔ اگر خدا عقل میں راستی دے تو دنیا کی سب باتوں سے دین کی تعلیم نکلتی ہے ۔ دنیا میں جس کو جس پر کسی طرح کی حکومت ہے ، جیسے شوہر کو بی بی پر یا باپ کو اولاد پر یا بادشاہ کو رعایا پر ، اگرچہ دنیا کی ساری حکومتیں عارضی اور ضعیف ہیں ، اس پر بھی کوئی حاکم کسی محکوم کی کسی نافرمانی سے درگزر نہیں کرتا ۔ کیا غفلتیں ہیں ، کیا ۔ فکریاں ہیں ، کیا مغالطے ہیں ، کیا بے مناسبتی ہے !! کہ بندۂ ۔ حقیقت و ناچیز نافرمانی کیسی ، اس قادر ذوالجلال کے اوامر کا استخفاف کرے ، گویا اس کا مد مقابل ہے اور پھر درگزر کی توقع ، کیا ہیکڑی ہے! مغفرت کی اُمید ، کیا بے حیائی ہے ! تم کو اکثر باتوں میں مغالطہ

---

۷ ۔ اس بات پر خدا کا شکر ہے ۔

واقع ہوا ہے ۔ دوستوں کے بارے میں بھی تمھاری رائے غلطی سے محفوظ نہیں رہی ۔ یہ لوگ جو تمھارے آگے پیچھے پڑے پھرتے ہیں ، اور ہر وقت تم کو گھیرے رہتے ہیں ، جہاں تک میں نے خیال کیا ہے ایک کو بھی تمھارا خیر خواہ نہیں پاتا ۔ ان کے کچھ مطلب ہیں بیہودہ ، اغراض ہیں فاسد ۔ تم کو دیکھ پایا عقل کے کوتاہ گانٹھ کے پورے ۔ آپ بنے شکاری اور تم کو گردانا ٹٹی اور لگے تمھاری آڑ میں تکے چلانے ۔ غرض مندانہ رابطے عموماً ، اور خاص کر جب کہ اغراض خسیس ہوں ، نہایت بے ثبات ہوتے ہیں اور سریع الانقطاع ۔ مجھ کو توقع یہ ہے کہ تم نے خود اس کا تجربہ کر لیا ہوگا ، ورنہ میرا اس وقت کا کہنا چاہو لکھ رکھو کہ تمھارے اتنے دوست ہیں ، ان میں سے کسی ایک کے ساتھ دو برس تک بھی صحبت یوں ہی چلی جائے تو جاننا کہ بہت چلی ۔ خیال کو اور وسعت دو تو یہی حال ہے دنیا کے تمام جسمانی تعلقات کا ۔ غیروں کی کیا شکایت ، دوسروں کا کیا گلہ ، اپنے ہی اعضا و جوارح اور اپنی ہی قوتیں کب تک کی ساتھی ہیں ؟ دیکھو مجھ جیسے بوڑھوں کو کہ ایک بصارت سے معذور ہے تو دوسرا ثقل سمع سے مجبور ؛ کسی کی بھوک تھکی ہوئی ہے اور کسی کے ہاضمے میں فتور ؛ پیری وصد عیب ، زندہ درگور ۔ دنیا کی یہی بے ثباتی دیکھ کر جن کی عقلیں سلیم ہیں ، فانی لذتوں کے گرویدہ اور عارضی منفعتوں کے فریفتہ نہیں ہوتے ۔ جس قدر میں نے تم سے کہا اگرچہ ضرورت سے بہت کم کہا ، مگر مجھ کو تمھاری طینت کی پاکیزگی سے امید ہے کہ ان شاءاللہ رائگاں نہ جائے گا اور خدا نے چاہا تو میں دعا بھی کروں گا کہ تمھارے دل میں سوچنے اور غور کرنے کا شوق پیدا ہو ؛ مگر قاعدہ ہے کہ دنیا میں کوئی مبتذل سے مبتذل فائدہ بھی بے طلب نہیں ملتا ۔

سچ ہے کہ جب تک بچہ روتا نہیں ماں بھی دودھ نہیں دیتی ۔ پس دین کے عمدہ اور دائمی فائدے بدرجۂ اولیٰ طلب پر موقوف اور پیروی پر منحصر ہونے چاہئیں ، اور وہ تمہارے کرنے کا کام ہے ۔ دین کے کام ہیں تو دل سے متعلق اور کوئی شخص دوسرے کے خیالات ، یعنی دلی حالات پر مطلع نہیں ہو سکتا ، مگر خیالات کی اصلاح سے ارادے کی اور ارادے سے افعال کی ، طرز تمدن کی اور وضع گفتگو کی ، نشست و برخاست کی ، حرکات و سکنات کی سبھی چیزوں کی اصلاح ہوتی ہے ، یعنی انسان کا ظاہر حال اس کے دل کا ترجمان ہوتا ہے ۔ پس تم کہو یا نہ کہو خود بخود منکشف ہوتا رہے گا کہ جس راستے پر میں نے تم کو لگا دیا ہے تم نے اس میں چلنا شروع کیا یا نہیں ۔

چودھویں فصل

مبتلا پر میر متقی کے وعظ کا کہاں تک اثر ہوا

مبتلا کو جب چچا نے پکڑ کر نصیحت سننے کے لیے بٹھایا تھا تو خواہ مخواہ اس کی طبیعت میں از خود ایک ضد سی آگئی تھی ، تاہم تھوڑی دیر ادب کی وجہ سے دم نہ مارسکا اور پھر تو میر متقی کی باتوں پر ایسا ریجھا کہ آنکھیں اور منہ دونوں کھلے کے کھلے رہ گئے اور جب تک میر متقی نے بات کو ختم نہیں کیا ، مبتلا کو کوئی دیکھتا تو کیا معلوم ہوتا کہ بس حیرت کا ایک پتلا ہے ۔ چچا کے پاس سے چلے جانے کے بعد بھی کئی دن تک وہ مبہوت سا رہا ۔ اس کا دل تو مان گیا تھا کہ چچا نے جو کچھ کہا ٹھیک کہا ، مگر جس بات کی آن پڑگئی تھی اس کے بدلتے ہوئے اس کا جی ہچکچاتا تھا ۔ آوارگی اس کی طبیعت میں یہاں تک سما رہی تھی کہ ترک وضع کرتے ہوئے اس کو عار آتی تھی ۔ وہ سوچتا تھا کہ چچا کے کہنے پر چلوں تو دوست آشنا ، کھانا پہننا ، سیر تماشا ، تفریح تمامی مشاغل سب کو ایک دم سے چھوڑوں ، یعنی ترک دنیا کروں تو پھر جیوں کیونکر ؟ اور فرض کیا کہ جبراً قہراً میں نے ترک دنیا کیا بھی ، تو لوگ مجھ کو کیا کہیں گے ؟ آخر پرہیزگار بنوں تو پورا بنوں جیسے چچا ۔ زربفت کی

ٹوپی خلاف ثقات تو اب میں پہننے سے رہا ، ناچار شملہ ' دوپٹہ ، عمامہ باندھنا پڑے گا اور اس کی زد میں بالوں کی جیسی گت بنے گی ظاہر ۔ تو ضرور ہوا کہ سب سے پہلے سر منڈاؤں ؛ منڈے سر پر یہ خشخاشی ڈاڑھی اور چڑھی ہوئی مونچھیں کیا بھلی لگیں گی ۔ تو لازم آیا کہ ڈاڑھی چھوڑوں اور موچھوں کو سیدھا کروں ۔ پھر ایسی مقطع صورت پر گلے میں کرتا نہ ہو تو خیر نیچی چولی کا انگرکھا[1] اور ٹانگوں میں ایک بر کا گھٹنا[2] اس وضع سے کیا منہ لے کر بازار میں نکلوں گا ۔ ساری عمر کبھی مسجد میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا ، اب جو ایک دم سے جا کھڑا ہوں تو جتنے نمازی ہیں سب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھ کو گھوریں گے ۔ غرض جن کو چھوڑتا ہوں اور جن میں جا کر ملتا ہوں ، سبھی کا انگشت نما ہونا پڑے گا ۔ مبتلا اسی پس و پیش میں تھا کہ میر متقی ایک دن اس کو وضو کرا ، کپڑے بدلوا ، اپنے ساتھ جمعہ کی نماز میں لے گئے اور اس کے بعد سے جب تک رہے جب نماز کو جاتے مبتلا کو گھر سے ساتھ لے کر نکلتے ۔ غرض مبتلا کی وہ جھجک تو جاتی رہی اور اس کی وضع میں بھی رفتہ رفتہ اصلاح آتی چلی ۔ اگر میر متقی کا دو تین مہینے بھی اور رہنا ہوتا تو مبتلا کے درست ہو جانے میں کوئی کسر نہ تھی ۔ ابھی میر متقی نے کیا ہی کیا تھا ، مبتلا کو صرف ایک وعظ سنایا ۔ صرف اتنی غرض سے کہ اس کی غفلت کو تازیانہ ہو ۔ دین‌دار بھلا مانس بنتے ہوئے وہ جھیپتا تھا ، اس کی شرمندگی مٹا دی ۔ اگر زیادہ رہنے کا اتفاق ہوتا تو خدا جانے

---

۱ ۔ انگرکھا (یعنی پرانی وضع کی بند دار شیروانی) جس کی باڈی نیچی ہیں ۔

۲ ۔ ایک کلی کا پاجامہ جو ٹخنوں سے اوپر ہو ۔

کتنے وعظ اور کہتے اور کیا کیا اس کو سکھاتے سمجھاتے ۔ وہ تو اچھی طرح جانتے تھے کہ برسوں کے جمے ہوئے زنگ ہیں ، یہ کیا ایک رگڑے سے چھوٹنے والے ہیں ۔ حسن پرستی کا وہ بڑا سخت عیب بھی جو گویا مبتلا کی گھٹی میں داخل تھا ، میر متقی موقع پاکر اس کا علاج کرتے پر کرتے ، مگر مبتلا کو تو اپنے اعمال کی شامت بھگتنی تھی ۔

پندرھویں فصل

میر متقی کا دفعۃً بے وقت رام پور روانہ ہونا اور مبتلا کو سید حاضر اور عارف کے سپرد کر جانا

میر متقی نے مبتلا کی اصلاح پر توجہ شروع کی تھی کہ اتنے میں چپکے چپکے اس گمنام عرضی کی تحقیقات ہونے لگی جو ناظر کی شرارت سے میر متقی کی شکایت میں گورنر کے پاس پہنچی تھی ۔ اور تو کچھ حال نہ کھلا ، مگر خلاف عادت پولیس کے لوگ وقت بے وقت کوئی وعظ سننے کے بہانے سے ، کوئی نماز کے حیلے سے آمد و رفت کرنے لگے ۔ ان میں جو زیادہ ہوشیار تھے بتے دے دے کر ٹیڑھے ٹیڑھے مسئلے پوچھتے تھے ۔ مثلاً یہ کہ کیوں حضرت ہندوستان آپ کے نزدیک دارالحرب[1] ہے یا نہیں ؟ انگریزوں سے اور ہنود سے سود لینا روا ہے یا نہیں ؟ انگریز اگر کابل پر چڑھائی کریں اور ایک پلٹن کو امیر کے مقابلے میں

۱ - یعنی وہ ملک جہاں غیر مسلموں کی حکومت ہو اور مسلمان آزادی سے اپنے دینی فرائض انجام نہ دے سکیں - دارالحرب میں جہاد فرض ہو جاتا ہے - ان سوالات سے یہ سراغ لینا مقصود ہے کہ آیا میر متقی اُن علما کا پیرو تو نہیں ہے جو ہندوستان کو دارالحرب قرار دیتے ہیں اور انگریزوں کے خلاف جہاد کی تحریک چلاتے ہیں - بعض علماء نے دارالحرب ہونے کی بنا پر ہندوستان میں غیر مسلموں سے سود لینے کے جواز کا فتویٰ بھی دے دیا تھا -

لڑنے کا حکم دیں اور ایک مسلمان اس پلٹن میں پہلے سے نوکر ہو تو اس کو کیا کرنا چاہیے ؟۔ مہدی[۲] جنھوں نے مصر میں خروج کیا ہے مہدی موعود ہیں یا نہیں اور ان کو مدد دینا از روئے شرع شریف کیا حکم رکھتا ہے ؟ انگریزی دواؤں کا استعمال درست ہے یا نہیں ؟ کچہری سے برابر سود کی ڈگریاں ہوتی ہیں ، اس سود کا دینا گناہ ہے یا نہیں ؟ انگریزوں کے ساتھ کھانا اور لباس اور طرز تمدن میں ان کے ساتھ تشبہ کیا حکم رکھتا ہے ؟ میر متقی جہاں دیدہ آدمی تھے ، ان باتوں کو دیکھ کر ان کے کان کھڑے ہوئے اور سمجھے کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے ۔ کوتوال شہر سے معرفت اور دور کی صاحب سلامت تو تھی ہی ، ایک دن جمعہ کی نماز کو جاتے ہوئے راہ میں کوتوال سے آمنا سامنا ہو گیا ۔ میر صاحب نے کہا مجھ کو آپ سے کچھ کہنا ہے ، وقت فرصت معلوم ہو تو میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں ؟ کوتوال نے کہا آج بعد نماز مغرب میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا ۔ غرض کوتوال کے ساتھ تخلیہ ہوا تو میر صاحب نے فرمایا ''کیوں کوتوال صاحب ، یہ ماجرا کیا ہے کہ چند روز سے پولیس کے لوگ میری نگرانی کرنے لگے ہیں ۔ میں دیکھتا ہوں کہ جتنی دیر میں باہر رہتا ہوں پولیس کا ایک نہ ایک آدمی ضرور موجود ہوتا ہے ۔ مسئلے پوچھتے ہیں تو پیچ دار ، باتیں کرتے ہیں تو اکھڑی ہوئی ۔ میں نے دھوپ میں ڈاڑھی سفید نہیں کی ۔ یہ لوگ مجھ سے چھپاتے ہیں اور میں سب

---

۲ - مراد محمد احمد سودانی جو مہدی سودانی کے نام سے مشہور ہیں ۔ گزشتہ صدی کے اواخر میں وادیٔ نیل کی آزادی کے لیے علم جہاد بلند کیا اور مہدی موعود ہونے کا بھی دعویٰ کیا تھا ۔ ۱۸۸۱ء سے ۱۸۸۵ء تک برابر ہر معرکے میں فتح یاب ہوتے رہے ۔ ۱۸۹۸ء میں کچنر نے انھیں شکست دی اور ۱۸۹۹ء میں شہید ہوئے ۔

سمجھتا ہوں ، مجھ سے پردہ کرتے ہیں اور میں ان کے تیور پہچانتا ہوں ۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں یہاں کا رہنے والا نہیں ۔ سات برس بعد سفر حجاز سے واپس آیا ہوں ۔ رام پور جانا چاہتا تھا ، میں نے کہا کہ لاؤ لگے ہاتھ بھائی سے ملتا جاؤں ۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بھائی کا انتقال ہو چکا ہے ۔ ان کے معاملات خانہ داری کو دیکھا ، سب کے سب ابتر ، ناچار ٹھہرنا پڑا ۔ اکثر معاملات خدا کے فضل سے درست ہوگئے ہیں بعض باتیں باقی ہیں ؛ اگر میرے حال سے تعرض نہ بھی کیا جائے ، تاہم تین چار مہینے سے زیادہ مجھ کو ٹھہرنا منظور نہیں اور ٹھہر سکتا بھی نہیں ، لیکن اس نظر بندی کی حالت میں تو میں ایک دن نہیں رہ سکتا ۔ بے اطمینانی کی وجہ سے وہ مطلب بھی فوت ہوتا ہے جس کی وجہ سے میں ٹھہرا ہوں ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے سرکار کا ایسا کون سا قصور کیا ہے ۔ درس میں نہیں دیتا کہ میرے ساتھ طالب علموں کا ہجوم ہو ؛ صاحب سلسلہ[۳] میں نہیں کہ مریدوں کا گروہ میرے پاس جمع رہے ۔ خطا یا قصور اگر ہے تو یہی کہ جو کوئی اللہ کا بندہ پاس آ بیٹھتا ہے تو نصیحت کی دو چار باتیں اس سے کہہ دیتا ہوں ، اور یہ کام ایسا ہے کہ دنیا کی حکومت کیسی ہی قاہرہ کیوں نہ ہو ، مجھ کو اس سے باز نہیں رکھ سکتی ۔ نصیحت تو لوگوں کو میں نے کی ہے اور کرتا ہوں اور آئندہ بھی جہاں رہوں گا کروں گا ضرور کروں گا ۔ اگر یہ بغاوت ہے تو میں پکارے کہتا ہوں کہ میں باغی ۔ سرکار کو اختیار ہے مجھے قید کرے ، مگر ان شاءاللہ وہاں بھی قیدیوں کو نصیحت کرتا رہوں گا ۔ سرکار شہنشاہ زبردست اور میں اس کی ایک

---

۳ - پیر طریقت یا شیخ جو صوفیہ کے سلسلوں میں سے کسی سلسلے میں طالبین سے بیعت لیتا ہو ۔

ادنیٰ رعیت ، میرے واسطے ایسی کاروائی کی کیا ضرورت ہے ۔ اگر کچھ اشتباہ پیدا ہوا ہے تو مجھ کو علیٰ رؤس‌الاشہاد طلب کرے ۔ میں جواب دہی کو اور اگر قصور ثابت ہو تو سزا کو حاضر ہوں ، مگر ابنائے جنس کی نظر میں ناحق نکو بنانا ، مشتبہ ٹھہرانا شیوہ انصاف سے بہت بعید ہے ۔ کوتوال یہ سب باتیں چپ بیٹھا ہوا سنتا رہا اور آخر بولا تو یہ بولا کہ میں ارادت مندانہ اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ جب حضرت کا ارادہ تین چار مہینے بعد خود رام پور روانہ ہونے کا ہے ، اگر ابھی قصد فرمائیے تو مناسب ۔ یہاں کا اگر کوئی کام مجھ کو سپرد کر جائیے ان شاءاللہ اس کا سر انجام خاطرخواہ میرے ذمے ۔ میر متقی نے سمجھا کہ اب ٹھہرنا مصلحت نہیں اور زیادہ کاوش کرنے سے بھی کچھ حاصل نہیں ۔ فوراً سفر رام پور کا ارادہ کر دیا ۔ غیرت بیگم باپ کے مرنے پر تو کیا روئی تھی جیسا کہ چچا کے جانے کا اُس نے ماتم کیا ۔ مبتلا کے خیالات میں بھی تھوڑے ہی دنوں میں اتنا فرق پڑ گیا تھا کہ اُس کو بھی یکایک چچا کے چلے جانے کا رنج ہوا۔ میر متقی نے ہر ایک کو اس کی جگہ تسلی دی ۔ چلتے چلتے مبتلا سے اتنا کہہ گئے کہ سید حاضر کے خیالات بہت راستے پر آگئے ہیں ، اگر اُن سے مشورہ لو گے تو اُمید ہے کہ نیک صلاح کے دینے میں دریغ نہیں کریں گے ، یا میاں عارف جن کو تم میرے پاس اکثر دیکھتے تھے تمہارے مدرسے ہی کے طالب‌العلم ہیں ، بڑے اچھے دل کا لڑکا ہے ۔ ہے تو تمہارا ہم عمر ، مگر استعداد اور معلومات کے اعتبار سے پورا مولوی ہے ۔ بڑی خوبی اُس میں یہ ہے کہ اس کے خیالات حکیمانہ اور شگفتہ ہیں ۔ میں نے اُس سے بھی بتاکید کہہ دیا ہے اور وہ خود ہفتے میں ایک دو بار تمہارے پاس آیا کریں گے ۔ تم بھی ربط بڑھا لینا ، اُن سے تم کو سب طرح کی مدد ملے گی ۔

سولہویں فصل

میر متقی کے چلے جانے کے بعد مبتلا کس رنگ میں رہا

مبتلا کی تو اس وقت بعینہ ایسی مثال ہوگئی کہ ایک مریض مرض مہلک میں گرفتار ، ایک طبیب حاذق نے اس کا علاج شروع کیا ۔ ارادہ تھا کہ منضج ہوں منضجوں کے بعد مسہل ، مسہلوں کے بعد تبرید ؛ پھر معجونات کا استعمال کرایا جائے ۔ ابھی منضج بھی پورے نہ ہونے پائے تھے کہ طبیب صاحب تشریف لے گئے[1] ۔ سید حاضر اگر چہ اس کا پھوپھی‌زاد بھائی تھا ، مگر رشتہ داری کے جھگڑوں کے سبب ایک دوسرے کے ساتھ اُنس نہ تھا ۔ رہ گئے میاں عارف ، مولوی تھے حکیم تھے ، شگفتہ خیال تھے ، سب کچھ تھے ، مگر مبتلا کے

---

۱ - یونانی طریقۂ علاج میں پہلے مریض کو منضج دوا دیتے ہیں جس سے مادۂ فاسد اُبھرتا ہے ، پھر مسہل (دست آور دوا) جس سے اُبھرا ہوا مادہ خارج ہوتا ہے ، پھر تبرید ، یعنی ٹھنڈائی استعمال کراتے ہیں ۔ جب اس طرح پوری تنقیح ہو جاتی ہے تو پھر معجونات یا مقوی ادویات کھلاتے ہیں ۔ میر متقی نے اسی حکمت اور تدریج کے ساتھ مبتلا کے ذہنی و اخلاقی امراض کا علاج شروع کیا تھا ، لیکن علاج ادھورا چھوڑ کر جانا پڑا ۔

چچا تو نہ تھے ۔ مبتلا کو ان کا کیا لحاظ اور اُن کو مبتلا کا کیا درد ؟ پھر بھی بچارے نے ، خدا اُن کو جزائے خیر دے ، میر متقی کے کہنے پر اتنا تو کیا کہ پیر کے پیر ، جمعے کے جمعے مبتلا کے پاس آتے اور گھنٹے دو گھنٹے بیٹھ کر چلے جاتے ۔ اسی طرح مبتلا بدھ کے بدھ اور اتوار کے اتوار عارف کے گھر جاتا اور یوں ایک دن بیچ دونوں کی ملاقات کا سلسلا بندھ گیا ۔ اس سے اتنا تو ہوا کہ مبتلا کے پرانے یار دوستوں کو اُس پر احاطہ کرنے کا موقع نہ ملا اور جس ڈھرے پر چچا نے اُس کو لگا دیا تھا اُس پر تھوڑا چلا ، سست چلا ، بدیر چلا ، مگر چلا ۔ دین داری میں اگر سچ پوچھو تو مبتلا نے ترقی نہیں کی ، مگر اُس کا سنبھلا رہنا بھی غنیمت ہوا کہ پھر اس نے آوارگی نہیں کی ۔ وہ نماز بھی پڑھ لیتا تھا ، مگر گنڈے دار ۔ اب دین کی باتوں کا اگر اہتمام نہیں کرتا تھا تو پہلے کی طرح اُن پر ہنستا بھی نہ تھا ۔ اس کی ظاہری وضع میں بھی اگلی سی سخافت باقی نہ تھی ۔ جب سے باپ مرے اس نے گھر میں سونا بالکل چھوڑ دیا تھا ، چچا کے آنے سے وہ پھر گھر میں سونے لگا تو ان کے چلے جانے کے بعد وھی معمول رکھا ۔ غرض مبتلا دین دار نہیں تو ایک خانہ دار بھلا آدمی بن گیا تھا جیسے اکثر لوگ ہوتے ہیں ، مگر حسن پرستی کی ہڑک ہ ، وز دو ایک بار اس کو اُبھارتی رہتی تھی ۔

سترھویں فصل

حسن صورت پر مبتلا اور عارف کا مباحثہ

ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ عارف کے آنے کا وقت تھا اور مبتلا بیٹھا ہوا آن ہی[1] کی راہ دیکھ رہا تھا ۔ بیٹھے بیٹھے اسی حسن پرستی کے خیال میں ایسا محو ہوا کہ عارف سر پر آ کھڑے ہوئے اور اس نے عادت کے مطابق نہ تو آن کا استقبال کیا اور نہ کھڑے ہو کر ان کو تعظیم دی ۔ جب عارف نے جھک کر السلام علیکم کہا تب سٹ پٹا کر کھڑا ہونے لگا ، مگر عارف بیٹھ چکے تھے ۔ انھوں نے ہاتھ پکڑ کر اپنی برابر بٹھا لیا اور پوچھا کہ خیر ہے آج کس خیال میں مستغرق تھے ؟ مبتلا نے ٹالنا چاہا ، عارف نے اصرار کیا ''نہیں کوئی بات تو ضرور ہے جس کو تم اس قدر غور کے ساتھ سوچ رہے تھے ۔'' مبتلا غور کے بارے میں تو چچا نے مجھ پر بڑی سخت تاکید کی ہے ۔'' عارف ''بلاشبہ ان کا فرمانا درست ہے ۔ غور کے

۱- بیشتر ضمائر اور متعلقات فعل کے ساتھ 'ہی' کو الگ لکھنے کا طریقہ اب متروک ہو چکا ہے ۔ ان تمام صورتوں میں 'ہی' کو ملا کر لکھنا چاہیے : مثلاً وہی (وہ ہی) ، اسی (اس ہی) ، انھی (ان ہی) ، تمھی (تم ہی) ہمی (ہم ہی) اسی طرح ابھی (اب ہی) - جبھی (جب ہی) - تبھی (تب ہی) وغیرہ -

معنے کیا ہیں ، عقل سے کام لینا اور انسان نے اگر عقل ہی سے کام نہ لیا تو اُس میں اور دوسرے حیوانات میں کوئی مابہ‌الامتیاز نہیں ، مگر پوچھنے سے میری غرض یہ تھی کہ اگر وہ بات مجھ پر ظاہر ہو تو جہاں تک مجھ سے ممکن ہو تمہاری مدد کروں ۔ تمہارے چچا نے ، جن کو میں اپنے والد کی جگہ سمجھتا ہوں تم سے غور کرنے کو کہا اور مجھ سے تمہاری مدد کرنے کو ۔ پس اگر تم ان کے کہنے کے مطابق غور کرتے ہو تو اُن ہی کے ارشاد کے موافق مجھ سے مدد بھی لو ۔ مبتلا ''جس بات کو میں سوچ رہا تھا ، اکثر سوچا کرتا ہوں ، مگر ابھی تک کچھ سمجھ میں نہیں آیا ، تاہم اتنا تو جانتا ہوں کہ آپ سے اُس میں کچھ مدد ملنے کی توقع نہیں ۔'' عارف ''جب تک تم اس بات کو مجھ سے بیان نہ کر لو اور میں جواب نہ دے دوں کہ میں کچھ نہیں کرسکتا اس وقت تک تم کو میری مدد سے نا اُمید ہونے کا کوئی محل نہیں'' ۔ مبتلا ''اچھا تو آپ مدد کرنے کا وعدہ کرتے ہیں ؟'' عارف ''اجی تم سے کیا وعدہ کروں گا میں تو وعدہ کرچکا ہوں جناب میر متقی صاحب سے ۔'' مبتلا '' اس خاص بات کا اُس وقت تک کچھ مذکور نہ تھا'' عارف ''مجھ سے جناب میر صاحب نے کسی بات کا مذکور نہیں کیا ۔ عام طور پر تمہاری مدد کرنے کو فرمایا اور میں نے اُس کو تسلیم کیا ؛ اس سے بڑھ کر اور وعدہ کیا ہوگا ۔'' مبتلا ''آپ کو میری خانہ‌داری کے حالات معلوم ہیں؟ عارف ''جس قدر حالات جناب میر صاحب کو معلوم تھے مجھ کو بھی معلوم ہیں ۔'' مبتلا ''بھلا چچا باوا نے آپ سے میری خانہ‌داری کے بارے میں کبھی کچھ کہا تھا ؟'' عارف ''اکثر اس بات کا سخت افسوس کیا کرتے تھے کہ بی بی کے ساتھ تمہارا معاملہ درست

نہیں۔'' مبتلا ''نادرستی معاملہ سے ان کی کیا مراد تھی ؟'' عارف ''مراد یہ تھی کہ تم کو بی بی کے ساتھ انس نہیں ، محبت نہیں۔'' مبتلا ''بھلا اس کا کچھ سبب بھی انھوں نے بیان کیا تھا۔'' عارف ''ہاں یہ فرماتے تھے کہ تمھارے مزاج میں آوارگی ہے ، حسن پرستی کے مزے پڑے ہوئے ہیں۔ دل میں یہ خبط سما رہا ہے کہ میں حسین ہوں۔ بی بی نظروں میں بھرتی نہیں۔'' مبتلا ''کیا چچا باوا اس بارے میں بھی کچھ کرنے کو تھے ؟'' عارف ''بیشک ، فرماتے تھے کہ مطالب کو تو میں نے اپنے ذھن میں ترتیب دے لیا ہے ، اب موقع کی تاک میں ہوں۔'' مبتلا ''شاید ان کا ارادہ تھا کہ اس پر بھی کوئی وعظ کہیں ، مگر بھلا ہوا اس کی نوبت نہ آئی ، ورنہ چاروناچار مجھ کو مخالفت کرنی پڑتی۔'' عارف ''کچھ تم نے پہلے وعظ کی مخالفت کی ہوگی کہ اس کی کرتے۔'' مبتلا ''پہلے وعظ میں چچا باوا نے کسی بات میں واقعات کی مخالفت نہیں کی ، اس سے میں نے ان کی مخالفت نہیں کی ، مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خوب صورتی کے بارے میں وہ کہتے تو کیا کہتے۔'' عارف ''میں نہیں کہہ سکتا کہ کیا کہتے ، مگر اتنا انھوں نے ضرور کہا تھا کہ جس قدر اس کو حسن کے ساتھ فریفتگی ہے ان شاءاللہ اسی قدر نفرت کرنے لگے تو سہی۔'' مبتلا (چونک کر) ''میں اور حسن سے نفرت ! تو یوں کہیے کہ میرے سر سے دماغ کو اور دماغ سے عقل کو اور عقل سے سلامت کو سب کو سلب کرلینے کے فکر میں تھے۔ بھلا آپ چچا باوا کے اس ارادے کی نسبت کیا خیال کرتے ہیں ؟'' عارف ''میں تو جناب میر صاحب کی شان کو اس سے بہت ارفع سمجھتا ہوں کہ غلط بات ان کے منہ سے نکلے یا ان کے کلام میں مبالغہ ہو۔ ان کو خدا نے علم کی ، دین داری

کی ، خلوص کی ، خیر خواهئی خلائق کی ، گویائی کی بہت سی قوتیں دی ہیں ۔ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ انھوں نے چھٹانک بھر کو کہا تو من بھر کر دکھاتے ، مگر افسوس ہے کہ یکایک ان کا چلنا ٹھہر گیا'' ۔ مبتلا ''آپ بھی تو اُن کے شاگرد رشید ہیں ، حسن سے نفرت نہیں تو خیر اتنا ہی کیجیے کہ کسی طرح میری یہ شورش تو فرو ہو کہ مجھے اس تصور میں نہ رات کو نیند ہے نہ دن کو قرار ہے ۔ یہ کیا بلا میرے سر پر سوار ہے !'' عارف '' کبھی تم نے اس بات پر غور کیا ہے کہ حسن کیا چیز ہے اور لوگوں کو اس قدر فریفتگی حسن کے ساتھ کیوں ہے؟'' مبتلا ''یہ تو کوئی غور کرنے کی بات نہیں ہے ۔ مرد، عورت، بوڑھا ، جوان ، شہری ، دیہاتی ، خواندہ ، نا خواندہ ، ہر شخص جانتا اور سمجھتا ہے کہ خوب صورتی اس کو کہتے ہیں ۔ تفصیل پوچھیے تو تمام شاعروں نے معشوقوں کے سراپا لکھے ہیں ۔ آپ کی نظر سے بھی تو ضرور گزرے ہوں گے ۔ رند لکھنوی کا سراپا ''مرقع خوبی'' میرے نزدیک سب سے بہتر ہے ۔ اس سراپا میں کئی باتیں خاص ہیں ۔ اول تو سر سے لے کر ناخن پا تک کسی عضو کو نہیں چھوڑا ۔ دوسرے ، مردوں کا سراپا الگ ہے اور عورتوں کا الگ ۔ تیسرے ، اعضاء کی ساخت کے علاوہ اُن کی حرکات کی خوبیاں بھی بیان کی ہیں ۔ چوتھے ، حسن خلقی اور حسن مصنوعی کا تفرقہ بڑے عمدہ طور پر دکھایا ہے ۔ غرض جو کچھ شعراء کے سراپاؤں میں ہے وہی حسن ہے ، اور یہ جو آپ نے پوچھا کہ لوگوں کو اس قدر فریفتگی حسن کے ساتھ کیوں ہے ، تو یہ میرے نزدیک انسان کی طبیعت کا خاصا ہے اور اس کے واسطے سوائے اس کے کہ آدمی کی طبیعت ہی خلقۃً حسن کی طرف راغب واقع ہوئی ہے اور کوئی وجہ

درکار نہیں ۔ آپ کا یہ سوال بجنسہ اسی طور کا ہے جیسے کوئی پوچھے کہ کہربا گھاس کو اور مقناطیس لوہے کو کیوں کھینچتا ہے ، آگ کیوں جلاتی ہے ؟'' عارف ''شعراء نے جو خیالات سراپاؤں میں ظاہر کیے ہیں ، آپ کی سمجھ میں آتا ہے اُن کا ماخذ کیا ہے ۔'' مبتلا ''میرے نزدیک ان تمام خیالات کا ماخذ وہی طبیعت انسانی ہے جو حکم کرتی ہے کہ اس عضو کو اس وضع اور اس ساخت اور اس انداز کا ہونا چاہئے ۔'' عارف ''ہاں ، لیکن اگر یہ خیالات طبعی ہوتے تو ضرور تھا کہ سب آدمیوں کے ایک ہی طرح کے ہوں ، کیوں کہ آدمی آدمی انسانیت میں سب یکساں ہیں تو اس کے یہی معنی ہیں کہ طبیعت انسانی سب میں یکساں ہے ، اور طبیعت یکساں ہوئی تو چاہئے کہ سب کے تقاضے یکساں ہوں ، مگر ہم دیکھتے ہیں جو ایک کے نزدیک مطبوع ہے دوسرے کے نزدیک مکروہ ؛ مثلاً بڑی خوب صورتی رنگ کی ہے ؛ کہتے بھی ہیں ایک رنگ ہزار ڈھنگ ، لیکن رنگ کے بارے میں مذاق اس قدر مختلف ہیں کہ گورا ، سرخ و سفید ، گندم گوں ملیح ، چمپئی وغیرہ ، کتنی قسم کے رنگ ہیں جن کے پیچھے ہمارے ملک کے لوگ سر دھنتے ہیں ، لیکن فرض کرو کہ ان رنگوں میں سے کسی رنگ کا آدمی افریقہ میں جا نکلے تو وہاں اس کی کیسی قدر ہوگی جیسی کہ ہمارے یہاں جذامی کی یا مبروص کی ۔ افریقہ کے باشندے بھی آدمی ہیں ، اُن کی طبیعتوں میں بھی ایسے ہی جوش اور ایسے ہی ولولے پائے جاتے ہیں ۔ عشق و محبت اُن میں بھی ہے ۔ ان میں بھی حسین ہیں ، مگر اُن کے سراپا تمہارے سراپا سے بالکل مختلف ۔ خاص خاص اعضاء کی نسبت بھی مذاقوں کے اختلاف کا یہی حال ہے ۔ ہم پسند کرتے ہیں بالوں کی سیاہی

جس کو ہمارے شعراء تشبیہ دیتے ہیں شب دیجور سے ، کالی گھٹا سے ، مار سیاہ سے ، عاشق کی تیرہ بختی سے ، ظلمات سے ، اور اہل یورپ چاہتے ہیں بھورے بال ، سونے سے ہم رنگ اور سونا بھی ہندوستان کا نہیں کیلیفورنیا کا پیتلی ۔ ہم ڈھونڈتے ہیں آنکھ موتی چور ، جس کی پتلی سیاہ ہو ؛ صاحب لوگ نیلی کرنجی ؛ چینیوں کی نسبت مشہور ہے کہ کمانیاں چڑھا چڑھا آخر ناک کو بٹھا چھوڑا ، کیوں کہ ان کے نزدیک ناک کی اٹھان سے چہرہ ناہموار ہوتا تھا ۔ عورتوں کے پاؤں کو کیسا شکنجے میں کسا کہ کھڑے ہونے سے اُن کا مرکز ثقل ہی ٹھکانے پر نہیں رہتا ۔ ناچار گر گر پڑتی ہیں ۔ ہمارے یہاں دانتوں کا وصف ہے صفائی اور چمک ، چینیوں میں تیرگی اور سیاہی ۔ افریقہ میں عورتیں دانتوں کو سوہن کرا کے آرے کا ہم شکل بناتی ہیں ۔ انگریزنیں ساری دنیا کی عورتوں پر ہنستی ہیں ، کسی کے گہنے پر ، کسی کے لباس پر ، کسی کے بالوں کی بندش پر ، کسی کے بناؤ سنگھار پر اور خاص کر چینیوں پر ، اور اُن کا کہنا یہ ہے کہ انسان کی اصلی خوب صورتی اُس کی قدرتی بناوٹ میں ہے ، مگر جس وقت اپنی بہنوں پر جو دوسرے ملکوں کی رہنے والیاں ہیں ، ہنستی ہیں ، اُن کو اپنی کمر یاد نہیں رہتی ۔ مختلف ملکوں کی تاریخیں اور جغرافیے پڑھو تو معلوم ہو کہ حسن کی نسبت لوگوں کے خیالات کس قدر مختلف ہیں ۔ قومی اختلافات سے اُتر کر شخصی اختلافات پر آؤ تو ہر جگہ وہی معاملہ ہے کہ لیلیٰ را بچشم مجنوں باید دید ۔ غرض جہاں تک غور کیا جاتا ہے حسن کا کوئی مفہوم معین نہیں ٹھہرتا ۔ پس مفہوم حسن کو انسان کا طبعی خیال سمجھنا غلط ہے ، بلکہ وہ ایک شخصی خیال ہے ۔'' مبتلا ''یہ تو ایک

لفظی بحث ہے ۔ حسن کی نسبت میرا خیال طبعی ہو تو ، اور شخصی ہو تو ، نتیجہ واحد ہے کہ مجھ سے بدون حسن کے صبر نہیں ہو سکتا ۔'' عارف ''واہ وا ! لفظی بحث کی بھی خوب کہی! اجی حضرت یہ تو علم اخلاق کا ایک بڑا ضروری مسئلہ ہے ۔ جتنی باتیں طبعی ہیں ، یعنی تقاضائے طبیعت انسانی سے سر زد ہوتی ہیں کسی کے روکے رک نہیں سکتیں ۔ ان کی تبدیل میں کوشش کرنا محض لا حاصل ہے اور مطلق بے سود ، مگر جن کو میں نے شخصی سے تعبیر کیا ہے ، ضرورتیں ہیں ادعائی ، حاجتیں ہیں تکلفی ، جن کو آدمی عموماً نہیں ، بلکہ افراد خاص اپنے اوپر لازم کر لیتے ہیں۔ اگرچہ ادعائی ضرورتوں کا تقاضا کبھی طبعی ضرورتوں سے بھی زیادہ سخت ہوتا ہے ، مگر پھر بھی چونکہ تقاضائے طبیعت نہیں ہے ، اس کی شورش کو فرو ، اس کی تیزی کو مدھم کرنا ممکن ہے ۔ مثلاً مطلق کھانا پینا تقاضائے طبیعت انسانی ہے اور کسی تدبیر سے یہ خواہش دفع نہیں ہو سکتی ، مگر خاص قسم یا خاص ذائقے یا خاص کیفیت کے کھانے کا التزام تقاضائے طبیعت انسانی سے خارج ہے ۔ جو لوگ شراب یا افیون یا مدک[۲] یا چنڈو یا گانجے یا چرس یا تاڑی یا حقے یا کسی قسم کے نشے کی عادت ڈال لیتے ہیں ، اس کی طلب میں ایسے بےقرار ہو جاتے ہیں جیسے بھوبھل میں مچھلی ، تاہم یہ ایک ضرورت ہے جس کو اُن کی طبیعت شخصی تقاضا کرتی ہے ، نہ طبیعت انسانی ۔

۲- یہ منشیات کی مختلف قسمیں ہیں ۔ مدک اور چنڈو کو افیون سے بناتے ہیں اور حقے پر رکھ کر پیتے ہیں ۔ گانجے اور چرس کو بھنگ کے پتوں سے تیار کرتے ہیں اور لمبی سی چلم پر رکھ کر کش لگاتے ہیں ۔ تاڑی تاڑ کے درخت کا رس ہے ۔ اسے اگر تازہ تازہ طلوع آفتاب سے پہلے پئیں تو نشہ آور نہیں ہوتی ، پھر اس میں نشہ پیدا ہوتا ہے ۔

اسی طرح خداوند تعالیٰ کی حکمت کاملہ نے نوع انسان کے باقی رہنے کے لیے ایک قاعدہ ٹھہرا دیا ہے کہ دو طرح کے آدمی بنائے، مرد اور عورت اور دونوں کے لیے عمر کا ایک وقت مقررہ کر دیا کہ جب اُس حد پر پہنچیں تو دونوں میں از خود ایک دوسرے کی طرف رغبت پیدا ہو۔ بس یہاں تک اور صرف یہیں تک تقاضائے طبیعت انسانی ہے جیسے مطلق غذا، اور اس سے بڑھ کر کہ جس طرف رغبت کرتا ہے پورا یا ادھورا رند کے سراپا کا مصداق ہو، از قبیل نشہ ہے، اور جہاں انسان کی اور ہزار ہا لغویات ہیں کہ شاید دس ہزار آدمیوں میں ایک بھی ان سے محفوظ نہیں، ایک طرح کی لغویت حسن پرستی بھی ہے۔ بھلا کوئی مجھ کو اتنا تو سمجھا دے کہ طبیعت انسانی جس رغبت کا تقاضا کرتی ہے اس سے اور رند کے یا کسی دوسرے شاعر کے سراپا سے کیا مناسبت؟'' مبتلا ''میں ایسا سمجھتا ہوں کہ اُسی رغبت میں جس کا طبعی ہونا آپ تسلیم کرتے ہیں، سراپا کو ایسا مدخل ہے جیسا غذا میں مسالے[۳] کو۔'' عارف ''بالکل غلط۔ مسالہ جزو غذا ہوتا ہے، داخل غذا اور خود غذا۔'' مبتلا ''حسن کی نسبت آپ کی رائے تمام دنیا کی رائے کے خلاف ہے، اور اگرچہ بادی النظر میں آپ کی دلیل لاجواب معلوم ہوتی ہے، مگر چونکہ فی الواقع ایک عالم فریفتہ حسن ہے اور ازاں جملہ میں بھی ہوں، گو آپ کو قائل نہ کر سکوں، تاہم دل ہے کہ حسن کے تصور سے پگھلا جاتا ہے۔'' عارف ''اگر دنیا عبارت ہے ان لوگوں سے جن کو تمہاری طرح حسن پرستی کا خبط ہے تو بلا شبہ تمہارا کہنا درست ہے، مگر زیادہ نہیں تو اپنی ہی معرفت کے مثلاً دس

۳۔ لوگ اس کو مصالحہ بھی کہتے ہیں، کیونکہ ان چیزوں سے کھانے کی اصلاح ہوتی ہے، لیکن اگر لفظ اردو سمجھیں تو کیا حرج ہے *۔

گھر معین کرو اور دیکھو کہ ان میں کتنے آدمی ھیں ، پھر ان میں اپنے جیسے عاشق مزاج منتخب کرو ، تب تم کو معلوم ھو کہ جنون عشق عالم گیر ھے یا نہیں ، اور ایک بات میں تم سے اور بھی کہتا ھوں کہ یہ تمام خرمستیاں پیٹ بھرے کی ھیں ۔ ایک ، اور دوسرے یہ روگ اکثر شہریوں ھی کو ھوتے دیکھا ، اور تم نے اپنے دل کا جو حال بیان کیا اس کو میں مانتا ھوں ، لیکن برا مت ماننا ، مدرسے کے تمام طالب العلموں میں تم سب سے زیادہ معروف و مشہور تھے ، مگر کس بات میں ؟ مدرسے کے چند آوارہ اور بد وضع نوجوان لڑکے تمھاری بت کا دم بھرتے تھے اور انھوں نے گفتار سے کردار سے یہ بات تم پر ثابت کر دی تھی کہ تم بھی حسین ھو ۔ آدمی[۴] فر بہ شود از راہ گوش ؛ سنتے سنتے وہ خیال تمھارے ذھن میں راسخ ھو گیا ۔ جب خود جوان ھوئے اس خیال کا پیرایہ بدل گیا ۔'' شعر !

عاشق ھوئے ھیں آپ بھی ایک اور شخص پر
بارے ستم کی کچھ تو مکافات چاھیے

مبتلا ''آپ مولوی ھو کر آداب مناظرہ کا لحاظ نہیں رکھتے ۔ آپ کا دعویٰ یہ ھے کہ حسن کی نسبت لوگوں کے خیالات طبعی نہیں ، بلکہ شخصی ھیں اور اس دعوے کے اثبات میں آپ میری خاص حالت سے استدلال کرتے ھیں ۔ دعویٰ عام ھے اور دلیل خاص ۔ دنیا میں ھزار ھا آدمی حسن پرست ھیں تو کیا سب کی حسن پرستی کا یہی سبب ھو سکتا ھے کہ میری طرح وہ بھی حسین ھیں ؟'' عارف ''تم نے اچھی طرح خیال نہیں کیا ، جیسا

۴- آدمی دوسروں کی زبان سے اپنی تعریفیں سن سن کر فربہ یا مغرور ھو جاتا ھے ۔

میرا دعویٰ عام ہے ویسی ہی میری دلیل بھی عام ہے ، اور تمہارا تذکرہ تمثیلاً تھا نہ استدلاً ۔ میری دلیل یہ ہے کہ حسن کی نسبت مختلف ملک کے باشندوں اور مختلف قوموں اور مختلف شخصوں کے مذاق مختلف ہیں اور اگر طبعی ہوتے تو مختلف نہ ہوتے ۔'' مبتلا ''آپ کی دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اقتضاءات طبیعت انسانی تمام دنیا میں یکساں ہیں ، مگر میرے سمجھنے میں تو یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی ۔ میں دیکھتا ہوں کہ روئے زمین کے مختلف قطعات میں مختلف طور کی آب و ہوا اور مختلف طور کی پیداوار ہے ، اور آب و ہوا اور پیداوار کے اختلاف سے باشندوں کے طبائع کا مختلف ہونا ضرور ہے ۔ چنانچہ بعض ملکوں کے لوگ آرام طلب ہوتے ہیں اور بعض کے جفاکش؛ بعض کے غصیلے، زود رنج ، بعض کے متحمل بردبار ؛ بعض کے بہادر دلیر، بعض کے بزدل ڈرپوک؛ بعض کے سیدھے سادے ، بعض کے مفسد چالاک اور بایں ہمہ اختلافات یہ سب خصائص طبعی سمجھے جاتے ہیں ۔ اسی طرح حسن کی نسبت لوگوں کے مذاق مختلف ہوں، ہوں، مذاق حسن پھر بھی طبعی ہی کہا جائے گا ۔'' عارف '' جن خصائص کے اختلاف پر تم مذاق حسن کے اختلاف کو قیاس مع الفارق[۵] کرتے ہو وہ خصائص طبعی اور کیمیائی ہیں ۔ آب و ہوا اور غذا کی حرارت اور برودت اور رطوبت اور یبوست خون پر اثر کرتی ہے ۔ گرم ملکوں کے لوگوں کے مسامات کشادہ ، خون گرم اور رقیق اور اس کی گردش تیز ، اور سرد ملکوں میں اس کے بالکل خلاف ، اور یہی وجہ ہے کہ گرم ملکوں کے لوگ آرام طلب، غصیلے اور بزدل اور ذہین ہوتے ہیں ، لیکن آب و ہوا اور غذا کو اس

۵- یعنی ایک شے کے بارے میں اس سے مختلف شے قیاس کرنا جبکہ باہم کوئی مناسبت نہ ہو ۔

طرح کا مدخل مذاق حسن میں ہو نہیں سکتا ، اور اگر ہے تو اس کا ثابت کرنا تمہارا کام ہے ۔ ہاں اگر یہ کہو کہ بعض گرم ملکوں کے لوگوں میں توالد تناسل کی رغبت جلد پیدا ہوتی ہے یا وہ لوگ اس رغبت پر زیادہ حریص ہوتے ہیں تو میں اس کو مانتا ہوں ، کیونکہ مطلقاً اس رغبت کا طبعی ہونا مجھ کو تسلیم ہے ۔ رہی عجلت اور حرص دونوں حرارت کے آثار کیمیائی ہیں ، مگر ہر پھر کر وہی بات آئی کہ اس رغبت طبعی کو شاعروں کے سراپا سے کہ وہی حسن ہے ، کیا تعلق ؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی شخص دوسرے شخص کے کسی عضو کو بے سبب بے غرض بے مطلب کیوں اچھا یا برا کہہ سکتا ہے ۔ مثلاً تمہاری ناک سے اگر کسی کی کوئی غرض متعلق ہو سکتی ہے تو وہ تم ہی ہو کہ تم اس سے سونگھتے یا سانس لیتے ہو ۔ اگر تمہاری ناک تمہارے کام اچھی طرح دیتی ہے تو وہ اچھی ہے ، مگر تمہارے لیے ؛ میرا کون سا مطلب تمہاری ناک سے اٹکا ہے کہ میں اس کو اچھا یا برا سمجھوں ؟ اور یہی حال ہے تمام سراپا کا جس کے پیچھے رنڈنے جز کے جز سیاہ کیے ہیں ۔ غرض تم کو دو باتیں ثابت کرنی چاہئیں ، اول یہ کہ مذاق حسن تقاضائے طبیعت انسانی ہے ، دوسرے یہ کہ توالد تناسل کی رغبت طبعی میں اس کو مدخل ہے ۔'' مبتلا ''ابھی تو میں اسی بات کو سوچ رہا ہوں کہ لوگوں میں مذاق حسن مختلف کیوں ہیں'' عارف ''میں نے ان باتوں کو برسوں سوچا ہے ۔ آخر اس بات سے دل کو تسلی ہو گئی کہ حسن صورت فی نفسہ کوئی چیز نہیں ۔ پھر یہ خیال پیدا ہوا تو کہاں سے پیدا ہوا ؟ پہلے ذہن اس طرف منتقل ہوا تھا کہ شاید حسن کا ماخذ علم قیافہ ہو ، یعنی انسان کی روح اور جسم میں

ایک تعلق ہے ، ایسا کہ اعضاء کی ساخت اور وضع سے اُس کے دلی خیالات اور اخلاق پر استدلال کیا جاتا ہے ۔ لوگوں نے تجربے سے اس تعلق کو دریافت کرکے جمع کیا تو علم قیافہ مدون ہو گیا ۔ جو لوگ عام قیافہ کے بڑے ماہر ہوتے ہیں آدمی کے اعضاء کی بناوٹ سے اس کے خصائص طبیعت کو پہچان جاتے ہیں ۔ عجب نہیں کہ اعضاء کی جو وضع محاسن اخلاق پر دلالت کرتی ہو اُس کو اچھا سمجھنے لگے ہوں ، لیکن جن لوگوں کے حسن کا بڑا چرچا ہے اُن کو دیکھا تو من حیث الاخلاق سب سے بد تر پایا ۔ معلوم ہوا کہ علم قیافہ تو حسن کا ماخذ نہیں ہو سکتا ۔ آخر غور کرتے کرتے یہ بات سمجھ میں آئی کہ جس طرح اب لوگوں میں اعلیٰ اور ادنیٰ اور شریف اور وضیع اور خواص اور عوام کا تفرقہ ہے ، ایسا ہی ابتدائے دنیا میں سب لوگ تو یکساں حالت میں نہیں رہے ہوں گے ۔ جسمانی قوت یا اعوان و انصار کی کثرت یا کسی دوسری وجہ سے بعض لوگ ضرور اکابر قوم سمجھے جاتے ہوں گے ، اور قاعدہ یہ ہے کہ جس کو انسان اپنے سے بہتر اور برتر سمجھتا ہے اس کی سبھی باتیں اس کو بھلی معلوم ہوتی ہیں ۔ یوں سب سے پہلے حسن کا خیال پیدا ہوا ہو تو عجب نہیں اور پھر تو مثل دوسرے خیالات کے یہ خیال بھی اباً عن جد متوارث ہوتا چلا آیا ، اور یہی سبب ہے ملکوں میں مذاق حسن کے مختلف ہونے کا کہ ہر ملک میں جو شخص سب سے بہتر اور برتر تھا لوگوں نے اس ہی کو نمونۂ حسن قرار دے لیا ۔ تم نے نپولین شاہ فرانس کی تصویر تو دیکھی ہوگی ، اس کی داڑھی تھی چگی اور ڈاڑھی کی خوب صورتی ہے بھری ہوئی گول ، مگر نپولین کے دیکھا دیکھی سارے فرانس نے اپنی ڈاڑھیاں چگی کر لیں اور اسی کو شعار خوب صورتی ٹھہرا لیا اور چگی داڑھی

کا نام رکھا امپیریل بیرڈ ، یعنی شاہانہ ڈاڑھی ۔ ہم لوگوں میں جو انگریزی وضع کھانے میں ، پینے میں ، لباس میں ، نشست و برخاست میں ، طرز تمدن میں ، ہرچیز میں ، وبا کی طرح پھیلتی جا رہی ہے ، اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ انگریز ہیں وقت کے حاکم ، ان کی تمام ادائیں خوشنما لگتی ہیں اور ہم لوگوں کے مذاق ہیں کہ یوماً فیوماً انگریزی طور کے ہوتے چلے جاتے ہیں ۔ تغیر خلقت تو اختیاری بات نہیں ، مگر رفتہ رفتہ مہندی اور وسمے کے عوض ہمارے یہاں کے بڈھے انڈے کی زردی[۶] کا خضاب تو ضرور کرنے لگیں گے۔ حسن کی نسبت شخصی مذاقوں کی تاویل چنداں مشکل نہیں ۔ ایک شخص میں تمام محاسن صورت کا جمع ہونا تو کم یاب ہے اکثر یوں ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑے حسینوں میں بھی دو چار نقص ضرور ہوتے ہیں ۔ اب یہ پسند کرنے والے کی تجویز پر منحصر رہا کہ چاہے جس پہلو کو ترجیح دے ۔ بعضے رنگ پر مرتے ہیں اور بعضے نقشے کی نزاکت پر نظر کرتے ہیں ؛ بعضے حسن و ادا کے خریدار ہیں اور بعضے دام زلف کے گرفتار ۔'' مبتلا ''حسن اگر خصائص انسانی سے ہوتا تو جو ماخذ آپ نے بیان کیا بلاشبہ قابل تسلیم تھا ، مگر جمادات، نباتات، حیوانات، غرض تمام موجودات میں کوئی چیز حسن سے خالی نہیں ۔ والد مرحوم زندہ تھے کہ ایک مقدمے کی پیروی کے لیے انھوں نے ناظر بھائی کو گرمیوں کے دنوں میں نینی تال بھیجا اور مجھ کو ان کے ساتھ کیا ۔ یوں تو پہاڑ دھندلا دھندلا کئی منزل سے نظر آتا تھا ، مگر تین چار کوس کے فاصلے سے تو ہم اس کو اچھی خاصی طرح سموچا دیکھنے لگے ۔ وہ صبح کا وقت اور پہاڑ کی چوٹیوں پر سفید براق

۶۔ کیونکہ انگریزوں کے بال عموماً سنہری رنگت کے ہوتے ہیں ۔ یہاں انگریزوں کے اندھے مقلدوں پر طنز ہے ۔

برف ، گویا سنگھار میز پر بڑا آئینہ لگا ہے کہ آفتاب سوتا اٹھ کر پہلے شبنم سے منہ دھوئے اور پھر اپنا چہرہ اس آئینے میں دیکھے ، اور جب چوٹیوں کے گرداگرد شفق کی سرخی اور دامان کوہ کی سبزی پر آنکھ پڑتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک نازنین گلابی دوپٹہ اوڑھے اور ہری پشواز پہنے غور سے کھڑا ہوا[۷] ، آس پاس کی چیزوں کی سیر دیکھ رہا ہے ۔ شروع میں تھوڑی دیر تک تو اس کا شعور تھا کہ واقع میں پہاڑ ہے اور ہماری قوت متخیلہ نے اس کو نازنین اور شفق و سبزے کو اس کا لباس رنگین بنا لیا ہے ، مگر آفتاب کی کرن نکلتے ہی اوپر برف کے کنارے اور نیچے ندی نالے سارے جگمگا اٹھے ، جیسے عین مین سچا گوٹا ۔ اب تو جو خیال تھا وہ حقیقت‌الحال ہو گیا ۔ قوت نامیہ کا ہر طرف یہ زور شور کہ چپہ بھر جگہ سبزۂ خود رو سے خالی نہیں ۔ شاعر تو سبزے کو خوابیدہ باندھتے ہیں ، مگر وہاں کا سبزہ بیدار ، ہوا کے جھکولوں سے ہر وقت متموج بلا تصنع اس وقت تو یہی خیال میں آتا تھا کہ ہوا کے گدگدانے سے پہاڑ کے پیٹ میں ہنسی کے مارے بل پڑ پڑ جاتے ہیں ۔ دونوں ہاتھوں سے پگڑی سنبھال کر درختوں کو دیکھو تو ایسا شبہ ہو کہ آسمان کی چھت بہت پرانی ہو چلی تھی ، شاید اس کی اڑواڑیں ہیں ۔

۷- مصنف کی زندگی میں اس ناول کے جو دو ایڈیشن شائع ہوئے تھے دونوں میں ''کھڑا ہوا'' ''دیکھ رہا ہے'' چھپا ہے ۔ چوتھے ایڈیشن میں جو مولوی منذر احمد صاحب (نبیرۂ نذیر احمد) کی زیر نگرانی شائع ہوا تھا، تذکیر کے صیغوں کو تانیث میں بدل دیا گیا اور بعد کے تمام ایڈیشنوں میں اسی کی پیروی کی گئی اگرچہ دوپٹہ اور پشواز کے ساتھ ''نازنین'' کی تذکیر کو ذوق سلیم گوارا نہیں کرتا ، لیکن متن میں اصلاح و ترمیم کا حق تو بہر حال کسی کو نہیں پہنچتا ، خواہ مرتب مصنف کا بیٹا یا پوتا ہی کیوں نہ ہو ۔

رنگ برنگ کے جانور پھدک پھدک کر ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر اس طرح اڑتے پھرتے تھے کہ گویا جگہ جگہ چوتھیاں کھیلی جا رہی ہیں ۔ غرض ہر چیز پر ایک قدرتی جوبن تھا کہ جی بے اختیار لوٹا چلا جاتا تھا ۔ ایسے کسی موقع پر آپ کے جانے کا اتفاق ہو تو آپ کو معلوم ہو کہ حسن ایک کیفیت خدا داد ہے ، ہر جگہ ہے اور ہر چیز میں ہے ۔ اسی نینی تال کے راستے میں ایک ندی ملی تھی ، اُس میں پتھر کی ہزارہا بٹیاں تھیں ، اُن میں بھی جو سڈول تھی نہایت بھلی معلوم ہوتی تھی ۔ دنیا کی تمام صنعتیں ، تمام دست کاریاں کس غرض سے ہیں ، صرف اتنی ہی بات کے لیے کہ چیزوں میں حسن پیدا ہو ۔ کسی انگریزی شاپ (دکان) میں میرے ساتھ چلیے تو میں آپ کو دکھا دوں کہ صرف مکان کی آراستگی کے لیے کیسا کیسا اسباب انگریزوں کی ولایت سے بن کر چلا آ رہا ہے ۔ زندگی کے تمام ساز و سامان میں کون سی چیز ہے جس میں خوبی نہیں ، اور یوں آدمی آنکھوں پر ٹھیکری دھر لے اور بداہت کا انکار کرے تو اس کا علاج نہیں ۔ حسن کو تقاضائے طبیعت ماننا آسان ہے یا ایک عالم کو مجنوں اور مبتلائے خبط ؟'' عارف ''بات کو بہت طول ہوتا جاتا ہے اور حجت اور تقریر سے کبھی کسی بات کا تصفیہ ہوا نہیں اور مدت العمر کے جمے ہوئے خیال کا دفعۃً دل سے نکلنا بھی مشکل ۔ میں تم کو اتنی نصیحت کرتا ہوں کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اُس کو مختلف اوقات میں تم خود سوچو اور میں نے بھی یہی کیا تھا کہ مدتوں خود غور کرتا رہا ۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ آخر کار تم میری رائے کے ساتھ اتفاق کرو گے یا نہ کرو گے ، مگر اس کا تو مجھ کو پورا یقین ہے کہ ان شاءاللہ تمہاری یہ شورش تو ضرور فرو ہو جائے گی ۔

جس طرح تم دوسری چیزوں کا استحسان کرتے ہو ، یعنی مثلاً نینی تال کی سیر سے تمھاری طبیعت کو ایک طرح کی تفریح ہوئی ، اگر اسی طرح کی تفریح تم کو خوبصورت آدمی کے دیکھنے سے ہو تو اس میں میرےزدیک کوئی اعتراض کی بات نہیں ، بلکہ اس استحسان کو تم تقا نائے طبیعت بھی سمجھو تو چنداں مضایقہ نہیں، مگر دل میں انصاف کرو کہ اس استحسان کو اس استحسان کے ساتھ کیا مناسبت ؟ اور فرض کرو کہ استحسان مردم ، یعنی حسن پرستی جیسا تم کہتے ہو تقاضائے طبیعت انسانی ہی سہی تو طبیعت انسانی کے اور بہت سے تقاضے ہیں ، مگر چار و ناچار ان کو روکنا اور ضبط کرنا پڑتا ہے ۔ سب میں زیادہ شدید تقاضا غذا کا ہے ، تا ہم بعض اوقات طبیب حکم دیتا ہے کہ فاقہ کرو اور فاقہ کرتے ہیں ، یا غریب آدمی کو ایک وقت کھانا میسر نہیں آتا اور وہ انتڑیوں کو مسوس کر رہ جاتا ہے ۔ اسی طرح تقاضائے حسن پرستی مطلق العنان تو رہ نہیں سکتا ۔ حسن کم یاب اور اس کے خواہاں بہت ۔ معشوقوں کے غمزہ و ادا سے شہید ہونے کا انتظار بھی نہ کریں ، آپس ہی میں رقابت کی وجہ سے لڑ مریں اور مشکل یہ ہے کہ کمیابی ٹھہری شرط حسن ، کیونکہ اگر حسین کثرت سے ہوں تو حسن ۔ قدر ہو جائے ، کوئی اس کی طرف رغبت بھی نہ کرے ۔ پس حسن پرستی فی‌نفسہا ایسی خواہش ہے کہ ہزار خواہشوں میں ایک کی کامیابی کی بھی توقع نہیں ۔ تو کیوں آدمی ایسی حالت اپنے پیچھے لگائے کہ اس سے سوائے رنج کے اور کچھ ہاتھ نہ آئے ۔ موقع پر آئی ہوئی بات کہنی پڑتی ہے ، تم کو معلوم ہے کہ واقعی اور ادعائی ضرورتوں کی شناخت کیا ہے ؟ قاعدہ یہ ہے کہ جو چیز جس قدر زیادہ سہولت سے میسر آ سکتی ہو بس جان لو کہ ہم کو اسی

قدر زیادہ اس کی حاجت ہے ؛ مثلاً ہوا اور پانی اور غلہ سب ضرورت ہی کی چیزیں ہیں ؛ غلے سے زیادہ پانی اور پانی سے زیادہ ہوا ، مگر ہوا سب سے زیادہ سہل الحصول ہے ، پانی اس سے کم اور غلہ اُس سے بھی کم ۔ اسی طرح لوہا اور چاندی اور سونا اور موتی اور جواہرات ۔ سب سے زیادہ بکار آمد لوہا ہے اور اُسی کی زیادہ افراط ہے ۔ پس حسن اگر حقیقت میں ہم کو درکار ہوتا تو ضرور تھا کہ اُس کی افراط بھی ہوتی اور افراط ہوئی تو پھر حسن کہاں ! حسن تو اُسی وقت تک حسن ہے کہ اس کے دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہوں ۔'' مبتلا ''آپ کا یہ فرمانا بالکل ٹھیک ہے کہ حسن کم یاب ہے اور جو ہے اس پر دست رس کا ہونا مشکل ، اور میں اسی سوچ میں بیٹھا تھا کہ آپ تشریف لائے ، مگر دنیا کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں بھی مشکلیں پیش آتی ہیں اور یہ تو وہ لذتیں ہیں کہ دنیا کے سارے مزے اس کے آگے ہیچ ہیں ، بلکہ میں تو ایسا سمجھتا ہوں کہ جب تک لذت حسن کا شمول نہ ہو دنیا کی کسی چیز میں کوئی مزہ ہی نہیں ، تو ایسے عمدہ مطلب کے حصول میں اگر جان تک کی بھی جوکھوں ہو تو کیا مضائقہ ۔ اتنا خدا کا شکر ہے کہ دوسروں کو محال ہے اور مجھ کو آسان ۔'' عارف ''کیوں تم میں خصوصیت کیا ہے ، کیا تم کہیں کے حاکم ہو یا تمہارے یہاں کچھ دولت پھٹ پڑی ہے ؟'' مبتلا ''بس آپ کے نزدیک تو دنیا میں حکومت اور دولت دو ہی چیزیں ہیں ۔ اجی حضرت ! میں حسن کی دولت رکھتا ہوں ۔ اب چند روز ہوئے چچا باوا کے لحاظ سے میں نے آنا جانا چھوڑ دیا ، ورنہ شہر

میں ایسا کون نازنین ہے جو مجھ کو پیار نہیں کرتا[۸] ۔ ذرا میرا رخ دیکھیں تو گلے کی ہار ہو جائیں ۔ مجھ کو حسن کی کیا کمی، آج چاہوں تو ایک ریوڑ پال لوں ۔'' عارف ''لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم[۹] میں تو سمجھا تھا تم کچھ عقل رکھتے ہو ۔ اب معلوم ہوا کہ عقل اور حیا اور غیرت اور عزت اور آبرو اور مذہب کسی چیز سے تم کو بہرہ نہیں اور تمہاری حالت بڑی خطرناک حالت ہے ۔ تم تو جناب میر متقی صاحب کے پاس برسوں رہو تب کہیں جا کر آدمی بنو تو بنو ۔ تمہاری عقل کا تو یہ حال ہے کہ ابھی تک خوب صورتی کا خبط تمہارے سر سے نہیں نکلا ، تم بات بات میں اس طرح منہ بھر بھر کر اپنے تئیں حسین اور خوب صورت کہتے ہو کہ گویا حسن صورت بڑا جوہر ہے ۔ مرد ہو کر تم کو عورتوں کے ہنر پر ناز کرتے ہوئے شرم نہیں آتی ؟ ؛ خوب صورتی کے خیال سے کچھ تم ہی اپنے دل میں خوش ہوتے ہو گے ، مگر غیرت مندوں کی نظر میں تو اس گورے چمڑے نے سارے خاندان کی عزت کو ڈبو دیا اور تم کو دنیا اور دین دونوں کے کام سے کھو دیا ، اور خیر جوان ہوئے پیچھے وہ کم بخت خوب صورتی گئی گزری ہوئی تھی تو بچپن کے اس خیال کو جانے دیا ہوتا ۔ نہیں ، وہ خبط ہے کہ بدستور تازہ ہے ۔ منہ پر ڈاڑھی نکل آئی ، چہرہ پکا کینمخت ہو گیا ۔ وہ رنگ و روغن ، وہ نرمی و نزاکت کوئی چیز باقی نہیں رہی ، مگر خدا جانے وہ تمہاری خوب صورتی کس چیز سے عبارت ہے کہ اسی میں فرق

۸- اگرچہ یہاں بھی نازنین سے عورت مراد ہے لیکن وہی تذکیر کا صیغہ لایا گیا ہے - گفتگو میں اس قسم کی پردہ داری جو اب محض تکلف بے جا سمجھی جاتی ہے ، قدیم تہذیب کا خاصہ تھی -

۹- گناہ سے پھرنا اور نیکی پر قادر ہونا صرف خدا ہی کی مدد سے ہو سکتا ہے* -

نہ آیا ۔ شہر کے نازنینوں کا حال تو معلوم نہیں مگر مدرسے میں جو تمہارے چاہنے والے تھے وہ تو تمہارے رہتے ہی ایک ایک کر کے تم سے بے رخی کرنے لگے تھے اور کیا تم کو اس کا امتیاز نہ ہوا ہو گا ، اور جب تمہاری وہ لڑکپن کی کیفیت بدل گئی کہ خیر وہ ایک طرح کی خوب‌صورتی تھی بھی ، تب بھی مرد خدا تم کو تنبہ نہ ہوا کہ کیا ایسی بے ثبات اور ناپائدار چیز کے درپے ہونا جو آج ہے اور کل نہیں ۔ یہ کیفیت جو تم میں اب ہے اگرچہ اس کو خوب صورتی سمجھنا تمہارا ہی ادعا ہے ، مگر بری یا بھلی جیسی ہے اے کاش اس کو قیام ہو! ۔ جس نے تم کو بچپن میں دیکھا ہے ، اب سے چار برس بعد پہچاننے کا بھی تو نہیں کہ یہ وہی مبتلا ہے یا دوسرا شخص ہے ۔ میرے نزدیک تو خوب صورتی کا دعویٰ اب بھی تم کو زیب نہیں دیتا مگر ایک وقت آنے والا ہے تو اس کو آیا ہوا سمجھو جبکہ تم خود پکار اٹھو گے :

دریغا کہ عہد جوانی برفت جوانی مگو زندگانی برفت

ذرا خیالات کو اونچا کرو ، نظر کو تھوڑا آگے بڑھاؤ ، یہ خواہشیں جن کا تم اس قدر اہتمام کر رہے ہو ، خدا نے گدھے ، کتے ، بندر ، سور ، ذلیل سے ذلیل جانوروں کو بھی دی ہیں ، بلکہ جانوروں میں یہ قوتیں آدمی سے بہت زیادہ ہیں ۔ کیا آدمی کے لیے شرم کی بات نہیں کہ جانوروں کی ریس کرنے پر حریص ہو ۔ تم کو اس بات پر بڑا گھمنڈ ہے کہ نازنینان شہر ، یعنی بازاری عورتیں تم کو پیار کرتی ہیں ۔ یہ جھوٹی رکابیاں ، یہ چچوڑی ہوئی ہڈیاں ، یہ کھائی ہوئی قفلیاں ، کسی بھلے مانس کی غیرت تقاضا کر سکتی ہے کہ ان کو منہ لگائے یا پاس بٹھائے ۔ نری خوب‌صورتی کو، اگر ہو بھی ، لے کر کیا آگ لگانی ہے ۔ جب

کہ ان میں شرم و حیا نہیں ، مہر و وفا نہیں عفت، و عصمت نہیں ، غیرت و حمیت نہیں ۔'' مبتلا ''میں نے تو اُن لوگوں کا تذکرہ آپ سے صرف اس غرض سے کیا تھا کہ میں حسن کی خواہش کروں تو غالباً میرے لیے اس کا بہم پہنچنا کچھ دشوار نہ ہو گا ، کیونکہ میں ان لوگوں کو اپنی طرف بھی مایل پاتا ہوں ۔ مجھے دوسرا ذریعہ تقریب درکار نہیں ۔ جس دن چچا باوا تشریف لائے میں نے ان لوگوں سے ملنا جلنا قطعاً موقوف کر دیا اور آیندہ بھی میرا ارادہ ان لوگوں سے ملنے جلنے کا ہر گز نہیں ۔ چچا باوا کے آنے کا تو مجھ کو ایک حیلہ ہاتھ لگ گیا ورنہ میں نے تھوڑے ہی دنوں کے اختلاط میں ان لوگوں کو خوب آزما لیا ، بک گیا ، برباد ہوگیا ۔ چچا باوا نہ آئے ہوتے تو فاقوں پر نوبت پہنچ چکی تھی ، مگر حقیقت میں عجب بے مروت قوم ہے ۔ چندے کے بندے اور دام کے غلام ۔ اس میں شک نہیں کہ مجھ کو پیار بھی کرتے ہیں ، مگر اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ لے بھی مرتے ہیں ۔'' عارف ''الحمدللہ ! میرا جی یہ سن کر بہت خوش ہوا کہ تم کو اس نالایق گروہ سے تو نفرت ہوئی اور میں تو بھائی اس کو جناب میر صاحب کا تصرف سمجھتا ہوں ۔'' مبتلا ''خیر جو کچھ ہو ، مگر حسن پرستی کی کسک میرے دل میں باقی ہے ، وہ نہیں نکلتی ۔'' عارف ''اب بہت دیر باتیں ہوئیں ، آدمی کے دل کا حال ہر وقت یکساں نہیں رہتا ۔ انشاءاللہ پھر کسی دن موقع دیکھ کر گفتگو کریں گے ۔ اس اثناء میں تم بھی وقتاً فوقتاً سوچنا اور غور کرنا ۔ اگر خدا کو منظور ہے تو خود تمہارے ہی دل سے کوئی نہ کوئی بات ایسی پیدا ہوگی کہ اُس سے تمہاری تمکین ہو جائے گی ۔ اتنی بات تمہارے کان میں اور ڈالے دیتا ہوں کہ دنیا کے تمام معاملات کا مدار خیالات پر ہے ، شعر :

بر خیالے[۱۰] صلح شان و جنگ شاں
بر خیالے نام شان و ننگ شاں

ایک شخص کو دیکھتے ہیں کہ ایک غرض کے پیچھے دیوانہ بن رہا ہے اور اسی جیسے ہزاروں لاکھوں آدمی ہیں کہ اس غرض سے مطلق سروکار نہیں رکھتے - زندگی کے دن پورے کرنے کو گنتی کی چند چیزیں درکار ہیں اور ان کے بہم پہنچانے کے لیے کچھ زیادہ زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں - صائب نے کیا خوب کہا ہے : شعر

حرص قانع[۱۱] نیست صائب ورنہ اسباب جہاں
آنچہ من درکار دارم بیشتر درکار نیست

اور جب دوسرے لوگ ، ہمارے ہی ابناء جنس ایک چیز کے بدون خوش و خرم رہ سکتے ہیں تو اس سے بخوبی ثابت ہے کہ حقیقت میں وہ چیز داخل ضروریات زندگی ، بلکہ داخل تفریحات بھی نہیں ہے - ان لوگوں نے ایک طرح پر خیال کیا اور اس چیز پر غالب آئے اور ہم نے دوسری طرح پر سوچا اور مغلوب ہوگئے - یوں تو سوچنے اور غور کرنے کو ہزاروں باتیں ہیں ، مگر تمہاری حالت کے واسطے موت کا تصور کرنا بالخاصہ مفید ہے - اگر دن رات میں تھوڑی دیر کے لیے بھی آدمی اپنے تئیں مرتا ہوا فرض کرلیا کرے ، اور یہ تو یقینی ہے کہ ایک نہ ایک دن سچ مچ اس کو مرنا

---

۱۰ - ان کی صلح اور ان کی جنگ کا دارومدار خیال پر ہے - اسی طرح ان کا ننگ و نام اور عزت و شہرت بھی خیال ہی پر مبنی ہے -

۱۱ - حرص کب رکتی ہے صائب ورنہ اسباب جہاں
جن سے ہم الجھے ہوئے ہیں بیشتر بے کار ہیں

ہوگا تو دنیا کی بہت سی ترغیبات سے محفوظ رہ سکتا ہے اور چونکہ دین‌داری کے خیالات ابھی تمھاری طبیعت میں راسخ نہیں ہوئے ، موجبات ترغیب کے پاس نہ پھٹکنا ورنہ سارا کیا کرایا دم کے دم میں اکارت ہوجائے گا ۔

اٹھارھویں فصل

مبتلا کا دام محبت میں مبتلا ہونا

عارف تو یہ کہہ کر اس وقت رخصت ہوگیا ۔ مبتلا کے شیاطین برابر اس کی گھات میں لگے ہوئے تھے ۔ میر متقی کا جانا سنتے ہی سب نے چاروں طرف سے یورش شروع کی ۔ مبتلا تو ایک مدت سے اُدھار پر عیاشی کرھی رہا تھا ، سیکڑوں روپے اُن لوگوں کے اس پر چڑھے ہوئے تھے ۔ پہلے کے ھلے ہوئے خدا جانے میر متقی کے رھتے ہوئے بھی انھوں نے کیوں کر صبر کیا ہوگا ۔ میر متقی کا اگر جانا نہ ہوتا تو آخر ایک نہ ایک دن اس قرض کا جھگڑا اُن کے روبرو پیش ہوتا پر ہوتا اور اُن کے رو برو پیش ہوتا تو وہ عمدہ طور پر فیصلہ بھی کردیتے ۔ اب اونے پونے کیسے سوائے ڈیوڑھے کی قسط بندی پر قرضے کا چکوتا ہوا اور اُن لوگوں کے پاس آکر بیٹھنے بات کرنے سے مبتلا کی طبیعت جو میر متقی اور عارف کے سمجھانے سے کسی قدر سنبھل چلی تھی ، پھر بگڑی ۔ سامان تو ایسا بندھا تھا کہ مبتلا پھر بدستور سابق آوارہ مزاج ہوجائے ، مگر ادھر تو نصیحت کے خیالات تھے تازہ ، اور ادھر ادائے قرض کی وجہ سے مبتلا کو اُن لوگوں سے ہوئی ایک طرح نا خوشی اور تو کسی کے پاؤں نہ جمے ، مگر اب سے کوئی تین

چار برس پہلے کا مذکور ہے مبتلا کے والد اُن دنوں زندہ تھے ، اسی محلے میں مبتلا کے گھر سے ذرا فاصلے پر ایک عورت کرائے کے مکان میں آکر رہی ۔ وہ تھی تو لکھنؤ کی کوئی خانگی ، پر اس نے اپنے تئیں بیگم مشہور کیا ۔ باوجودیکہ تھوڑے ہی دنوں کی آئی ہوئی تھی مگر سارے محلے میں اس کی خوب صورتی اور لیاقت کا غل مچ گیا ۔ عیاش مزاجوں میں جو جس ڈھب کا تھا ، اپنے شوق کی چیز میں بیگم کا مداح تھا ۔ شاعر کہتے تھے فی البدیہ شعر کہتی ہے ۔ ستار بجانے والوں میں چرچا تھا کہ بول خوب بجاتی ہے ۔ تاش ، گنجفہ ، چوسر ، شطرنج کھیلنے والے ان تمام کھیلوں میں اس کے کمال کے قائل تھے ۔ ضلع جگت پھبتی ، حاضر جوابی ، پہیلی مکرنی نسبت میں سب مانتے تھے کہ اپنا جواب نہیں رکھتی ۔ اس کی خوب صورتی میں لوگ کچھ کلام کرتے تھے ، مگر اس کے جامہ زیب ہونے پر سب کو اتفاق تھا ۔ مبتلا تو خود ایسی خبروں کی ٹوہ میں لگا رہتا تھا ، اُس کو بیگم کا حال سب سے پہلے معلوم ہوا ہوگا ، لیکن باپ کے رہتے محلے کے محلے میں بد لحاظی نہیں کرسکتا تھا ، نہ جاسکا ۔ باپ کے مرے پیچھے جب مبتلا کھل کھیلا ، تو جہاں اُس نے اور نالائقیاں کیں اُن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ بیگم سے ملا ۔ شاعری اور ستار اور شطرنج اور کیا اور کیا ، یہ تو سب مبالغے تھے ، مگر اس میں شک نہیں کہ عورت تھی بڑی گویا ۔ اُس کی زبان کہے دیتی تھی کہ خواصی یا مصاحبت یا کسی دوسرے طور پر اس نے بادشاہی محلات میں ضرور تربیت پائی ہے ، یا کیا عجب ہے کہ جیسا وہ کہتی تھی خود بیگم رہی ہو ۔ لسانی کے علاوہ اس کا سلیقۂ مجلس بھی بہت ہی دل کش تھا ۔ وہ نہایت جلد آدمی کے دل کو ٹٹول لیتی

اور ہر ایک کے ساتھ اس ہی کے مذاق کی باتیں کرتی ۔ یہ عمل تھا جس کے ذریعے سے وہ لوگوں کے دلوں کو مسخر کرتی تھی ، ورنہ صورت شکل کے اعتبار سے وہ کچھ چنداں قدر کی چیز نہ تھی ۔ مبتلا کے ساتھ آنکھیں چار ہوتے ہی وہ پہچان گئی کہ یہ کوئی نیا مردوا بنا ہے ۔ اس نے مبتلا کو دور سے کھڑے ہو کر ایسے انداز کے ساتھ سلام کیا جیسے کوئی ہندو آفتاب کو ڈنڈوت کرتا ہے اور گاؤ تکیہ جس سے وہ لگی ہوئی بیٹھی تھی ، چھوڑ اپنی جگہ مبتلا کو بٹھایا اور آپ مؤدب سامنے ہو بیٹھی ۔ مبتلا نے چاہا کہ اس کو اپنے برابر بٹھائے[1] ، مگر وہ ''ایاز! قدر خود بشناس'' کہہ کر پہلو پر نہ آئی ۔ مبتلا تو تمہید کلام ہی سوچتا رہا کہ اتنے میں وہ آپ ہی بولی : ''ایک مدت سے دلی کی تعریفیں سن سن کر جی پھڑکتا تھا اور دل میں ارمان تھا کہ اگر پر ہوتے تو اڑ کر جاتی اور ایک نظر دلی کو دیکھ آتی ۔ بارے سان نہ گمان خود بخود ایسا اتفاق پیش آیا کہ خدا نے دلی میں لا بٹھایا ، اور جیسا سنا تھا اس سے ہزار حصے بڑھ کر پایا ۔ چشم بد دور لکھنو میں دولت کی افراط ہے اور لوگ بھی وہاں کے بڑے زندہ دل ہیں ۔ حسن کی جو قدر و منزلت ہمارے لکھنؤ میں ہے کسی دوسرے شہر میں کم ہوگی اور یہی سبب ہے کہ ملکوں ملکوں سے حسن کھنچ کر سب لکھنؤ میں سمٹ آیا ہے اور میرا رہنا بھی ایسی ہی جگہ ہوا ہے کہ اس کو حسن کا اکھاڑا کہنا چاہئے ، مگر اپنا شہر ہے تو ہونے دو بات تو سچی ہی کہی جائے گی ۔ ما شاء اللہ آپ کی صورت کا آدمی

۱۔ ایاز اپنی حیثیت کو پہچان! (کہ اس تقرب کے باوجود تو ایک ادنیٰ غلام ہے) ۔ اظہار انکسار کے موقع پر کہا جاتا ہے ۔

بھی میری نظر سے تو نہیں گزرا ۔'' مبتلا ''یہ تو سب تمھاری مہربانی ہے ۔ چونکہ تم نظر محبت سے دیکھتی ہو تم کو میری صورت بھی بھلی معلوم ہوتی ہے ۔ ہم مردوں کی صورت اگر اچھی ہوئی بھی تو کیا ، بے مصرف ۔ صورتیں تو تم لوگوں کی ہیں کہ ایک عالم تمھاری ان صورتوں ہی کے پیچھے دیوانہ ہورہا ہے ۔ میں نے بھی تمھاری صفت و ثنا بہت کچھ سنی تھی اور تمھارے دیکھنے کے لیے دل بے قرار تھا ، مگر موقع نہیں بن پڑتا تھا ۔ اب جو تم کو دیکھا تو معلوم ہوا ، حقیقت میں لکھنؤ کی خراش تراش اور وضع داری کو دلی والے نہیں پاسکتے ، مگر یہ تو کہو کہ گھر تمھارا ٹھہرا لکھنؤ ، یہاں دلی میں تمھارے قیام کا کیا بھروسا؟'' بیگم ''ہم لوگوں کا کم بخت اس طرح کا برا پیشہ ہے کہ قرآن کا جامہ پہن لیں تب بھی تو کوئی اعتبار نہیں کرتا ۔ آپ کو یقین آئے یا نہ آئے ، میں ایک عزت‌دار خاندان کی بیٹی ہوں ۔ خدا جانے یہ بھی کرم میں کیا لکھا تھا کہ ایسے برے احوال سے پردیس میں پڑی ہوں ۔ میرا حال اس قطعے کا مصداق ہے:

رہئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
پڑئیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مرجائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

میں جس وقت لکھنؤ سے نکلی، دل میں یہ ٹھان کر نکلی کہ اب اس شہر کو پیٹھ دکھائی ہے ، جیتے جی منہ نہیں‌دکھاؤں گی ۔ جس حالت میں آپ مجھ کو دیکھتے ہیں ، جس قدر مجھے اس سے نفرت ہے بس خدا ہی کو خوب معلوم ہے ، مگر موت اپنے بس کی نہیں ۔

شاد[۲] باید ز یستن نا شاد باید زیستن ۔ آج اگر کوئی بھلا آدمی خدا اُس کے دل میں رحم ڈالے اور میری دست گیری کرے تو مجھ کو چرخہ کاتنا منظور ، چکی پیسنی قبول ، میں اُس کی کفش برداری کو حاضر ہوں ، مگر مان نہ مان میں تیرا مہمان زبردستی کس کے سر ہو جاؤں ، آپ سے آپ کس کے ساتھ لگ لوں ؟'' ہر چند مبتلا کی آوارگی اُن دنوں بڑے زوروں پر تھی مگر اُس کے دل میں کسی عورت کے ساتھ تعلق لازمی پید کرنے کا خیال کبھی نہیں آیا تھا ۔ یہ بیگم کی سحر بیانی تھی کہ ابھی اس کی تقریر پوری نہیں ہونے پائی کہ مبتلا نے اُس کو گھر میں ڈال لینے کا پہلے پہل کچھ یوں ہی سا ارادہ کر لیا بیگم میں دو باتوں کی کمی تھی ۔ ایک تو اس کی صورت کچھ بہت عمدہ نہ تھی ۔ بنانے سنوارنے سے وہ اتنی بھی نظروں میں جچتی تھی ۔ دوسرے گانا ناچنا جس کی ان دنوں مبتلا کو چاٹ لگی ہوئی تھی ، اس کو مطلق نہیں آتا تھا ؛ تاہم اس نے اپنی لسانی سے مبتلا کو پہلی ہی ملاقات میں اتنا تو گرویدہ کرلیا کہ شام کا گیا گیا ڈیڑھ پہر رات کی توپ اُس کو وہیں بیٹھے بیٹھے چل گئی ۔ اس اثناء میں بیگم نے خوب مزے مزے کی گلوریاں اپنے ہاتھ سے بنا بنا کر مبتلا کو کھلائیں ۔ دو دور چائے اور کافی کے چلے ۔ مبتلا اگر ایک جلسے میں مدعو نہ ہوتا تو اُس سے رات کا رہ پڑنا بھی کچھ تعجب نہ تھا ۔ بارے مکان پر سے آدمی آیا کہ صاحب جلسہ خود آپ کو لینے آ ئے ہیں ۔ ناچار اُٹھنا پڑا اور جلسے کی سن کر بیگم کو بھی اصرار کرنے کا موقع نہ تھا ، مگر چلتے چلتے بیگم نے اتنا عہد تولے ہی لیا کہ جلسے کے سوائے ، اپنے یہاں ہو یا کسی دوست

۲۔ خوشی ہو یا کہ غم ، ہر حال میں جینا ہی پڑتا ہے ۔

کے یہاں ، بلا ناغہ ہر روز ملاقات ہوا کرے گی اور میر متقی کے آنے تک ایسا ہی ہوتا رہا اور اتنے دن میں بیگم نے مبتلا کے دل میں بخوبی اپنی جگہ کرلی ۔ میر متقی کی لاحول سے جہاں اور شیطان بھاگ کھڑے ہوئے تھے اُن میں ایک بیگم صاحب بھی تھیں ۔ میر متقی کے رہتے بھی بیگم نے بہتیرے ڈھب لگائے کہ مبتلا ، زیادہ نہیں تو کبھی کبھار ، کھڑے کھڑے صورت دکھایا جایا کرے ، مگر مبتلا خود ان دنوں ہتے سے اُکھڑا ہوا تھا ۔ آنا جانا تو درکنار زبانی سلام و پیام تک کا بھی وہ روادار نہ ہوا ۔ مبتلا بے چارے کے حال پر خیال کرکے کس قدر افسوس آتا ہے :

قسمت تو دیکھیے کہ کہاں ٹوٹی ہے کمند
دو چار ہاتھ جب کے لب بام رہ گیا

قریب تھا کہ بیگم تو اس کو صبر کر کے بیٹھ رہے ، اتنے میں تو میر متقی کو سنا کہ تشریف لے گیے ۔ بیگم تو اس خبر کو سنتے ہی مارے خوشی کے اچھل پڑی اور اسی وقت سے لگی مبتلا کے انتظار میں بار بار مڑ مڑکر دروازے کی طرف دیکھنے ۔ ایک دن گزرا ، دو دن گزرے ، تین دن گزرے ، مبتلا کا پتا نہیں ۔ سمجھی کہ چچا نے ضرور بھتیجے کو کچھ پٹی پڑھائی ۔ آخر جب اپنے اہل برادری کو سنا کہ حساب کتاب کو آنے لگے تو اس نے بھی کسی کے ہاتھ ایک رقعہ بھیجا ۔ (رقعہ)[۳] ”جان من ! یا بآں[۴] شورا شوری ویا بابی بے نمکی ! اس قدر بے مروتی ! ایسی بے وفائی ! کچھ قصور؟ کوئی

۳- پہلے ایڈیشن میں القاب (’جان من‘) اور خاتمے کا شعر درج نہیں ، دوسرے ایڈیشن میں اس تحریر کو باقاعدہ ایک رقعے کی صورت دی گئی ہے ۔
۴- پہلے اتنی گرم جوشی اور اب ایسی بے رخی ۔

خطا ؟ دل کے ایسے بودے اور ارادے کے اتنے کچے تھے تو اتنا ربط بڑھانا ، ایسا گہرا اختلاط کرنا کیا ضرور تھا ؟ از برائے خدا چند لمحے کے لیے تشریف لاؤ اور اپنی حقیقت مجھ کو سناؤ ۔ میں خدانخواستہ کوئی بلا نہیں کہ چمٹ جاؤں گی ۔ آپ کوئی بچے نہیں جو کہ پھسلالوں گی اور آپ کو آنا منظور نہیں تو مجھ سے وہاں پہنچنا کچھ دور نہیں ۔ شعر :

تم جانو غیر سے جو تمھیں رسم وراہ ہو
ہم کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

مبتلا یہ رقعہ پڑھ کر غوطے میں تھا کہ عارف اس کے سر پر آ کھڑے ہوئے تھے ۔ عارف کے چلے جانے کے بعد مبتلا نے رقعے کو پھر کئی بار پڑھا ۔ وہ اس وقت جانے میں ہچکچاتا تھا ، مگر پھر اُس نے سوچا کہ اگر میں نہ گیا تو بیگم خود چلی آئے گی ، اس سے تو میرا جانا بہتر ہے ۔ غرض دل خوب مضبوط کر بیگم کے گھر گیا ، مگر افسوس ہے کہ کچھ ایسی گھڑی کا گیا کہ بس اسی کے گھر کا ہورہا ۔ بیگم نے جو کئی مہینے کے بعد مبتلا کو دیکھا تو نہایت تپاک سے ملی ۔ بس اس کا وہ تپاک ایک جادو تھا کہ مبتلا کی تو کیا حقیقت تھی اس کے چچا باوا میر متقی صاحب بھی ہوتے تو پھسلتے نہیں تو لڑکھڑا تو ضرور جاتے ۔ دیر تک آپس میں گلے شکوے ہوتے رہے ۔ آخر مبتلا نے شروع سے آخر تک ، میر متقی کا آنا اور امور خانہ داری کی اصلاح اور اُن کی نصیحت اور ناظر کی فضیحت اور میر صاحب کا تشریف لے جانا اور عارف سے معرفت کرانا اور عارف کا سمجھانا اور ارباب نشاط کا حساب کتاب ، ذرا ذرا بیان کیا ۔ بیگم نے بہت ہی توجہ سے مبتلا کے قصے کو سنا اور کہا کہ اتنے دن برابر جو آپ کا آنا نہ ہوا اس سے مجھے

بڑی آزردگی ہوئی تھی اور میں نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ آپ سے اخیر دو دو باتیں کرکے ضرور اس محلے سے اُٹھ جاؤں گی ۔ مگر اب جو آپ سے ساری حقیقت معلوم ہوئی ، میرا جی بہت خوش ہوا اور اگر میں جانتی ہوتی تو ضرور میر صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرتی ۔ سبحان‌اللہ اچھوں کی اچھی ہی باتیں ہوتی ہیں ۔ انہوں نے باپ سے بڑھ کر آپ کے ساتھ سلوک کیا ۔ اُن کے فرمانے پر چلو تو دنیا اور دین دونوں میں سرخ رو ۔ میں تو خود آپ سے کہنے والی تھی کہ ان بیسواؤں سے ملنا اور یوں پیسے کو برباد کرنا اور یہ ہرجائی پن اچھا نہیں ۔'' مبتلا ''مشکل یہ آ پڑی ہے کہ بی‌بی کی طرف تو مجھ کو رغبت نہیں ، پھر اب کسی طرح زندگی بسر بھی کروں یا نہ کروں ۔'' بیگم ''بیاھتا بی‌بی سے اگر مرضی نہیں ملتی تو ایک اپنی مرضی کی بی‌بی کر لو ۔ خدا نخواستہ تم کچھ غریب نہیں ہو کہ دو بیبیوں کا خرچ نہ چلا سکو گے ۔ مردوں پر تو خدا نے تنگی نہیں کی ، ایک ایک کو چار چار کا حکم ہے ۔'' مبتلا ''تم مجھ سے نکاح پڑھانے پر راضی ہو ؟'' بیگم ''میں تو خود تم سے کہہ چکی ہوں کہ میں اس حالت میں رہنا پسند نہیں کرتی ۔ میں تو کوئی دن جاتا ہے کہ کسی نہ کسی کا دامن پکڑ کر بیٹھ رہوں گی ، اور اگر تم میری دست گیری کرو تو زہے قسمت ، مگر تم کو بہتیری مجھ سے بہتر ملیں گی ۔ نکاح کرو تو ایسی کے ساتھ کہ پھر بی‌بی کی تمنا باقی نہ رہے ، بلکہ مناسب تو یہ ہے کہ نکاح مت پڑھاؤ ، چندے کسی کو آزماؤ ۔'' مبتلا ''میں تو فکر کرتے کرتے تھک گیا اور سوچتے سوچتے میرا سر دکھنے لگا ۔ چچا باوا اور میاں عارف کی تو مرضی یہ ہے کہ میں ساری عمر رنج و غم میں گھل گھل کر مر جاؤں ۔'' بیگم ''نوج ، دور پار ! نصیب دشمناں ! رنج کرے تمھاری بلا اور

غم اٹھائے تمھاری پاپوش - دنیا میں بار بار جنم لینا نہیں اور جوانی کی عمر بھی چلتی چھاؤں ہے - جب اپنا ھی جی خوش نہ رہا تو دنیا کو لے کر کیا چولھے میں ڈالنا ہے -'' مبتلا ''دل پر تو قابو نہیں چلتا - اس بی بی سے ممکن نہیں کہ مجھ کو آنس ہو - چار و ناچار دوسری بی بی تو کرنی پڑے ھی گی - اچھا تو آج کے آٹھویں دن -'' بیگم ''بلکہ پندرھویں دن ، مگر ایک شرط سے کہ ھست و نیست جو کچھ کہنا ھو تم خود آکر مجھ سے کہنا ، ایسا نہ ھو کہ پہلے کی طرح بیٹھ رھو -'' مبتلا ''نہیں ، کچھ ھی کیوں نہ ھو میں ضرور خود آؤں گا ، بلکہ ھو سکا تو بیچ میں بھی ایک دو پھیرے کروں گا -'' بیگم ''قسم کھاؤ -'' مبتلا ''تمھاری جان کی قسم -'' بیگم ''میری جان تو تم ھو !'' مبتلا ''اپنے سر کی قسم -'' یہ عہد و پیمان ھو کر مبتلا بیگم سے رخصت ھوا ؛ مگر سچ پوچھو تو آج ھی کا جلسہ جلسۂ نکاح تھا - بیگم ایک بلا کی عورت اور اس کو بشرے سے دلی حالات کے معلوم کر لینے کا بڑا ملکہ تھا - آج کی ملاقات میں اس کو پورا یقین ھو گیا کہ مبتلا پر اس کا جادو چل چکا ھے اور اسی بھروسے پر اس نے آپ مہلت دی ، ورنہ وہ ایسا ڈھنگ ڈالتی بے نکاح پڑھائے مبتلا جانے کا نام نہ لیتا - بیگم کے پاس یہ آج کا جانا مبتلا کے حق میں غضب ھو گیا - اس کو میر متقی نے ایک حالت پر پایا اور انھوں نے اور عارف نے اس کو ٹھیل ٹھیل کر کچھ دور سرکایا ، آج وہ پھر اپنی جگہ پر عود کر آیا -

انیسویں فصل

مبتلا اور عارف کا مباحثہ تعدد نکاح کے بارے میں

عارف نے اس خیال سے کہ اس کو اچھی طرح بطور خود غور کر لینے دو ایک ہفتے تک اس کی خبر نہ لی ۔ پھر جو ملاقات ہوئی تو مبتلا کا تیور ہی بدلا ہوا تھا ۔ پوچھا ''کیوں صاحب تم نے کچھ سوچا ، غور کیا ؟'' مبتلا ''جی ہاں دوسرے نکاح کی ٹھہرائی ہے ۔'' عارف (چونک کر) ''ایں دوسرا نکاح ؟! سچ کہو ؟'' مبتلا ''کیا کروں میں بھی آدمی ہوں ، میرے سینے میں بھی دل اور دل میں خواہش ہے ۔ مجھ کو بھی موافق سے راحت اور نا موافق سے ایذا پہنچتی ہے ۔ میری زندگانی کا زمانہ بھی محدود ہے اور جوانی کا تو محدود نہیں ، بلکہ مختصر ۔ میں بھی اتنی بات سوچتا ہوں کہ دنیا سے ایک بار جا کر پھر آنا نہیں ۔ ان تمام باتوں پر نظر کر کے میں نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ آخر مجھ کو کچھ تو آسایش ملے ۔'' عارف ''بے شک آسایش جایز کو کون منع کر سکتا ہے ، اور تم پر کیا موقوف ہے تمام آدمی کوشش کرتے ہیں اور سب کی کوششوں کا دینی ہو یا دنیاوی ، ماحصل ہے آسایش ؛ مگر غور طلب یہ بات ہے کہ جس کو تم نے آسایش سمجھا ہے وہ حقیقت میں بھی آسایش ہے یا نہیں ۔'' مبتلا ''یہ تجویز کرنا میرا کام ہے ۔'' عارف

"یہ غلط ہے ۔ ہم سب ہیں بیمار اور شارع ہے ہمارا طبیب ۔ اگر بیمار کو اختیار دیا جائے کہ اپنی آسایش کے لیے آپ تجویز کرے تو بیمار یقیناً اپنے تئیں ہلاک کرے گا ۔" مبتلا آپ اطمینان رکھیے ، میں نے شرع ہی کے مطابق اپنی آسایش کی تجویز کی ہے ۔ کیا میں نے نہیں کہا کہ دوسرے نکاح کی ٹھہرائی ہے ؟ اگر بے نکاح کسی عورت کو گھر میں ڈال لینے یا پانچویں نکاح پڑھانے کا نام لیتا تب ہی آپ نے کان کھڑے کئے ہوتے ۔" عارف "جواز تعدد نکاح کی نسبت تم نے جس طرح پر اپنا اطمینان کر لیا ہو ، ذرا مجھ کو بھی تو سناؤ ۔" مبتلا "میں تو آپ کے ادنیٰ شاگردوں کی برابری بھی نہیں کر سکتا ۔ میرا کیا مقدور ہے کہ آپ کو سمجھاؤں ، مگر تعدد نکاح کی سند تو قرآن کی وہی ایک مشہور آیت ہے : وان[1] خفتم الا تقسطوا فی الیتمیٰ فانکحوا ماطاب لکم من النساء مثنیٰ وثلث وربع ۔" عارف "لیکن اسی کے آگے فرماتے ہیں : فان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ (یعنی اگر تم کو یہ خوف ہو کہ متعدد بیبیوں میں برابری نہ کر سکو گے تو ایک ہی بیبی کرو) اور اسی سورۃ اور اسی پارے میں اور آگے چل کر : ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النساء ولوحرصتم فلا تمیلوا کل المیل فتذروھا کالمعلقۃ (یعنی تم بہتیرا چاہو ، مگر تم سے یہ ہو ہی نہ سکے گا کہ عورتوں میں برابری کر سکو ۔ پس سارے کے سارے بھی ایک طرف کو مت جھک جاؤ کہ اس بیچاری کو ادھر میں لٹکتا ہوا چھوڑ دو) اب ان دونوں باتوں کو ملاؤ کہ برابری نہ کر سکو تو ایک کرو اور تمھارے لیے برابری

---

۱ ۔ اگر تم کو یہ ڈر ہو کہ ہم یتیموں کے حق میں انصاف نہ کر سکیں گے تو عورتوں میں سے دو دو اور تین تین اور چار چار جتنی تمھاری خوشی ہو نکاح کر لو* ۔

ہو ہی نہ سکے گی ۔ ایک شخص نے حال میں حرمت تعدد نکاح پر ایک کتاب لکھی ہے ۔ اس کے نزدیک ان دونوں آیتوں کو ملانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بس ایک بی بی کرو ۔'' مبتلا ''ایسی ہی ایسی تفسیریں کر کے تو لوگوں نے دین میں رخنے ڈالے ہیں ۔ پیغمبر صاحب اور ان کے صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین اور تمام بزرگان دین سب متعدد بیبیاں کرتے چلے آئے ہیں ۔ ان کو بھی یہ دونوں آیتیں معلوم تھیں اور قرآن کو بھی سب سے بہتر سمجھتے تھے اور ان کا تدین بھی بہت زیادہ تھا ، مگر کسی نے تعدد نکاح کی ممانعت کا نتیجہ نہ نکالا ، اور ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین‌النساء ولو حرصتم فلا تمیلوا کل المیل فتذروھا کالمعلقة سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس برابری کی نسبت ارشاد ہے کہ تم سے ہو ہی نہیں سکے گی وہ پوری پوری برابری ہے ، یعنی عدل حقیقی ، کیونکہ مطلق عدل سے قاعدے کے مطابق فرد کامل مراد لینی ہوگی اور وہ نہیں ہے ، مگر عدل حقیقی ، اور اسی لیے فرمایا ہے کہ تم سے عدل حقیقی تو ہو نہیں سکے گا تو ایسا بھی تو غضب مت کرو کہ ایک ہی طرف کے ہو رہو اور دوسری کو لٹکا رکھو ، کہ وہ بے چاری بیچ میں پڑی جھولا کرے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ عدل حقیقی کے علاوہ کہ وہ اعلیٰ درجے کا عدل ہے اور انسان سے اس کا ہونا ممکن نہیں ، ایک ادنیٰ درجے کا عدل مجازی بھی ہے کہ انسان صرف ایک ہی کا نہ ہو رہے ، بلکہ دوسری کی بھی خبر گیری کرتا رہے ۔ چچا باوا کے رہتے میرے دل میں اس بات کا کھٹکا تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور مجھ کو ٹوکیں گے تو میں نے مولوی محمد فقیہ سے اس مسئلے کی خوب تحقیق کی تھی ۔ میری سمجھ میں تو یوں آتا ہے

کہ پہلی آیت : و ان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ میں عدل سے عدل مجازی مراد ہے کہ اگر تم کو اس بات کا ڈر ہے کہ ادنیٰ درجے کا عدل بھی نہ کر سکو گے اور بالکل ایک ہی کے ہو رہو گے تو ایسی صورت میں تم کو ایک ہی بی بی کرنی چاہیے اور اگر تعدد نکاح میں عدل حقیقی مشروط ہو تو فی الواقع جیسا آپ کہتے ہیں ، ممانعت ہوئی تعلیق بالمحال اور اگرچہ اس آیت میں بھی مطلق عدل ہے اور چاہیے کہ یہاں بھی عدل حقیقی مراد ہو ، مگر دوسری آیت ما بعد و لن تستطیعوا . . . . الخ قرینہ صاف موجود ہے اور اگر خدا کو تعدد نکاح کی ممانعت منظور ہوتی تو تعلیق بالمحال کا پیرایہ اختیار کرنا کیا ضرور تھا؟ صاف صاف کہہ دینا تھا کہ بس ایک ہی بی کرو ، نہ یہ کہ اگر عدل حقیقی نہ کر سکو تو ایک کرو . کیونکہ یہ تو معلوم ہی تھا کہ عدل حقیقی مقدور بشر نہیں ۔ اگر و ان خفتم الا تعدلوا سے ممانعت تعدد نکاح مراد ہو تو معاذاللہ اس آیت کی ایسی مثال ہوگی کہ پوچھیں ناک کہاں ہے اور جواب میں بائیں کان سے شروع کر کے گدی کی طرف سے داہنی جانب ہاتھ لا کر بتایا جائے کہ یہ ہے ۔'' عارف ''اس میں شک نہیں کہ مولوی محمد فقیہ نے اس مسئلے کی اچھی تحقیقات کی اور تم نے جو کچھ سمجھا میرے نزدیک نہایت درست سمجھا ، مگر پیغمبر صاحب سے جو تم نے استشہاد کیا اس کو میں نہیں مانتا ۔ یہ دونوں آیتیں عام مسلمانوں کے واسطے ہیں ، پیغمبر صاحب کے نکاح ان میں داخل نہیں ۔ پیغمبر صاحب کے لیے سورۂ احزاب میں ایک پورا رکوع موجود ہے : یا[۲] ایھا النبی انا احللنا

۲۔ اے پیغمبر ہم نے تجھ پو حلال کر دیں تیری وہ بیبیاں جن کے تو مہر دے چکا ہے * ۔

لک ازواجک اللاتی اتیت اجورھن ۔۔۔۔ الخ پیغمبر صاحب کے لیے چار بیبیوں کی قید نہ تھی اور اگرچہ آن حضرت ازواج طاھرات میں اپنی طرف سے عدل فرماتے تھے، مگر خدا نے آن پر اس کو بھی لازم نہیں کیا تھا، چنانچہ اسی رکوع میں یہ آیت ھے: ترجی من تشاء منھن و تووی الیک من تشاء و من ابتغیت ممن عزلت فلا جناح علیک۔ (یعنی اپنی بیبیوں میں سے جس کو چاھو اپنے سے جدا رکھو اور جس کو چاھو اپنے پاس جگہ دو اور جس کو چاھو بٹھا کر پھر بلا لو تو تم پر کچھ گناہ نہیں)۔ اسی طرح پیغمبر صاحب کو بلا مہر بھی نکاح کر لینا جائز تھا اور یہ باتیں خصائص نبوی میں سے ھیں اور کیا مصلحتیں پیغمبر صاحب کے ان ذاتی معاملات میں مضمر تھیں، اس کی تفصیل ھے کہ جس کے بیان کرنے کو بڑی فرصت چاھیے۔ اسی طرح صحابہ وغیرہ سے بھی استشہاد کرنے کو میں درست نہیں سمجھتا۔'' مبتلا ''مذھباً یا عقلاً؟'' عارف ''یہ تو تم نے عجب لغو بات پوچھی، اس سے تو معلوم ھوتا ھے کہ مذھب اور عقل دو چیزیں ھیں اور ممکن ھے کہ دونوں کی دو راھیں ھوں، حالانکہ میرا عقیدہ تو یہ ھے کہ مذھب مخالف عقل، باطل؛ عقل مخالف مذھب، گمراہ۔'' مبتلا '' جس چیز کے جواز کے لیے نص قرآنی موجود ھے اس سے آپ کو مخالفت کرنے کا سبب؟'' عارف۔ ''بات یہ ھے کہ شارع نے مردوں اور عورتوں کی معاشرت کے قاعدے ٹھہرا دئے ھیں۔ نکاح اور مہر اور نفقہ اور طلاق اور خلع اور لعان اور اظہار اور رجعت اور رضاع وغیرہ جتنے معاملات ھیں سب کے واسطے احکام ھیں۔ اگر ان احکام کی پوری پوری تعمیل ھو تو کسی قوم اور کسی

مذهب کے زن و شوهر میں اس سے بہتر معاشرت هو نہیں سکتی ۔ مگر خرابی کیا آ کر پڑی هے کہ هندوستان کے مسلمانوں نے رسم اور مذهب دو چیزوں کو ملا کر اپنے طرز معاشرت کو آدها تیتر اور آدها بٹیر بنا لیا هے ۔ مثلاً پردے سے چلو ، بلا شبہ اسلام کا حکم هے کہ بیبیاں پردہ کریں ، اور اس میں بھی شک نہیں کہ ایک پردے سے هزار ها مفسدوں کا انسداد هوتا هے ، مگر جس سختی کے ساتھ هم لوگوں نے پردے کو لازم کر لیا هے ، افراط هے ، حد شرع سے متجاوز ۔ پردہ نہیں هے مگر قید ، اور قید جس قدر سخت اسی قدر ایذا دہ ۔ نکاح ایک ایسا معاهدہ هے کہ مرد اور عورت دونوں کی زندگانی کی کامیابی اور نا کامیابی ، راحت اور تکلیف ، خوشی اور نا خوشی اسی پر موقوف هے ۔ معاهدہ تو ایسا مہتم بالشان اور معاهدہ کرنے والے جن کو اس کا نباہ کرنا هے اور جن پر اس معاهدے کا اثر مترتب هوگا اس سے بے تعلق کیونکہ اکثر تو معاهدۂ نکاح ایسی چھوٹی عمروں میں هو جاتا هے کہ فریقین میں سے کسی کو بھی اس کے نتائج کے سمجھنے کی اهلیت نہیں هوتی اور اگر شاذ و نادر هوتی بھی هے تو اظہار رائے کر کے بے شرم اور بے حیا اور بے غیرت اور منہ بولا کون کہلائے ۔ پس معاهدۂ نکاح تو کرتے هیں مثلاً زید اور هندہ اور ایجاب و قبول کرتے هیں ان کے ولی ۔ کھلم کھلا پوری آزادی تو نکاح کے معاملے میں مرد عورت کسی کو بھی نہیں ۔ رہ گئے دبے دبائے اشارے کنایے ، وہ بھی مردوں کے لیے بد نمائی هے اور عورتوں کے لیے فضیحت اور رسوائی ۔ سب سے بڑا ظلم جو هم نے اپنی عورتوں پر کر رکھا هے یہ هے کہ بیوہ کو دوسرا نکاح نہیں کرنے دیتے ۔ هزارها اللہ کی بندیاں هیں کہ انھوں نے شوهر کا

منہ تک نہیں دیکھا اور نصیبوں پر اپسے پتھر پڑ گئے کہ رانڈ ہو گئیں۔ ہندوؤں کی طرح ستی ہو کر ایک بار کا جل مرنا ساری عمر کے جلاپے سے ہزار درجے بہتر تھا؛ مگر حرام موت، ستی کیوں کر ہوں؛ دنیا میں ناک کٹتی ہے، دوسرا نکاح کس طرح کریں۔ غرض جیتی ہیں تو لطف حیات نہیں اور مرتی ہیں تو اپنے اختیار کی بات نہیں۔ تو اس کا مطلب یہ نکلا کہ شارع نے جو حقوق عورتوں کو دئے تھے وہ تو پورے کے پورے ہم نے اُن کو لینے نہ دیے اور اپنے حقوق میں سے رتی بھر چھوڑنا نہیں چاہتے، تو جو نسبت مرد اور عورت میں شارع کو رکھنی منظور تھی کیونکر باقی رہ سکتی ہے؟ اور وہ نسبت کیا تھی، اس کے لیے میں تمہارے آگے قرآن کی دو آیتیں پڑھتا ہوں۔ سورۂ بقر میں ہے: ولہن مثل الذی علیہن بالمعروف و لرجال علیہن درجۃ (یعنی جیسے عورتوں کی ذمہ داریاں ہیں ویسی ہی راست معاملگی کے ساتھ اُن کے حقوق بھی ہیں اور مردوں کو عورتوں پر برتری ہے)۔ پھر سورۂ نساء میں ہے: عاشروہن بالمعروف فان کرہتموہن فعسٰی ان تکرہوا شیئاً و یجعل اللہ فیہ خیراً کثیرا۔ (یعنی عورتوں سے راست معاملگی کے ساتھ برتاؤ کرو، پس اگر وہ تم کو بھلی نہ لگیں تو عجب نہیں تم کو ایک چیز بھلی نہ لگے اور خدا اس میں بہت سی بہتری کر دے)۔ اب فرمائیے کہ تعدد نکاح جائز ہے یا ناجائز؟'' مبتلا '' میں تو مذہب کا کوئی بڑا محقق نہیں مگر اسی طرح جورویں اگر زبردستی ہمارے گلے مڑھی جائیں گی تو جو حالت آپ نے بیوہ عورتوں کی بیان کی اُس سے بد تر ہماری ہوگی۔ عورت کو تو

خیر صبر کرنے کے لیے ایک بات بھی ہے کہ شوہر نہیں ہے نہ سہی؛ یہ کیا مصیبت ہے کہ ایک عورت کو آنکھ بھر کر دیکھنے کو جی نہیں چاہتا ، بات کرنے کی طرف طبیعت رغبت نہیں کرتی اور آپ کہتے ہیں کہ زبردستی اس کے ساتھ عاشقی کرو ۔ اگر خدا کے یہاں ایسی ہی ہیکڑی ہے تو اس کو اختیار ہے دوزخ میں ڈالے ، جہنم میں جھونکے، بندگی و بے چارگی ؛ مگر میں تو آپ سے صاف صاف کہتا ہوں کہ ایسی مجبورانہ عاشقی مجھ سے ہوئی ہے نہ ہو گی ۔'' عارف ''بلاشبہ تم مغلوب طبیعت ہو رہے ہو اور جب تک تمہاری یہ حالت رہے گی ، حقیقت میں تم سے خلاف طبیعت کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی ۔'' مبتلا ''اسی میں تو میں آپ سے مدد چاہتا تھا کہ طبیعت پر غالب آنے کی کوئی تدبیر بتائیے ۔'' عارف ''جو تدبیر مجھ کو معلوم تھی ، اور معلوم کیا تھی وہی ایک تدبیر ہے ، میں نے تو اس کے بتانے میں دریغ نہیں کیا ۔ پھر بھر تک تمہارے ساتھ اپنا مغز خالی کیا ۔ تم لاجواب ہو لیے اور چلتے چلتے تم سے کہتا گیا کہ تم ان تمام باتوں کو فرصت سے سوچنا اور موجبات ترغیب کے پاس نہ جانا ۔ تم یوں سمجھو کہ حسن پرستی مرض ہے ، سوچنا دوا اور موجبات ترغیب سے دور رہنا پرہیز ۔ بھائی ! مرض جسمانی بھی اگر مزمن ہوتا ہے تو اس سے جلد صحت نہیں ہوتی اور بعض صورتوں میں برسوں علاج اور ساری عمر کے لیے پرہیز کرنا پڑتا ہے ۔ یہی حال ہے امراض روحانی کا جن کا دوسرا نام ہے 'بری لت ، بد عادت' ۔ تمہارا علاج تمہارے ہی ہاتھ میں ہے ۔ کرو تو تم اور نہ کرو تو تم ۔'' مبتلا ''آپ تو تعدد نکاح میں چند در چند طرح کے خدشات پیدا کرتے ہیں اور بزرگان دین میں کوئی بھی اس سے خالی نہ تھا ۔'' عارف ''جب ایک بات کی صراحت ہم

کتاب اللہ میں پاتے ہیں تو ہم کو کسی بزرگ کے قول و فعل پر نظر کرنے کی ضرورت نہیں ۔ ایک ، اور دوسرے ، یہ معاملات ہیں شخصی ؛ جب تک کسی کی طبیعت ، کیفیت ، حالت ، ضرورت کا کچا حال معلوم نہ ہو ، ہم بھلی یا بری کوئی رائے ظاہر ہی نہیں کر سکتے ، اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ جو لوگ اپنے لیے اس آزادی کو عمل میں لاتے تھے ، وہ عورتوں کی آزادی میں بھی مضایقہ نہیں کرتے تھے ۔ ہماری طرح اُن کا معاہدۂ نکاح مرنے بھرنے کا معاہدہ نہ تھا ۔ ذرا سی ناموافقت ہوئی ، مرد نے طلاق دے دی یا عورت نے خلع کر لیا ۔ تھوڑے تھوڑے مہر ہوتے تھے ۔ اُن کو معاہدۂ نکاح کا فسخ کر دینا ایک بات تھی ۔ نہ طلاق کا عیب ، نہ دوسرے نکاح کی عار ؛ تو اُن کی آزادی حق بجانب ۔ ہم کیا اُن کی ریس کر سکتے ہیں کہ ہماری بیبیاں لونڈیوں سے بڑھ کر ۔ اختیار ، دائم‌الحبس ، ناک چوٹی گرفتار ، اور پھر تعدد نکاح سے جو بے لطفیاں اور بد مزگیاں خانہ داری میں پیدا ہوتی ہیں ، ہم دیکھتے ہیں تو بزرگان دین کو بھی اُس سے نجات نہ تھی ۔ امہات‌المومنین، یعنی پیغمبر صاحب کی ازواج طاہرات[۳] میں ، باوجودیکہ دنیا کے عیش و آرام کسی کو میسر نہ تھے ، تاہم فقر و فاقے میں بھی باہم ویسے ہی محاسدات[۳] تھے جیسے سوکنوں میں ہوتے ہیں اور ہونے چاہئیں ۔ سنی شیعہ کا تفرقہ ، جو تم دیکھتے ہو کہ دونوں گروہوں کا خدا ایک ، رسول ایک ، قرآن ایک اور پھر آپس میں اس درجے کی عداوت ، اگر سچ پوچھو تو متفرع ہے اُن ہی

۳- ازواج مطہرات میں بتقاضائے بشریت جو معمولی سی رقابت تھی اسے عام سوکنوں کے محاسدات سے تشبیہ دینا اور پھر یہ کہنا کہ شیعہ سنی تفرقہ انھی محاسدات پر مبنی ہے تاریخی حقائق کا منہ چڑھانا ہے ۔

محاسدات پر ۔ حضرت پیغمبر صاحب کی سب سے پہلی ؛
حضرت خدیجۃ الکبریٰ جن کے بطن سے حضرت فاطمۃ الزھرا ؛
ھوئیں ، حضرت خدیجۃالکبریٰ کے پاس اُن کے پہلے شوھر کا
سرمایہ تھا ، جس کو انھوں نے تجارت میں لگا رکھا تھا ۔ اُن
ضرورت تھی ایک دیانت‌دار اور ھوشیار کارندے کی ۔ اُنھوں
(بعثت سے بہت پہلے کا مذکور ھے) حضرت صلی‌اللہ علیہ وسلم
دیانت ، امانت ، راست بازی کا حال سن کر اُن کو اپنی تجارت
کام میں لگایا ۔ اللہ نے حضرت کی نیک نیتی سے تجارت میں
برکت دی ۔ حضرت خدیجہ نے حسن کارگزاری سے خوش ھو
اُن کے ساتھ نکاح پڑھا لیا ۔ اس نکاح کی وجہ سے جو لوگ نر
دنیا دار تھے البتہ حضرت کی زیادہ وقعت کرنے لگے ۔ پھر
حضرت کا زمانہ بعثت نزدیک آیا تو خوارق عادات پیش
لگے ۔ کبھی آسمان پر فرشتوں کو دیکھتے ، کبھی درخت ان
سلام کرتے ، کبھی غیب سے آواز آتی ۔ ان واقعات کو د
کر ڈرے اور حضرت خدیجہ پر اُس تمام حقیقت کو ظاھر ک
حضرت خدیجہ تھیں بڑی با خدا بی‌بی ، اور اُن کے گھر میں ص
انبیاء اور تورات کی تلاوت کا بڑا چرچا تھا ۔ انھوں نے سن
حضرت کو تسلی دی کہ تم خدا ترس آدمی ھو ، بیوہ عور
اور یتیم بچوں پر رحم اور رشتہ داروں کے ساتھ سلوک ک
ھو ، ایسا تو نہیں ھو سکتا کہ خدا تم جیسے آدمی کو ذ
کرے ، اور حضرت کو اپنے بھائی کے پاس لے گئیں جو تو
کے بڑے عالم تھے ۔ پیغمبر آخرالزمان کی پیشین گوئیاں تو آ
کتابوں میں موجود ھی تھیں اور لوگ دن گن رھے تھے ؛ انھ
نے جو حضرت کو دیکھا اور اُن کی حقیقت سنی تو پہچان
اور صاف کہہ دیا کہ آپ پیغمبر ھونے والے ھیں ۔ جب

حضرت خدیجہ زندہ رہیں پیغمبر صاحب نے دوسرے نکاح کا قصد تک بھی تو نہیں کیا ۔ حضرت خدیجہ کی وفات کے بعد پیغمبر صاحب نے متعدد بیبیاں کیں جن میں سب سے زیادہ عزیز اور سر بر آوردہ حضرت ابوبکر کی بیٹی ام المومنین حضرت عایشہ تھیں ۔ رشتے میں ماں اور عمر میں حضرت فاطمہ سے بھی چھوٹی ۔ اس سے انکار کرنا بداهت سے انکار کرنا اور واقعات کا جھٹلانا ہے کہ حضرت عایشہ کا تعزز تمام ازواج طاهرات پر شاق تھا ، اور اسی طرح حضرت فاطمہ پر بھی ، جو اپنے تئیں اپنی والدہ حضرت خدیجہ کی جگہ سمجھتی تھیں اور جن کو پیغمبر صاحب کا معاملہ اپنی والدہ کے ساتھ ، اپنے کانوں کا سنا اور آنکھوں کا دیکھا سب یاد تھا ۔ یہ ہے فی الاصل سنی اور شیعہ کی بنیاد ۔ جنھوں نے یہ سمجھا کہ پیغمبر صاحب کو دنیا میں حضرت فاطمہ کے سوا کسی کے ساتھ کچھ آنس نہ تھا وہ شیعہ ہو گئے ، باقسا مہم ، یعنی تفضیلی[۴] اور نصیری اور کیا اور کیا ۔ خوارج ٹوٹ کر بیبیوں کی طرف داری کرنے لگے ۔ اهل سنت کہتے ہیں کہ بی بی ، بی بی کی جگہ اور بیٹی بیٹی کی جگہ ۔ یہاں تک درست ہے ، مگر آگے چل کر انکار کرنے لگتے ہیں کہ خاندان نبوت میں کسی کو کسی سے کسی طرح کا ملال نہ تھا ۔ بس سنیوں کی یہ بات دل کو نہیں لگتی ۔ میں بھی سنی ہوں ، مگر میرے نزدیک پھوٹ اور نااتفاقی بے شک تھی ، تاهم اس سے ان بزرگوں کی مذهبی شان میں کچھ بھی فرق نہیں آتا ۔ یہ تقاضائے بشریت ہے ، اور کیوں کسی کی دین داری میں بشریت سے بٹا لگنے لگا

۴- تفضیلی وہ فرقہ کہلاتا ہے جو خلفائے ثلاثہ کو مانتا ہے ، لیکن حضرت علی کو سب سے افضل گردانتا ہے ۔ نصیری ، نصیر کے پیروکار جو حضرت علی کو خدا مانتا تھا ۔ خوارج ، وہ فرقہ جو خلفائے ثلاثہ کا مداح ہے اور حضرت علی کو برا کہتا ہے ۔

جب کہ پیغمبر صاحب نے اپنی شان میں فرمایا ہو : انما انا بشرمثلکم یوحی الی (میں بھی تو تم جیسا بشر ہوں ، فرق صرف اتنا ہے کہ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے) غرض اس طول مقال سے یہ ہے کہ جو بے لطفیاں تعدد نکاح کو لازم ہیں ، خاندان نبوت بھی آن سے محفوظ نہیں رہا ، دوسرا کس گنتی میں ہے ۔'' مبتلا ''اب بھی مجھ کو کون لطف حاصل ہے ؟'' عارف ''تم آگ کے جلے ہوئے کو سینکتے ہو ، یعنی ایک بے لطفی کو دوسری ۔ لطفی سے دبانا چاہتے ہو ، مگر ممکن ہے کہ یہ دوسری بے لطفی آخر میں اس پہلی بے لطفی سے زیادہ شاق ہو ۔'' مبتلا ''اس وقت جیسا موقع ہوگا دیکھا جائے گا ۔ میں ابھی سے فکر مستقبل کر کے اپنی زندگی کو کیوں تلخ کر لوں ۔'' عارف '' تو اب حقیقت میں میری تمھاری ملاقات لا حاصل ہے ، مگر میں اتنا کہے دیتا ہوں کہ تم اپنے حق میں اچھا نہیں کرتے ۔ افسوس ہے کہ تم نے مجھ کو جناب میر متقی صاحب سے شرمندہ کیا ۔'' یہ کہہ کر عارف بہ کمال نا رضامندی اٹھ کر چلا گیا ۔

بیسویں فصل

مبتلا کا دوسرا نکاح

مبتلا کے سر پر ان دنوں ایسا جن سوار تھا کہ اس کی عقل ہی ٹھکانے نہ تھی ۔ عارف سے پیچھا چھڑا وہ پھر بیگم کے گھٹنے سے جا لگا ۔ وہ تو پہلے ہی سے اس کے لیے جال پھیلائے بیٹھی تھی ، جانا تھا کہ اس پر چھا گئی ۔ بیگم بالطبع زیادہ تر اس بات کی طرف راغب تھی کہ مبتلا آشنائی کے طور پر اس کو گھر میں ڈال لے ، مگر میر متقی اور عارف کی تعلیم کا مبتلا پر اتنا تو اثر ہوا کہ اس نے بے نکاح بیگم کے ساتھ تعلق رکھنے کو پسند نہ کیا ۔ پاس تھی مسجد ، دو طالب العلموں کو بلا بھیجا ، نکاح پڑھا جانے لگا ۔ مہر میں ہوا اختلاف ؛ مبتلا نے چاہا مہر شرع محمدی ، بیگم نے کہا ''جو غیرت بیگم کا مہر وہ میرا مہر ؛ جیسی نکاحی بی بی وہ ویسی نکاحی بی بی میں'' دیر تک اس میں تکرار ہوتی رہی ۔ آخر مولوی صاحب جو نکاح پڑھاتے تھے بولے ''جانے دو ، مہر مثل رکھو ۔'' مبتلا نیم راضی ہو چلا تھا ، مگر بیگم مہر مثل کے نام سے جھینپتی تھی ، کیوں کہ سارے خاندان میں کبھی کسی کا نکاح ہوا ہو تو مہر مثل ہو ۔ دادی اور پھوپھیاں ساری عمر خرچیاں کھاتی رہیں ، مہر مثل آئے تو کہاں سے آئے ؟ ناچار مہر شرع محمدی ماننا پڑا اور بات یہ بنائی

کہ ''وہ بھی کیا بی بی ہے جو میاں پر مہر کا دباؤ ڈال کر گھر کرے - ہم تو بڑا مہر مرد کے دل کو سمجھتے ہیں ؛ دل مٹھی میں آیا تو جانو سب کچھ بھر پایا -'' وہ کیا غضب کے دوانچھر تھے کہ ادھر پڑھے گیے - اور اُدھر فکروں نے آ گھیرا - بیگم نے نکاح کے بعد پہلی جو بات کی ، وہ یہ تھی کہ ''یہ مکان جس میں میں رھتی ہوں ، تم کو معلوم ہے کہ کرائے کا ہے ، اور جتنا ساز و سامان جو تم یہاں دیکھتے ہو ، یہاں تک کہ میرے ہاتھ کا گہنا اور گلے کے کپڑے ، کوئی چیز میری نہیں - میری سگی خالہ میرے ساتھ ہیں یہ سب ان کا مال ہے - ان کی ہرگز مرضی نہ تھی کہ میں نکاح کروں - اب جو میں نے اُن کو ناراض کر کے کیا ہے تو ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے ، خالہ بندی میرے پاس ٹھہرنے والی نہیں اور مجھ کو اس وقت کہیں لے چلتے ہو تو میں تیار ہوں - اپنی آبرو کا پاس کر کے گہنا کپڑا تم بھتیرا پہناؤ گے اور میں پہنوں گی ، مگر لے چلنا ہے تو مجھ کو اپنے یہاں کے کپڑے پہنا کر لے چلو ، اور دو چار دن کے لیے یہاں ٹھہرانے کی صلاح ہے تو جا کر خالہ سے اجازت لو - میں اُن کے سامنے نہیں جا سکتی -'' مبتلا نکاح کے لیے تو بڑا مستعجل تھا ، مگر احمق نے پہلے سے اتنا بھی تو نہ سوچا کہ کہاں دوسری بی بی کو لے جا کر رکھوں گا اور کیوں کر اس نئے گھر کا انتظام ہوگا - اب جو دفعۃً اس کو معلوم ہوا کہ بیگم بے سروسامان محض بیک بینی و دو گوش اُس کے سر پڑی تو بہت سٹ پٹایا اور جتنا اختلاط وہ معمولی ملاقاتوں میں کرلیا کرتا تھا طبیعت کو اُس کے لیے بھی حاضر نہ پایا - یہ تھی حقیقت اس خواھش کی جس کے پیچھے مبتلا اس قدر دیوانہ بن رہا تھا کہ دنیا اور دین اس کو کچھ نہیں سوجھتا تھا - اب ایک ذرا سا تردد پیش آگیا تو کہیں

اس خواهش کا پتا نه تها - میر متقی اور عارف اُس کو یہی تو سمجھاتے تھے که کس فکر خسیس میں پڑے ہو ، فکر کرنے کی باتیں دوسری ہیں ، عمده ، اونچی اور ضروری - اگر اُن میں دل لگاؤ تو اس فکر بے هوده سے نجات پاؤ - بیگم پر اپنی درماندگی ظاہر کرتے ہوئے تو اُس کو شرم آئی ، آخر وہ یه کہه کر اُٹھ آیا که ابھی تھوڑی دیر میں بندوبست کر کے تم کو لے چلتا ہوں ، تیار رهو - ایک بات یه بھی اکثر دیکھنے میں آئی که آواره اور عیاش مزاج لوگ دھوکا دینے میں بڑے چالاک ہوتے ہیں اور اس کا سبب یه سمجھ میں آتا ہے که خود همیشه تخته مشق مغالطات رهتے ہیں - مبتلا کو بھی عین وقت پر غضب کی سوجھتی تھی - جس وقت تک وہ بیگم کے پاس بیٹھا رہا ، کوئی بات اس کے ذهن میں نه تھی ، اُٹھ کر باهر آنا تھا که اُس نے اپنے دل میں کہا ، بیگم کو اپنے ہی مکان میں ، بلکه زنان خانے میں ، بلکه غیرت بیگم کے ساتھ رکھنا ٹھیک معلوم ہوتا ہے ، کیوں که یه بات چھپنے والی تو ہے نہیں ، آخر کبھی نه کبھی کھلے گی ضرور - پس جو کچھ ہونا ہے وہ پرسوں کا ہوتا کل اور کل کا ہوتا آج ہو چکے - یه دل میں ٹھان وہ گھر کی طرف چلا آ رہا تھا که راہ میں اس کو اپنے گھر کی دو عورتیں ملیں ؛ ماما ، ماما کے ساتھ انا ، انا کی گود میں مبتلا کی دودھ پیتی ہوئی دس گیارہ مہینے کی ننھی بچی - چور کی داڑھی میں تنکا ، مبتلا تو سمجھا که غیرت بیگم کو نکاح کی خبر ہو گئی اور سنتے کے ساتھ ہی شاید ناظر کے گھر چلی گئیں اور یه عورتیں پیچھے سے جا رہی ہیں - گھبرا کر پوچھا - ماما بولی ، ''ننھی بچی کا جی دس بارہ دن سے ایسا ماندہ ہو رہا ہے که بخار کسی وقت نہیں اُترتا - کل شام سے مطلق آنکھ نہیں کھولی - اب کے ایسی بھاری نظر ہوئی ہے که

دوپہر سے دودھ بھی منہ میں نہیں لیتی ۔ متوکل شاہ صاحب کے پاس دم کرانے کے لیے جاتے ہیں،، مبتلا سے اور ایک ڈاکٹر سے بہت ملاقات تھی ۔ مبتلا لڑکی کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا ۔ اُس نے دیکھ کر کہا کہ ،، بخار بڑے زور کا ہے مگر کچھ گھبرانے کی جگہ نہیں ۔ کچلیاں پھول رہی ہیں ، میں مسوڑھا کھولے دیتا ہوں ، اور شیشی ایک بھیج دینا ، عرق دوں گا ، گھنٹے گھنٹے بعد ایک ایک چمچا پلانا ، پسینا آ کر تپ اُتر جائے گی ، اور دودھ تو خدا نے چاہا لڑکی ابھی پینے لگے گی ۔ مسوڑھے کی تکلیف کے مارے منہ نہیں چلا سکتی ۔،، یہ کہہ کر نشتر نکال مسوڑھا کھول دیا ۔ انا نے پیٹھ موڑ کر دودھ لگایا تو غٹ غٹ پینے کی آواز آنے لگی ۔ سب لوگ خوشی خوشی گھر واپس آئے ۔ جب مردانے میں پہنچے تو مبتلا نے لڑکی کو آپ لے لیا ۔ یہ تو خیر لڑکی تھی ، اس سے بڑا لڑکا معصوم ساڑھے تین برس کا ہوا ، اس بلا کی باتیں جیسے بنگالے کی مینا ، اور ایسی پیاری صورت کہ کوئی راہ چلتا بھی دیکھتا تو گود میں اٹھا لیتا ؛ مبتلا نے کبھی بھول کر بھی آنکھ اٹھا کر اُس کی طرف کو نہ دیکھا ، بلکہ وہ بچہ جب اس کو دیکھتا ، ابا ابا کہہ کر دوڑتا اور یہ ظالم دور سے اُس کو جھڑک دیتا ۔ خلاف عادت بیٹی گود میں لیے ہوئے جو گھر میں گھسا ، غیرت بیگم تو دیکھتے ہی ریجھ گئی اور بیٹی کو لینے کے لیے دوڑی اور لگی پوچھنے کہ ،،میں نے تو اس کو دم کروانے کے لیے بھیجا تھا ، کیا تم اس کو الٹا پھروا لائے ؟،، مبتلا ۔ ،،تم کو خبر بھی ہے اس کی کچلیاں نکل رہی ہیں اور کچلیوں کا تو معمول ہے کہ بچے کو کچلا کر کے بڑی مشکل سے نکلتی ہیں ۔ میں اس کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا ، اُس نے نشتر سے اس کا مسوڑھا کھول دیا ہے اور بخار کے لیے عرق دینے

کو کہا ہے ۔ شیشی بھیج دو ، ماما جا کر عرق لے آئے ۔ خدا نے چاہا آج ہی رات کو بخار بھی اُتر جائے گا اور کچلی کو تو سمجھو نکل آئی ۔'' غیرت بیگم ''اے ہے ! کیا مسوڑھے کو چیرا لگایا ہے ؟'' مبتلا ۔ '' کچھ خوف کی بات نہیں ۔ انا سے پوچھو کہ لڑکی کو خبر تک بھی نہیں ہوئی ۔ اُسی وقت تو اُس نے خاصی طرح دودھ پیا ۔ ڈاکٹر کہتا تھا کہ جب دانت نکلنے کو ہوتا ہے تو مسوڑھا پہلے سے مردار پڑجاتا ہے ، اس وجہ سے تکلیف نہیں ہوتی ۔ کچھ خدا کو بہتری کرنی تھی کہ عین وقت پر تدبیر ہوگئی ورنہ آج رات بھر میں معلوم نہیں کیا ہوجاتا ۔'' غیرت بیگم نے لڑکی کا منہ کھول کر دیکھا تو اتنی ہی دیر میں بخار بھی کسی قدر ہلکا ہوگیا تھا اور صورت بھی ہوشیار تھی ۔ پکارا ، ''بتول ! بتول ! '' تو ماں کی آواز پہچان کر آنکھیں کھول دیں اور دیکھ کر مسکرائی بھی ۔ ماں نے پیار کرکے انا کی گود میں دیا تو پھر دودھ پیا ۔ یہ دیکھ غیرت بیگم بولی کہ ''ننھے بچوں کی یہی تو بڑی مصیبت ہے کہ آپ تو منہ سے کچھ نہیں کہہ سکتے ، اوپر والوں کو کیوں کر معلوم ہو کہ ان کو کس بات کی ایذا ہے ۔ آنکھوں کا نہ کھولنا اور ڈر ڈر کر اُچھل پڑنا اور ہتھیلیوں میں بساندی بساندی بو کا آنا ، ان باتوں کو دیکھ یہاں تو سب یہی کہتے تھے کہ نظر ہوگئی ہے ۔'' مبتلا ''ڈاکٹر نے دیکھنے سے پہلے زبانی حال سن کر کہہ دیا تھا کہ کوئی دانت نکل رہا ہوگا ۔ پھر جو منہ کھول کر دیکھا تو حقیقت میں دور سے کچلی صاف جھلک رہی تھی ۔'' غیرت بیگم ''گھر میں کوئی بڑا بوڑھا ہو تو ان باتوں کا دھیان رکھے ۔ بچے ذرا ماندے پڑتے ہیں تو میرے ہوش و حواس ٹھکانے نہیں رہتے ۔ لو ، اب

مغرب کی اذان تو ہوچکی ہوگی یا ہورہی ہوگی ، لڑکی کے جھگڑے میں کھانے کا بھی تو کچھ بندوبست نہیں ہوا ۔ گوشت کا تو اب وقت نہیں رہا ، کہو تو خاگینہ پکوالوں ؟'' مبتلا ''جو تمہارے جی میں آئے پکواؤ ، مگر خدا کے لیے کوئی سلیقہ مند عورت ضرور رکھو ۔'' غیرت بیگم ''ماماؤں کا تو ہمارے شہر میں ایسا توڑا ہے کہ دوا کے لیے بھی میسر نہیں ۔ جو عورتیں اس کام کی ہیں مزے میں گھر بیٹھے گوٹے کناریاں بنتی یا سلائی کا سیتی ہیں ۔ نوکری ، پرائی تابعداری کرے اُن کی بلا اور جن سے یہ کام ہو نہیں سکتا انھوں نے سر پر ڈالا برقع اور جدھر کو منہ اٹھا چل کھڑی ہوئیں ۔ پھر چھے گھڑی بھیک مانگی ، لدی پھندی گھر لوٹ آئیں ۔'' مبتلا ''لیکن میرے نزدیک تم کو ماما کی نہیں ، بلکہ ایسی عورت کی ضرورت ہے جو بال بچوں کی خبر گیری کرے ، وقت پر اُن کا ہاتھ منہ دھلائے ، کھانا کھلائے ، کپڑے پہنائے ۔ گھر کی چیز بست دھرے اُٹھائے ۔ غرض داروغہ کی طرح گھر کے سارے انتظام کی نگرانی کرکے تم کو آسائش پہنچائے ۔'' غیرت بیگم ''تم ہی کوئی اس طرح کی عورت ڈھونڈ کر نہیں لا دیتے !'' مبتلا '' لادوں تو رکھوگی ، اور کیا تنخواہ دوگی ؟'' غیرت بیگم ''ضرور رکھوں گی اور تنخواہ پانچ روپے اور کھانا کپڑا ۔'' مبتلا ''خیر ، اتنی ہی تنخواہ دینا ، مگر خاطرداری سے رکھنا ۔ لکھنؤ کی ایک عورت ہے ، خدا جانے کس تباہی میں آکر یہاں چلی آئی ہے ۔ اگر پھٹا پرانا ایک جوڑا کپڑا دو تو میں پہنا کر ابھی اُس کو لے آؤں ۔'' غیرت بیگم نے جلدی سے گٹھری کھول ، ایک جوڑا کپڑا نکال میاں کے حوالے کیا ۔ مبتلا کپڑے لے بیگم پاس پہنچا اور اس کو سمجھا دیا کہ اس طور پر میں

نے تمہارے گھر لے چلنے کی راہ نکالی ہے - مجھے اپنی بی بی کا حال معلوم ہے ، وہ یہی نہیں کہ صورت کی اچھی نہیں ، بلکہ اس میں عقل کی بھی کوتاہی ہے - صورت تو خیر ، تم خود چل کر دیکھ لوگی ، مگر عقل کی کوتاہی اسی[1] سے ظاہر ہے کہ اس نے عورت کے لانے کی فرمائش کی بھی تو مجھ سے - پس تم کو چند روز البتہ بے عزتی کا تحمل کرنا پڑے گا ، اس کے بعد مجھے کامل یقین ہے کہ تم گھر والی ہوگی ، اور وہ رہے گی تو تمہاری خدمت کرے گی یا اپنے میکے چلی جائے گی -'' غرض غیرت بیگم کا اتارن پہن ، معزز ماما یا داروغہ کا بھیس بنا ، بیگم مبتلا کے گھر جا داخل ہوئی - بھلے مانسوں کی بہو بیٹیوں کی طرح دبی جھکی سکڑی سمٹی - مبتلا کو تو اتنی جرأت نہ ہوسکی کہ خود لے جا کر غیرت بیگم سے ملادیتا ؛ دروازے کے اندر کر ، اتنا پکاردیا ''لو صاحب ! یہ داروغہ آتی ہیں -'' اور آپ مردانے میں جا بیٹھا - بیگم نے اپنے تئیں سنبھالا بہت ، مگر وہ جس قدر اپنے تئیں چھپاتی تھی اسی قدر اس کا پردہ فاش ہوتا جاتا تھا - آئی تو نوکروں کے نام سے اور عورتوں میں بیٹھی دلھنوں کی طرح گھونگھٹ نکال کر - رات کا تھا وقت ، غیرت بیگم نے کہا ''ذرا روشنی قریب لاؤ تو اُن کی صورت اچھی طرح نظر آئے -'' جوں غیرت بیگم نے زبردستی اس کا منہ کھولا ، دیکھتی کیا ہے کہ ایک عورت ہے جوان ، ماتھے پر افشاں چنی ہوئی ، پٹیاں جمی ہوئی ، الٹے بل کی چوٹی اور اس میں چنپا کا موباف ، کانوں میں چنبیلی کی کلیاں ، آنکھوں میں دھواں‌دھار سرمہ ، مسی کی دھڑی اور

---

۱ - شوہر سے ملازمہ تلاش کرنے کی فرمائش کرنا اور اس معاملے میں اس پر بھروسا کر لینا گویا بیوی کی انتہائی حماقت ہے -

دھڑی پر لاکھا ، ہاتھ پاؤں میں مہندی ، دور سے خوشبو پڑ
مہک رہی ہے ۔ غیرت بیگم دیکھتے کے ساتھ اس طرح ڈر ک
پیچھے کو ہٹی کہ جیسے کوئی بچہ بیچا سے بھاگتا ہے او
لگی کہنے ''اوئی بیوی ! یہ ماما کس قسم کی ، یہ تو کوئ
نامراد کنچنی ہے ۔'' پھر تو ہمسائے تک کی عورتیں گھر مے
آ بھریں اور سب نے مل کر بیگم کا ایسا برا ہڈا کیا کہ کوئ
دوپٹا اتارے لیے جاتا ہے ، کوئی پیچھے سے چوٹی گھسیٹ رہ
ہے ۔ اگر ذرا بھی بیگم وہاں اور رہے تو لڑکیاں اس کی بوٹیا
نوچ کر کھا جائیں ۔ مگر کسی رحم دل بی بی نے اس
ہاتھ پکڑ باہر ڈیوڑھی میں لے جا کر چھوڑدیا ، اور کہ
''بیوی بنو ! جدھر سے آئی ہے اُدھر ہی کو چلی جا ۔ وہ تم
گھر والی دل کی بڑی نیک ہے ، کوئی اور سری[۲] کی ہوتی تو
بے ناک چوٹی کاٹے نہ رہتی ۔'' مبتلا ڈیوڑھی کے بازو سے لگا ی
سب تماشا دیکھ رہا تھا ۔ کچھ ہنسی کچھ غصہ ، بیگم کو دیکھتے
ہی بولا ''واہ اچھی اپنی گت کرائی ! با وجودیکہ میں نے
سے کہہ دیا تھا کہ میں تم کو نوکری کے حیلے سے لیے چل
ہوں ، پھر تم کو ایسا بن سنور کرآنا اور اتنا لمبا چوڑا پرد
لگانا کیا ضرور تھا ؟ سیدھے سبھاؤ چلی آئی ہوتیں ، نہ کسی
کو شبہ ہوتا اور نہ چراغ لے لے کر کوئی تمہارا منہ دیکھتا
خیر اب ذرا کی ذرا یہاں ٹھہرو ، پھر میں تمہاری ٹپس جاتا ہوں
مگر دیکھو خبر دار کوئی ایسی بات نہ کرنا جس سے لوگو
کو میرے تمہارے لگاؤ کا شبہ ہو ۔'' مبتلا نے گھر کے اند

۲- حرف تشبیہ کے طور پر 'سری کا' 'سری کی' میر و مرزا کے زمانے سے متروک ہے ، لیکن دھلی کے عوام اب بھی بولتے ہیں ۔ مکالموں میں عامیانہ محاورے کی پیروی جائز ہے ۔

پاؤں رکھتے ہی پوچھا ''لڑکی کا کیا حال ہے ؟'' انا بولی ''اب تو اللہ کا فضل ہے - دو بار عرق پلایا ، اس قدر پسینہ آیا کہ شام سے تین کرتے بدل چکی ہوں -'' مبتلا '' بس ان شاءاللہ اب بخار گیا - بارے اب الحمد اللہ بچ گئیں '' (بیوی کی طرف مخاطب ہوکر) ''لاؤ صاحب کھانا تیار ہو تو منگواؤ -'' دستر خوان بچھا ، عادت کے مطابق میاں بی بی کھانا کھانے بیٹھے تو مبتلا نے پوچھا ، ''کیوں صاحب وہ عورت آئی تھی ؟'' غیرت بیگم ''واہ چوری اور سر زوری[۳] ! آج کو بڑے ماموں جان زندہ ہوتے تو اُلٹے اُسترے سے مردار کا سر منڈوا کر بھی بس نہ کرتے اور تم کو تو اپنی لاج کا لحاظ پاس آج کیا برسوں سے نہیں - بڑے ماموں جان کی زندگی تک چوری چھپے کرتے تھے ، وہ مرے تم کھل کھیلے - مردانہ مکان تو مدتوں سے کنچنیوں کا چکلہ ہورہا ہے ، ایک زنانہ مکان بچا تھا سو میں خوب جانتی ہوں کہ تم اس کی تاک میں لگے ہو ، مگر جب تک میں جیتی بیٹھی ہوں دیکھوں تو کون رستم کی جنی میری ڈیوڑھی کے اندر پاؤں رکھتی ہے ؛ اپنا اس کا خون ایک کردوں تو سہی -'' مبتلا ''بے وجہ بے سبب تم اس قدر کیوں گرم ہوتی ہو - بھلا اتنا تو سمجھو اگر وہ کنچنی ہوتی اور فرض کرو کہ مجھے اس کو بلانا منظور ہوتا تو مردانہ[۴] ہوتے ساتے مجھ کو اُس کے گھر میں لانے کی کیا ضرورت تھی ؟ ایک ، اور دوسرے خدا عقل دے تو سمجھنے کے لیے ایک موٹی بات یہ ہے کہ تمہارے مانگے کے کپڑے پہن کر کیوں آتی ؟'' غیرت بیگم ''کپڑا اور گہنا تو بیشک اس کے پاس نہ تھا

۳- عام محاورے میں ''چوری اور سینہ زوری'' ہے -
۴- مراد مردانہ حصۂ مکان یا بیٹھک -

مگر سر سے پاؤں تک چوتھی کی دلہن معلوم ہوتی تھی۔'' مبتلا ''تم کو چاہیے تھا کہ مجھ کو بلا کر پوچھتیں، اگر میں تمھاری تشفی نہ کر سکتا تب بھی اس بیچاری کا کیا قصور تھا، مجھ پر جتنا چاہتیں خفا ہو لیتیں۔ بات یہ ہے کہ حقیقت میں وہ آج شاموں شام تک کنچنی تھی، مگر میں اس کو مدت سے جانتا ہوں۔ ہمیشہ یہ مجھ سے کہا کرتی تھی کہ مجھ کو اس پیشے سے سخت نفرت ہے، اگر کہیں میری روٹی کا ٹھکانا لگ جائے تو میں تائب ہو جاؤں۔ جب تم نے نوکر رکھنے کا وعدہ کیا تو میں نے اس کو زبان دی اور وہ ارادے کی ایسی پکی اور سچی تھی کہ فوراً میرے ساتھ ہو لی اور پھر کس طرح پر کہ گہنا اور پاتا اور کپڑا لتا اور ساز و سامان، یعنی بھرا بھرایا گھر سب کو لات مار کر جس طرح بیٹھی تھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے بیشک جھک مارا اور میرا بال بال خدا کا اور تمھارا گنہگار ہے، مگر جس دن سے چچا باوا تشریف لائے تم میری کوئی ایک بات بتاؤ اور یوں اگر تمھارے مذہب میں توبہ کوئی چیز نہیں اور ناحق بدگمان رہو تو تمھاری خوشی۔ بھلا تم نے چند روز تو اس بیچاری غریب کو رکھ کر دیکھا ہوتا۔ جو شخص آٹھوں پہر آنکھوں کے سامنے رہے، اس کا حال آج نہیں تو کل، اور کل نہیں تو پرسوں، ضرور کھلے گا پر کھلے گا۔ نوکر سریش نہیں ہے کہ چمٹ جائے۔ مرضی ہوئی رکھا مرضی نہ ہوئی نہ رکھا، مگر چونکہ میرا قدم درمیان میں ہے، میں تم سے بات کہوں صاف، یوں بے خطا بے قصو تو میں اس کو ادھر میں نہیں چھوڑ سکتا۔ تم ہی بتاؤ کہ اب وہ جائے تو کہاں جائے؟'' غیرت بیگم ابھی کچھ ہاں نا کرنے نہیں پائی تھی کہ مبتلا نے کہا ''ماما جا، باہر ہریالی

عورت کھڑی ہے اس کو بلا لا ، اور کام کاج میں اُس سے مدد لیا کر۔'' غرض ہریالی نکالی جا کر پھر آموجود ہوئی۔ رات گئی تھی زیادہ ، لوگ کھانا کھا پی کر اپنی اپنی جگہ سو سلا رہے۔ ہریالی بھی تخت پر بے تکیے بے بچھونے ماماؤں میں سوئی۔ صبح جو اٹھے تو پھر لوگوں نے ہریالی کو گھورنا شروع کیا ، مگر اب اس کا سنگار ہوگیا تھا باسی ، اور تمام شب کی بد خوابی اور زحمت کی تکان سے اُس کا جوبن بھی نڈھال ہو رہا تھا ، لوگوں نے کچھ بہت اُس کا پیچھا نہیں کیا۔ اس میں شک نہیں کہ گھر میں ایک منتظم عورت کی سخت ضرورت تھی اور یہی ضرورت ہریالی کے پاؤں جم جانے کا سبب ہوئی۔ ہریالی نے جو صبح سویرے اٹھ کر دیکھا تو تمام اسباب مولی گاجر کی طرح سارے گھر میں پھیلا پڑا ہے۔ اُس نے خود کھڑے ہو کر جہاں جہاں فرش تھا اُٹھوا کر دالانوں میں ، صحنچیوں میں ، دروں میں ، باورچی خانے میں ، یہاں تک کہ ڈیوڑھی میں جھاڑو دلوائی۔ ٹوکروں نہیں چھکڑوں کوڑا نکلا اور بہت سی گری پڑی چیزیں ملیں ، جن کو ڈھونڈ ڈھونڈ صبر کر کے بیٹھ رہے تھے اور سمجھ لیا تھا کہ کھوئی گئیں۔ مٹی کی تہیں جمتے جمتے دریوں کا یہ حال ہو گیا تھا کہ اصلی رنگت پہچان نہ پڑتی تھی ، جھڑوایا تو منوں گرد۔ دروازوں میں جو چلمنیں اور پردے بندھے تھے ، اُلٹے سیدھے کا تو کس کو امتیاز تھا ، کوئی دھر تک بندھا ہے تو کوئی آدھے در میں پڑا لٹک رہا ہے ، اور کسی کا لپیٹ ایک طرف کو جھک کر نکل پڑا ہے تو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ اُس کو برابر کر دیں ، بلکہ کئی پردوں میں سے تو فاختاؤں اور جنگلی کبوتروں اور گلہریوں کے گھونسلے نکلے۔

گھر میں تخت تو بہتیرے ہیں، مگر بیٹھنے کے دالانوں میں زمین پر بورے بچھے ہیں، بوریوں پر دریاں، دریوں پر چاندنیاں۔ لونڈیاں اور ماماٸیں ہیں کہ بے تکلف مٹی اور کیچڑ کے ننگے ننگے پاؤں چاندنیوں پر لیے پھرتی ہیں، اور چاندنیوں کا مارے دھبوں اور چکتوں کے یہ حال ہو رہا ہے کہ آنکھ اٹھا کر دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ صبح سے کھڑے کھڑے ہریالی کو دوپہر ہوگئی تب کہیں جا کر اتنا کام ہوا کہ گھر میں جھاڑو دی گئی۔ دالانوں میں اس حساب سے تخت بچھوائے کہ بیچ میں فرش اور ادھر اُدھر ماماؤں اور لونڈیوں کے چلنے پھرنے کی جگہ۔ اب چاندنیوں اور تکیوں کے غلاف اور پلنگوں کی چادروں کی ڈھنڈیا پڑی۔ قاعدہ ہے کہ جب چیزوں کا انتظام نہیں ہوتا تو یہی شناخت ہے کہ چیزوں کی حفاظت بھی نہیں۔ اتنا بڑا گھر اور اس وقت دھوئی ہوئی صرف تین چاندنیاں درکار تھیں وہ بھی نہیں ملتی تھیں۔ غیرت بیگم نے بہتیرے پتے بتائے ''ارے کم بختو! ابھی ہفتے عشرے کا ذکر ہے دھوبن چاندنیوں کا گٹھر لائی، وہ سب ڈھیر کا ڈھیر کیا ہو گیا؟ لٹھے کی وہ کوری چاندنی جو بیچ کے دالان میں بچھی تھی اور پرسوں اترسوں اس پر سالن کی دیگچی مبارک قدم کے ہاتھ سے الٹ پڑی تھی اور میں نے صاف کرنے کے لیے اٹھوا دی تھی، کہاں ہے؟'' جتنی کھڑی تھیں ایک ایک کا منہ دیکھتی تھی، اور ایک ایک پر ٹالتی تھی۔ آخر بڑی مشکل سے دو چاندنیاں اناج کی کوٹھری میں مچان پر پڑی ملیں، جن میں چوہوں نے کاٹ کاٹ کر بغارے ڈال دئے تھے اور ایک میں کسی ماما نے سوکھے ٹکڑے باندھ کر کھونٹی پر لٹکا رکھے تھے۔ اس جستجو میں معلوم ہوا کہ کئی چاندنیاں باہر سائیس کے پاس ہیں، وہ اوڑھ کر

سوتا ہے ۔ دو یا تین چاندنیاں کسی کو مانگے دی تھیں وہ واپس نہیں آئیں ۔ میلی چاندنیوں کا ایک ڈھیر غسل خانے میں پڑا ملا ۔ غرض اس وقت تو ہریالی نے کسی طرح گھونتھ گانتھ کر فرش کو پورا کیا ۔ پلنگ سب کے سب جھولا ہو رہے تھے ، ان کو کسوا کر اُجلی چادریں بچھوا دیں ۔ تکیوں کے غلاف بدلے ، اُجلا دسترخوان نکلوا دیا ۔ اتنے میں معلوم ہوا کہ میاں (مبتلا) کھانے کے لیے آ رہے ہیں ۔ ہریالی یہ سن کر سامنے سے ٹل باورچی خانے کی آڑ میں ہو گئی ۔ مبتلا نے آ کر دیکھا تو اتنی ہی دیر میں گھر کی صورت بدلی ہوئی تھی ۔ سمجھا کہ یہ سب ہریالی کے تصرفات ہیں ۔ دالان میں بیٹھ کر کھانا مانگا تو باورچی خانے سے دو لونڈیاں سالن کی دو دو رکابیاں لے کر چلیں ۔ پیچھے سے ایک ماما ہاتھ میں روٹیوں کی تھئی اُٹھا کر دوڑی ۔ ہریالی سے نہ رہا گیا ، عین وقت پر کیا ہو سکتا تھا ، مگر خیر ان جاتیوں کو روک کر جلدی جلدی تھالی جوڑ ، پانی پینے کی صراحی ، سینی ، سلفچی ، خاصدان ، اگالدان ، سب چیزیں منجوائیں ، سینی کے بیچ میں روٹی ، گرداگرد سالن کی رکابیاں جما ، اوپر سے خوان پوش ڈھک ، ایک لونڈی کے سر پر رکھوا ، سمجھا دیا کہ ''دیکھ خبردار آگے دیکھ کر آہستہ آہستہ چلیو[۵] ، کہیں ٹھوکر نہ لگے ۔'' اور دوسری لونڈی کو سلفچی ، آفتابہ اُجلا دسترخوان دے کر اس کے ساتھ کیا کہ ''پہلے تخت کے نیچے کھڑی رہ کر میاں بی بی دونوں کے ہاتھ دھلائیو ۔ جب ہاتھ دھو چکیں سلفچی ، آفتابہ الگ رکھ کر دونوں کے بیچ میں

۵- چلیو ، رکھیو ، دیجیو ، یہ دھلی و نواح دھلی کا محاورہ ہے ؛ ہریالی لکھنؤ کی تھی ، مصنف کو خیال نہ رہا کہ لکھنؤ والے اس طرح نہیں بولتے ۔

اُجلا دسترخوان بچھائیو ، اور سینی احتیاط کے ساتھ اتروا کر روٹیاں بیچ میں رکھیو - دو قسم کا سالن ہے ، دونوں کے سامنے دونوں قسم کا رکھ دیجیو - تھالی جوڑ اور پانی پینے کی صراحی پیچھے سے بھجواتی ہوں - جب مانگیں تو خبردار آدھے کٹورے سے زیادہ بھر کر نہ دیتا اور پانی جو پلانا تو جھک کر کٹورا آگے کر دینا کہ خود اپنی آنکھ سے دیکھ لیں اور تھالی منہ کے نیچے رکھنا کہ پانی کپڑوں پر گرنے نہ پائے -'' گھر میں چٹنی ، اچار ، مربا ، سبھی کچھ تھا ، مگر دسترخوان پر رکھنے کا دستور نہ تھا - جس کسی کو بھی کسی چیز کا خیال آگیا اور منہ پھوڑ کر مانگی تو مرتبان یا اچاری اُس کے پاس لے جا کر روٹی پر ایک پھانک رکھ دی - ہریالی نے چار قسم کی چار پیالیاں ایک رکابی میں لگا ، ابھی کھانا شروع نہیں کرنے پائے تھے کہ پہنچا دیں - کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کو گرم پانی کا آفتابہ اور ایک طشتری میں بیسن ، کھانے کو خاصدان میں بھیگی ہوئی صاف سے لپٹی ہوئی گلوریاں پہلے سے تخت پر رکھوا دیں - یہ تو ہریالی کے پہلے دن کے ، بلکہ پورا دن بھی نہیں دوپہر کے اور جلدی کے کام تھے - مہینے بھر کی محنت میں اُس نے کپڑے کا ، کھانے کا ، سامان خانہ داری کا ، اندر باہر دونوں جگہ کے نوکروں کا ، بازار کے سودے سلف کا ، سب انتظام کر دیا - سلیقہ بھی عجب چیز ہے - اندر باہر عورت مرد جتنے نوکر تھے آپ سے آپ سب ہریالی کا ادب کرنے لگے - معصوم ایسا ہلا کہ دن رات میں ایک دم کے لیے گود سے نہیں اُترتا تھا - بتول کی کیا بساط تھی ، کیسی ہی پھڑکتی ہو آواز سنی اور چپکی ہوئی ؛ غیرت بیگم کے دل میں اس کی طرف سے شک تو تھا ، مگر ہر چند ٹوہ لگائی کوئی بات نہ پکڑ پائی -

مبتلا کے گھر میں آنے کے وقت مقرر تھے - ہریالی ان وقتوں میں ادبدا کر کسی نہ کسی بہانے سے ٹل جاتی تھی اور اگر احیاناً بضرورت سامنے چلی پھری بھی تو ایک دوسرے سے ایسے بے رخ بن جاتے تھے کہ تعلق کیسا ، گویا جان پہچان تک بھی نہیں ، مگر خدا جانے دونوں کو کیا ڈھب یاد تھا کہ اتفاق اچٹتی ہوئی ایک نگاہ اُن کے حق میں خلوت کا حکم رکھتی تھی - نہیں معلوم مبتلا آنکھوں ہی آنکھوں میں کیا کہہ دیا کرتا تھا کہ ہریالی برابر سرگرمی اور دل سوزی کے ساتھ گھر کے کام میں مصروف رہتی تھی - سچ ہے غیرت بیگم کے ساتھ مبتلا کے دل کے نہ ملنے کا بڑا سبب تھا مبتلا کی حسن پرستی اور آوارگی مگر اتنا قصور تو غیرت بیگم کا بھی ضرور تھا کہ اس نے مبتلا کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے ذرا بھی کوشش نہیں کی - وہ سمجھتی ، جیسا کہ گھر کی بیبیاں اکثر سمجھا کرتی ہیں ، کہ جب ماں باپ نے میاں کے ہاتھ میں ہاتھ پکڑا دیا تو بس مجھے اپنی طرف سے کچھ کرنا نہیں ، اب میاں کا کام ہے کہ کما کر لائے اور مجھے کھلائے پہنائے ، میری خاطرداری و مدارات کرے لیکن اس کو اتنی بات اور سمجھنی چاہئے تھی کہ کھلانا پہنانا ، خاطرداری اور مدارات کرنا ، سب چیزیں متفرع ہیں رغبت پر ، رغبت کرنا میاں کا کام ہے اور دلانا بی بی کا - رہی یہ بات کہ بی بی کیونکر میاں کو رغبت دلائے ، اس کے لیے کوئی ایسا قاعدہ نہیں کہ ہر جگہ چل سکے ، کیونکہ ہر ایک کا مزاج مختلف اور ہر شخص کی رغبت جدا ، لیکن بی بی اگر چاہے تو اس کو اپنے میاں کی رغبت کا معلوم کر لینا کیا مشکل ہے ؟ مثلاً غیرت بیگم اتنا تو دیکھتی تھی کہ مبتلا کیسی صفائی اور کس شان کے ساتھ رہتا ہے ، وہ ہر چیز میں حسن چاہتا تھا -

خیر حسن صورت مبتلا کی پسند کے لائق تو اختیاری بات نہ تھی، مگر جس قدر اختیاری تھی غیرت بیگم نے اتنی ہی کر کے دکھائی ہوتی - گھر کی صفائی ستھرائی ، ساز و سامان کی درستی ، انتظام کی خوبی ، یہ چیزیں بھی داخل حسن ہیں اور طبیعت میں سلیقہ ہو تو ہاتھ پاؤں کے ، اور غیرت بیگم کی تو زبان کے ہلانے سے سب کچھ ہو سکتا تھا ، مگر اُس نے ان چیزوں کی طرف کبھی بھول کر بھی توجہ نہ کی - مردانے مکان میں میاں کی بیٹھک تھی ، اُسی کو دیکھ کر متنبہ ہوئی ہوتی - اس کا اپنا کیا حال تھا کہ میاں کو جو شروع شروع میں اپنی طرف سے بے رخ پایا تو تین تین چار چار دن سر میں کنگھی ندارد ، لونڈیوں کے تقاضے سے دسویں پندرھویں سر دھویا ہے تو بالوں میں تیل کی خبر نہیں ، پھولے پھولے روکھے بال ، دور سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کڑک ناتھ ، کڑک مرغی بیٹھی[٦] ہے ، آنکھوں میں سرمہ نہیں، ہاتھ پاؤں میں مہندی نہیں ، پھول نہیں ، عطر نہیں ، گوٹا نہیں ، کناری نہیں : غرض عورتوں کے سنگھار کی کوئی چیز نہیں - مبتلا کو پہلے استکراہ تھا ؛ غیرت بیگم کی بے تدبیریوں نے استکراہ کو نفرت اور نفرت کو ضد اور ضد کو چڑ بنا دیا - صورت شکل میں ہریالی کچھ غیرت بیگم سے زیادہ اچھی نہ تھی ، مگر چھٹانک بھر حسن ہوتا ہے تو غور و پرداخت سے ، دیکھنے والوں کی نظر میں سیر بھر جنچنے لگتا ہے - سو غور و پرداخت

٦- کڑک مرغی جب بیٹھتی ہے تو اس کے پر و بال کچھ کھڑے اور پھولے پھولے ہوتے ہیں : کڑک ناتھ ، یعنی سیاہ رنگ والی مرغی کی یہ تصویر ذہن میں لائیے - تشبیہ کتنی مضحکہ خیز اور موزوں ہے - ایک عمدہ پھبتی میں یہی دو خوبیاں ہوتی ہیں -

کے عوض غیرت بیگم تو یہ چاہتی تھی کہ اُبٹنے کی جگہ تھوڑی سی کیچڑ ملے تو اُٹھا کر منہ کو مل لوں ۔ میاں بی بی میں جب اختلاف مزاج اس درجے کا ہو تو اُن میں صحبت برآر ہونے کی کیا اُمید ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چھاتی پر مونگ دلنے کے لیے آخر ایک سوکن تو آ موجود ہوئی ! ہریالی کا انتظام دیکھ دیکھ کر غیرت بیگم کا پھوہڑ پن مبتلا کے دل میں اور بھی بیٹھتا چلا جاتا تھا ۔

اکیسویں فصل

غیرت بیگم پر اپنی سوکن کے راز کا فاش ہونا

معلوم نہیں مبتلا کو کب تک ہریالی کا اس نمط پر رکھنا منظور تھا کہ ایک دن گھر میں باہر سے اطلاع پہنچی کہ ایک بوڑھی عورت نوکری کی جستجو میں آئی ہے ، اگر حکم ہو اندر بھیج دیں ۔ انتظام خانہداری تو سب ہریالی کے ہاتھ میں تھا ، غیرت بیگم نے ہریالی سے پچھوایا ؛ ہریالی کسی کوٹھری میں خدا جانے کس کام میں مصروف تھی ، اس نے وہیں سے کہا ''کیا مضائقہ ۔'' غرض وہ عورت اندر آ کر سیدھی غیرت بیگم کے پاس جا بیٹھی ، اور لگی کہنے کہ میں تو ہریالی بیگم کے پاس آئی ہوں جن کو تمھارے میاں نکاح پڑھوا کر نکال لائے ہیں ، مدت سے میں ان کے یہاں اوپر کے کام پر نوکر تھی ؛ بیگم کو تو نکلے ہوئے تین مہینے ہونے آئے ہیں ، میں ان کی خالہ کے پاس رہی ، آج آٹھواں دن ہے کہ وہ بھی لکھنؤ سدھاریں ۔ میں نے کہا چلوں اگر بیگم پھر رکھ لیں تو میں ان کے مزاج سے واقف ہوں ، وہ مجھ کو جانتی پہچانتی ہیں ، ان جان جگہ تابعداری کرنی کیا ضرور ۔ کیا وہ اس گھر میں نہیں رہتیں؟ غیرت بیگم نے ہاتھ سے اشارہ کر کے بتایا کہ تم جن کے پاس آئی ہو وہ سامنے والی کوٹھری

میں ہیں ۔ وہ عورت اُٹھ کر کوٹھری کی طرف چلی ، دروازے تک پہنچی تھی کہ اتنے میں غیرت بیگم بے خود ہو کر بگولے کی طرح اُٹھی ، اور وہ عورت ابھی ہریالی سے بات بھی نہیں کرنے پائی تھی کہ اُس نے پہنچ کر بیچاری بڑھیا کو اوندھے منہ ہریالی پر دھکیل دیا ، اور کہا کہ ''تم نے دیکھا، یہ ہریالی نہیں گھر والی ہے ۔ یہ بی بی ہے ۔ یہ میری سوکن ہے ۔ میں رانڈ ہوں ، یہ سہاگن ہے ۔ میں لونڈی ہوں یہ بیگم ہے ۔ میں چڑیل ہوں ، یہ حور ہے ۔ یہ میاں کی لاڈو ہے ۔ یہ میاں کی چہیتی ہے ۔ یہ میاں کے کلیجے کی ٹھنڈک ہے ۔'' یہ کہتی جاتی تھی اور اس کے ساتھ ہزارہا گالیاں اور سیکڑوں کوسنے اور دوھتڑ تھا کہ باری باری سے اُس شامت کی ماری بڑھیا اور ہریالی پر اور اپنے آپ پر بھی اس زور سے پڑ رہا تھا کہ گویا مزدور سڑک کوٹ رہے ہیں ۔ گھر میں بہتیری لونڈیاں اور مامائیں تھیں ، مگر سیدانی کا جلال دیکھ کر کسی کی ہمت نہ پڑ سکی کہ کوٹھری کی طرف رخ کرے ۔ سب کی سب بدحواس ہو کر بھاگ کھڑی ہوئیں ۔ ہمسائے کی عورتیں کوئی کھڑکیوں میں سے کوئی دیوار پر سے کھڑی جھانکتی تھیں ، پر کسی سے اتنا نہیں ہو سکتا تھا کہ گھر کے اندر قدم رکھے ۔ مبتلا کو دکھلوایا تو وہ بھی اس وقت کہیں باہر گیے ہوئے تھے ۔ مردانے میں ٹٹروں ٹوں اکیلا وفادار ، اس کو اور تو کچھ نہ سوجھی ، گھوڑا تو دروازے پر بندھا ہوا تھا ہی ، منہ میں لگام دے ، ننگی پیٹھ سوار ہو ، بگ ٹٹ سیدھا پہنچا کچہری میں سید ناظر کے پاس ۔ ناظر اُسی گھوڑے پر چڑھ ، دھم سے آ موجود ہوئے اور اتفاق سے سید حاضر بھی کسی ضرورت سے دو تین دن کے آئے ہوئے تھے ، کچہری سے

آن کے پاس بھی آدمی دوڑا دیا کہ آپ بھی جلد آئیے ۔ غرض سید حاضر اور مبتلا بھی آگے پیچھے پہنچ گئے ۔ غیرت بیگم سید ناظر کے آنے سے پہلے کھڑی اور پڑی اتنا پیٹی اتنا پیٹی کہ آخر اس کو غش آ گیا ۔ ناظر جس وقت پہنچا ہے تو وہ بالکل بےہوش پڑی تھی ۔ ناظر نے آنے کے ساتھ اس کو ہوش میں لانے کی تدبیریں شروع کیں ۔ سید حاضر اور مبتلا دونوں آ لیے ہیں ، اس کے بہت دیر بعد غیرت بیگم کو ہوش آیا ؛ سب سے زیادہ چوٹ غیرت بیگم ہی کو لگی کہ اس نے پیٹ پیٹ کر اپنا سارا بدن چوڑی کی طرح نیلا کر لیا تھا ۔ ہریالی کی بھی کندی خوب ہوئی مگر اس کو گجی مار لگی تھی ؛ بڑھیا ہریالی اور کوٹھری کی دیوار کے بیچ میں آ کر بچ گئی، مگر وہی مثل ہے کہ مرغی کو تکلے ہی کا گھاؤ بہت ہوتا ہے ۔ دو تین دوھتڑ جو اس پر جمتے ہوئے بیٹھ گئے ، وہ اتنے ہی میں سبکیاں لینے لگی ۔ اگر ناظر نہ ہو تو کوتوالی والے کیا اس مقدمے کو بے چالان کیے رہیں ، توبہ ! اور اگر حاضر نہ ہوتا تو ناظر اور مبتلا آپس میں کٹ مریں ۔ پانچ چھ دن تو بیماروں کی دوا دارو ہوتی رہی ۔ باندھنے کے موقع پر آنبا ہلدی کا حلوا پکا پکا کر باندھا ، سینکنے کی جگہ پرانے روڑ اور ریہ سے سینکا ۔ پھٹکری کو دودھ میں جوش کر کے پلایا ۔ اب کیا باقی رہ گیا تھا جس کے لیے مبتلا کو ہریالی سے ملنے میں تامل ہوتا ۔ حاضر ناظر بہن کی خدمت گزاری میں لگے تھے اور مبتلا کھلم کھلا ہریالی اور اس کی بڑھیا کی ۔ بارے جب سب کے ہوش و حواس درست ہوئے تو لگے اپنی اپنی جگہ صلاحیں کرنے ۔ مبتلا اور ہریالی کی تو یہ مصلحت گٹھی کہ اب اسی گھر میں برابری کے داعیے سے رہنا اور جلتوں کو خوب جلانا ۔ ادھر حاضر ، ناظر ، غیرت بیگم کے

ھی میں پھوٹ[1] تھی ۔ ناظر کہتا تھا کہ ابھی لگے ھاتھ
نھانے میں اطلاع لکھوا کر ایک دم سے تین نالشیں تو
اری میں داغو ۔ مداخلت بے جا کی ھریالی پر اور ضرر رسانی
ہنے اور دونوں بچوں کے نفقے کی مبتلا پر ، اور ایک دعویٰ
کا کاغذ کامل[2] القیمت پر دیوانی میں دائر کرو ۔ غیرت بیگم
ے مقدمے کو تو کچھ سمجھتی بوجھتی نہ تھی ، وہ اپنی
ایک بات پر اڑی ھوئی تھی کہ مجھ کو سید نگر پھنچاؤ
تو افیون کھاتی ھوں ۔ سید حاضر تھا میر متقی صاحب کے
، چینوں میں اور بات کے انجام کو سوچتا تھا ؛ اُس کی رائے
ھی کہ ''نہ تھانے میں اطلاع لکھواؤ ، نہ سرکار دربار میں
طرح کی نالش فریاد کرو ، نہ سید نگر جاؤ ، نہ افیون
؛ صبر کر کے چپ چاپ گھر میں بیٹھی رھو ۔ سوکن کا
ہاری تقدیر میں تھا سو ھوا ۔ اب تمھارے شور و فساد سے
ھو گا تو شاید اس گھر سے نکل جائے ، مگر تم اپنے میاں کو
کے چھوڑ دینے پر مجبور نہیں کر سکتیں ۔ تم جو سید نگر
یا افیون کھانے کو کہتی ھو ، یہ تمھاری نا مراد سوکن کی
راد ھے ۔ ناظر بھائی نے جو تدبیر بتائی اُس کا خلاصہ ھے لڑائی
لڑائی کا ضروری نتیجہ ھے نقصان اور تردد اور فضیحت اور
، ۔ اب تو سوکن کے آنے سے تم کو صرف ایک خیالی
پھنچی ھے اور تم افیون کھانے کو موجود ھو ، لڑائی کی
، میں بہت سی واقعی تکلیفیں ایسی پیش آئیں گی کہ شاید
ے ساتھ مجھ کو اور ناظر بھائی کو بھی افیون کھانی پڑے۔

---

[1] ۔ اس اختلاف آراء سے تین مختلف مزاجوں اور ذھنیتوں کا فرق واضح
نا ھے ۔

[2] ۔ مہر کے مطابق پوری کورٹ فیس کے اسٹامپ پر ۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سوکن کے آنے پر تم اس قدر آپے سے باھر کیوں ھو ، کیا سوکن تم پر آج آئی ھے ؟ تمھارا تو بیاہ ھوا ھے پیچھے اور سوکنیں تمھارے بیاہ سے بہت پہلے کی آئی ھوئی موجود تھیں ۔ کیا تم کو معلوم نہیں ! تم ھی بتاؤ کہ مبتلا بھائی کس دن بے سوکن کے رھے ؟ سارا سید نگر جانتا ھے کہ میں نے تمھاری منگنی کے وقت بہتیرا غل مچایا، مگر میری سنتا کون تھا ، میں تو تمھارے نصیبوں کو اسی دن روچکا جس دن تمھاری بات ٹھہری ۔ تمھاری سمجھ کا پھیر ھے ورنہ میں تو حقیقت میں اس بات کو سن کر بہت خوش ھوا کہ مبتلا بھائی نے نکاح پڑھا لیا ۔ اس سے تو یہ پایا جاتا ھے کہ انھوں نے آوارگی سے توبہ کی ، وہ کوٹھوں کوٹھوں سر بازار خدائی خوار پڑا پھرنا بہتر یا ایک کا ھو رھنا اور اس کو اپنا کر لینا بہتر ؟ تم کیسی مسلمان ھو کہ ایک شخص جب تک خلاف شرع چلتا رھا تم نے ھوں تک نہ کی ، اس کا طریقۂ شریعت پر آنا تھا کہ تمھارے تن بدن میں آگ ھی تو لگ گئی ۔ ھم تو بھائی ایسے دین و ایمان کے قایل نہیں ، بلکہ انصاف کی بات تو یہ ھے کہ مبتلا بھائی نے تمھارا بڑا لحاظ کیا کہ نکاح کو تم سے چھپایا اور تمھاری خاطر سے بی بی کو ماما بنایا ، اور میں سمجھتا ھوں کہ اگر تم پردہ فاش نہ کرتیں تو مبتلا بھائی اس عورت کے ساتھ اپنے معاملے کو اسی طرح دبا دبایا رھنے دیتے مگر تم نے بیٹھے بٹھائے سوتی ھوئی بھڑوں کو جگایا ، ان کو حیلہ ھاتھ آیا ۔ اب اگر وہ اس عورت کی اور بڑھیا کی دل جوئی اور خبرگیری نہ کرتے تو سارا گھر کھچا کھچا پھرتا ۔ میں نے تو جس وقت آ کر بڑھیا کو دیکھا ، میں تم سے سچ کہتا ھوں کہ میرے تو ھوش اڑ گیے تھے ۔ ھاتھ پاؤں ٹھنڈے برف ، چہرے کی

رنگت متغیر ، میں تو سمجھا خدا جانے کہاں بے موقع صدمہ پہنچا کہ اس کا سانس پیٹ میں نہیں سماتا ۔ پوچھو میاں ناظر سے ، اخباروں میں کئی بار دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی گورے نے ایک قلی کو تھپڑ کھینچ مارا یا ٹھکرا دیا اور قلی فوراً مر گیا ۔ غیرت بیگم تم نے یہ بڑی سخت بے جا حرکت کی اور اگر تم اس طرح دست درازی کرو گی تو یقین جانو تم اپنی تو اپنی ایک نہ ایک دن سارے خاندان کی ناک کٹوا دو گی ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے چند بد نصیب بندے ، یعنی لونڈیاں جو تمہارے اختیار میں ہیں ، تم حق ناحق اپنا غصہ اُن پر نکالتی رہتی ہو ۔ یہ ۔ چاریاں تمہارا کچھ کر نہیں سکتیں ۔ ہاتھ چھوٹا ہوا طبیعت بڑھی ہوئی ، تم سمجھیں کہ سب جانور ایک ہی لاٹھی سے ہانکے جاتے ہیں ۔ سوکن اور بڑھیا دونوں کو اُٹھا کر پیٹ ڈالا ، گویا وہ تمہاری لونڈی ہے اور یہ تمہاری باندی ۔ وہ تو خدا نے اتنی خیر کی کہ بڑھیا مری نہیں ، اور ادھر عین وقت پر آ پہنچے میاں ناظر کہ اُن کے ملاحظے سے کوتوالی والوں نے تھوپ تھاپ کردی ، ورنہ ساری شیخی کر کری ہو جاتی کہ سادات سید نگر کی بیٹی ، میر مہذب کی بہو کی ڈولی کوتوالی کے چبوترے پر دھری ہوتی ۔ صد آفریں ہے تمہاری سوکن پر ! ہے تو ذات کی کنچنی ، مگر بڑی ضبط کی آدمی ہے کہ تم سے کہیں زبردست معلوم ہوتی ہے ، مگر چپکی مار کھایا کی اور اُلٹ کر اُف تک نہ کی ۔ کیوں غیرت ! بھلا جیسا تم نے اُس کو مارا تھا اگر وہ بھی برابر سے مارتی تو تمہاری عزت تو دو کوڑی کی ہو جاتی ، مگر اتنا فایدہ تو ضرور تھا کہ پھر تمہارا ہاتھ کسی پر نہ اُٹھتا ۔'' سید حاضر نے ناظر اور غیرت بیگم کو ایسا آڑے ہاتھوں لیا کہ

دونوں کو کچھ جواب نہ بن پڑا اور دونوں اپنا اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ آخر ناظر بولا کہ ''آپ ہم دونوں سے بڑے ہیں جو کچھ آپ کے نزدیک مناسب ہو اس کی تعمیل میں نہ مجھ کو عذر ہے اور نہ آپا کو۔ یہ معاملہ ناموس کا ہے اور بھائی بہنوں کی ناموس کچھ جدا جدا نہیں ہوتی۔ اس میں رتی برابر فرق نہیں کہ آپ جو کچھ کریں گے آپا کے حق میں بہتر ہی کریں گے۔'' سید حاضر نے کہا ''بس تو مجھ کو مبتلا بھائی سے دو باتیں کر لینے دو، ان شاء اللہ میں کوئی ایسی راہ نکالوں گا کہ دونوں میاں بی بی میں صفائی ہوجائے۔'' ایسا موقع تاک کر کہ مبتلا مردانے میں اکیلا تھا، سید حاضر خود اس کے پاس گئے۔ جس وقت سے گھر میں یہ واردات ہوئی تھی حاضر اور ناظر دونوں کی طرف سے برے ہی برے خیالات مبتلا کے دل میں گزرتے تھے۔ اس کو ساری عمر کبھی کچہری جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ بس کچہری کے نام سے اس کا دم فنا ہوتا تھا اور حاضر ناظر دونوں کو، خصوصاً ناظر کو کچہری ایسی تھی جیسے مچھلی کو تالاب، مویشی کو تھان، پرند کو گھونسلا، عورت کو میکا۔ باوجودیکہ سر تا سر قصور غیرت بیگم کا تھا، مگر مبتلا الٹا چور کی طرح سہما جاتا تھا کہ دیکھئے یہ بھائی بہن کئی کئی دن سے کمیٹیاں کر رہے ہیں، کیا فساد کھڑا کرتے ہیں۔ اس کے دوست آشناؤں میں بھی کسی کسی نے اس کو کوتوالی اور فوجداری میں استغاثہ کرنے کی صلاح دی تھی، مگر ہر چند اس کو مردوا بناتے تھے، کچہری کا نام آیا اور اس کا رنگ فق ہوا؛ وہ بگڑ بگڑ کر ایک ایک کی منت کرتا تھا کہ یارو مجھ سے مدعی بننے کی توقع مت کرو۔ کوئی ایسی تدبیر بتاؤ کہ اگر یہ لوگ مجھ پر نالش کریں اور کریں ہی گے، تو مجھ کو حاکم کے

روبرو نہ جانا پڑے ۔ بہتیرا لوگ سمجھاتے تھے کہ ان کی طرف سے نالش کے ہونے کی کوئی روداد نہیں اور فرض کیا نالش ہو بھی تو تم اپنی طرف سے جواب دھی کے لیے مختار یا وکیل کھڑا کر دینا ، بلکہ بعضے تو شرط باندھتے تھے کہ اگر نالش ہو اور خدا نخواستہ تم پر کسی طرح کی آنچ آ جائے تو حاکم جو سزا تمھاری تجویز کرے اس کی چوگنی ہم بھگتنے کو موجود ہیں ، چاہو ہم سے لکھوا لو ۔ مبتلا کہتا تھا " تم ناظر بھائی کے ہتھکنڈوں سے واقف نہیں ہو ۔ ارے میاں وہ اس بلا کا آدمی ہے کہ چچا باوا بے چارے کسی کے لینے میں نہیں دینے میں نہیں ، اس نے دل پر رکھا تو شہر سے نکلوا کر چھوڑا ۔" مبتلا کا حال یہ ہوگیا تھا کہ ہریالی اور اس کی بڑھیا کی مرہم پٹی کی ضرورت سے کھڑے کھڑے گھر میں جاتا تو الٹے پاؤں باہر بھاگا ہوا آتا کہ دیکھوں کہیں سرکار سے طلبی تو نہیں آئی ۔ اتنے دن نہ تو اس نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا اور نہ پوری نیند سویا ۔ اگر تھوڑے دن اور سید حاضر کی طرف سے سبقت نہ ہو تو مبتلا اس قدر پریشان تھا کہ وہ خود ابتدا کرتا اور اتنے دن بھی وہ اپنے آپ کو لیے رہا تو ان لوگوں کی ناراضامندی کے خیال سے اس کو جرأت نہیں ہوئی ۔ سید حاضر کو دور سے آتا ہوا دیکھ کھڑا تو ہوگیا ، مگر اس وقت تک اس کے دل میں کھٹکا تھا کہ ان کا آنا خالی از علت نہیں ۔ جب سید حاضر نے قریب پہنچ کر معانقے کے لیے ہاتھ پھیلائے تو اس کو اطمینان ہوا ، اور بھائی کے گلے لگ کر غیرت بیگم کی زیادتی اور اپنی مجبوری اور اتنے دن کی پریشانی کو یاد کر کے خوب رویا ۔ سید حاضر کا بھی جی بھر آیا کہ دیکھو خدا کے فضل سے گھر میں سب طرح کی فراغت ہے ، ایک چھوڑ دو دو

بیبیاں ہیں ، بچے ہیں ، کسی بات کی کمی نہیں مگر ایک بری لت جو اپنے پیچھے لگا لی ہے تو زندگی کیا تلخی سے گزرتی ہے ۔ معانقے کے بعد دونوں بھائی ایک جگہ بیٹھے تو سید حاضر نے کہا " مبتلا بھائی ! یہ نیا رشتہ تمھارے ساتھ کیا ہوا کہ وہ پرانا رشتہ بھی اس کے پیچھے گیا گزرا ہوا ۔ دیہات کا کم بخت کیا برا دستور[۳] ہے کہ ہم تو بہن کے گھر پر بلا ضرورت آ نہیں سکتے ، اب تمھاری ہی طرف سے ملاقات ہو تو ہو ۔ سید نگر تو بھلا تم کیوں آنے لگے ، شہر میں بھی تم کہیں نظر نہیں آتے ۔ آج آٹھواں دن ہے کہ میں بلا ناغہ دونوں وقت یہاں آتا ہوں ۔ تم کو دو چار بار دیکھا بھی ، مگر تمھارا رخ نہ پایا ۔ آخر آج مجھ سے نہ رہا گیا تو میں نے کہا لاؤ میں ہی پیش قدمی کر کے تم سے ملوں "۔ مبتلا " کیا کہوں میں تو ندامت کی وجہ سے نہیں مل سکا "۔ حاضر " ندامت کی کیا بات ہے! عورتیں ناقصات العقل آپس میں لڑا جھگڑا ہی کرتی ہیں ۔ اگر مرد ایسی ایسی باتوں کا خیال کیا کریں تو دنیا میں کیسے گزر ہو ۔" مبتلا ۔ " آپ پر ثابت تو ہو گیا ہوگا کہ زیادتی کس کی تھی ۔" حاضر " اس معاملے میں میرا منہ نہ کھلواؤ ؛ میں تم سے کیسی ہی سچی بات کیوں نہ کہوں پر تم یہی سمجھو گے کہ بہن کی طرف داری کرتا ہے ۔" مبتلا " میں نے آپ کے تدین کی تعریف اور کسی سے بھی نہیں چچا باوا سے سنی ہے ، میں آپ کی نسبت بے انصافی کا خیال کبھی کر ہی نہیں سکتا "۔ حاضر " دوسرا نکاح تو تم کر چکے ، اب اس کی نسبت یہ کہنا

۳۔ ہندؤں کے ہاں بیٹی یا بہن کی سسرال میں مہمان بن کر جانا باعث ننگ و عار سمجھا جاتا ہے ؛ ان کے اثر سے دیہات کے مسلمانوں میں بھی یہ دستور ہو گیا تھا مگر اب وہ بات نہیں رہی ۔

کہ تم نے جلدی کی یا بے جا کیا ، فضول ہے ، بلکہ ایک اعتبار سے تو میں کہتا ہوں کہ تم نے بجا کیا ، مناسب کیا ، خوب کیا اور ضرور کرنا چاہئے تھا ۔ تمہارا طرز زندگی دین کے ، شرافت کے ، بھلمنساہت کے ، عقل کے ، سب کے خلاف تھا ۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ تم نے اس سے توبہ کی ۔ خدا کرے کہ تمہاری یہ توبہ پہاڑ کی طرح مستحکم ہو ، بھاری بھر کم ہو ، مضبوط ہو ، اٹل ہو ؛ مگر مجھ کو اس بات کا اندیشہ ہے کہ ایک مگدر کو تم اٹھا نہ سکے جوڑی تم سے کیوں کر ہلائی جائے گی ۔ تمہاری وہی مثل ہے کہ تنور سے بچنے کے لیے بھاڑ میں گرے ۔ دو بیبیوں کا رکھنا جمع بین النقیضین ، کچھ آسان کام نہیں ۔ تم نے ایسی ہنڈیا پکائی ہے کہ یہ واقعہ جو پیش آیا اس کا پہلا ابال ہے ۔ جب کھرچن کی نوبت آئے گی تو اصلی مزہ معلوم ہوگا ۔ یقین جانو کہ میں کچھ بہن کی پاس داری سے نہیں کہتا ، بلکہ حقیقت نفس الامری بیان کرتا ہوں کہ تم نے غیرت کی قدر و وقعت کو مطلق نہیں پہچانا ۔ غیرت بیگم خدا نخواستہ (برا مت ماننا) تمہاری اس بی بی کی طرح گری پڑی بازاری عورت نہیں ۔ وہ ایسے جتھے اور ایسے گروہ اور ایسی برادری اور ایسے خاندان کی بیٹی ہے کہ جہاں اس کا پسینا گرے آج سید نگر میں کم سے کم دو سو آدمی ایسے نکلیں گے جو اپنا خون بہانے کو موجود ہو جائیں گے ۔ عورتوں کے معاملے ، عزت اور آبرو اور ناموس کے معاملے میں مال کی تو کیا حقیقت ہے ، عزت کے آگے شرفا ، خاص کر دیہات کے ، خاص کر سادات ، خاص کر سادات سید نگر ، جان کی ذرا بھی پروا نہیں کرتے ۔ یاد کرو کتنی منت ، کس قدر خوشامد ، کیسی آرزو سے ماموں اور مومانی (خدا دونوں کو جنت نصیب کرے)

غیرت بیگم کو بیاہ کر لائے ؛ آج کو وہ دونوں یا اُن میں سے ایک بھی زندہ ہوتے تو کیا تمہاری مجال تھی کہ تم غیرت بیگم پر سوکن لاؤ اور اُسی کی گود میں بٹھاؤ ۔ پھر بندۂ خدا! تم کو اتنا بھی خیال نہ آیا کہ ماں باپ اُس کے نہیں ، ساس سسرے اُس کے نہیں ؛ دنیا میں وارث کہو ، سرپرست کہو ، شوہر کہو ، ایک تم ، سو تم نے جلا جلا کر اُس کا یہ حال تو کر دیا کہ سید نگر کی نسبت ایک تہائی بھی باقی نہیں رہی اور اس پر بھی تم کو صبر نہ آیا ، سوکن کو لا بٹھایا ۔ عورت ہو تو جانو یا عقل ہو تو پہچانو کہ سوکن کا کیسا داغ ہوتا ہے ، بیوگی سے بڑھ کر ۔ میاں نکھٹو ہو ، اپاہج ہو یا بد مزاج ہو ، روٹی کھانے کو ، اولاد جی بہلانے کو نہ ہو ، سب مصیبتیں جھیلی جا سکتی ہیں اور نہیں جھیلی جا سکتی تو سوکن کی ؛ دنیا کے اور جلاپے جلاپے ہیں اور سوکن کا جلاپا سلگاپا ۔ جس شخص پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو ، وہ اگر افیون کھا لیتی یا کنوئیں میں گر پڑتی یا پیٹ میں چھری بھونک لیتی ، اُس سے کسی بات کا تعجب نہ تھا ، بلکہ تعجب یہ ہے کہ رونے پیٹنے پر قناعت کی ۔ اگر خدا نخواستہ اُس نے اپنے آپ کو ہلاک کر لیا ہوتا تو تمہارا کیا جاتا ، تم تو نئی بی بی کے ساتھ چین کرتے ، گل چھرے اُڑاتے ، ہم کو بہن کہاں پیدا تھی ۔'' مبتلا ''اگر آپ کہیں تو میں اس عورت کو چھوڑ دوں ۔'' حاضر ''میں تو چھوڑنے کو نہیں کہہ سکتا اور تم ایسے چھوڑنے والے ہوتے تو کرتے ہی کیوں؟ فرض کیا کہ تم نے اُس کو میرے کہنے سے چھوڑ دیا اور پھر وہی سابق کا وتیرہ اختیار کیا تو اپنے ساتھ دنیا اور دین دونوں جگہ میرا منہ بھی کالا کراؤ ۔'' مبتلا ''پھر آپ ہی کوئی راہ نکالئے ۔ مجھ سے ایک نادانی تو

ہوئی اور اپنی طبیعت کو بارہا آزما چکا ہوں میرے قابو کی نہیں ۔ آج آپ سے ایک وعدہ کروں اور کل کو جھوٹا ٹھہروں تو پھر آپ کے نزدیک میرا کیا اعتبار رہا ؛ اس سے بات کا صاف صاف کہہ دینا اچھا ، اور اگرچہ آپ سے اس معاملے میں صلاح پوچھنا داخل بے حیائی ہے ، مگر چچا باوا چلتے چلتے فرما گیے ہیں کہ اگر کوئی مشکل آ پڑے تو آپ کی رائے پر عمل کرنا اور یوں بھی آپ بڑے بھائی ہیں ، باپ کی جگہ آپ ہی اگر آڑی پر آڑے نہ آئیں گے تو میں کس کے پاس التجا لے جاؤں ؟ بندے کے سو قصور خدا معاف کرتا ہے ، آپ از برائے خدا میرا ایک قصور معاف کیجئے ۔'' حاضر '' بات یہ ہے کہ میں تمھاری اس نئی بی بی کے حالات سے بخوبی واقف نہیں ، میں کچھ کہہ نہیں سکتا کہ کس طرح اس کے ساتھ مدارات کرنی مناسب ہے ۔'' مبتلا '' اس کم بخت کے اور حالات ہی کیا ہیں ، بازاری عورت ہے ، تن تنہا ۔ مدت سے توبہ توبہ پکار رہی تھی ، میری جو شامت آئی اس کے ساتھ عقد شرعی کر لیا ، کیونکہ چچا باوا کے سامنے آوارگی سے میں توبہ کر چکا تھا ۔ حماقت پر حماقت یہ ہوئی ، اور اب میں اس گھڑی کو بہت پچتاتا ہوں ، کہ گھر میں لا کر اوپر کا کام کاج سپرد کیا ۔ دوسری ماماؤں کی طرح رہنے سہنے لگی ۔ اگر میں نے اس کے ساتھ کسی طرح کا سرو کار رکھا ہو تو مجھ پر خدا ہی کی مار پڑے ۔ یہ تو اس کی پچھلی کیفیت ہے ؛ آئندہ کے لیے بھی اگر آپ کی مرضی ہو تو وہی ماماؤں کی طرح رہے گی اور بد ستور گھر کی خدمت کرے گی ۔'' حاضر '' اس کا غیرت بیگم کے پیش نظر رہنا تو میں پسند نہیں کرتا ، کیونکہ اس صورت میں فساد عاجل کا بڑا اندیشہ ہے ۔ دو سوکنوں کی

مثال تمھیں کس طرح بتاؤں ؟ یوں سمجھو کہ دو گلاس[۴] ھیں ۔ ایک میں سوڈا ھے پانی میں حل کیا ھوا اور دوسرے میں ایسڈ ؛ ناممکن ھے کہ سوڈا اور ایسڈ ملیں اور اُن میں جوش و خروش پیدا نہ ھو ۔ پس دونوں کو ایک جگہ رکھنے کا تو تم کبھی بھول کر بھی ارادہ نہ کرنا ، ورنہ آج دوھتڑ تھے تو کل جوتیاں ھوں گی اور پرسوں چھریاں ۔ اس کو تو کسی دوسرے شہر میں یا خیر دوسرے محلے میں یا خیر دوسرے گھر میں تو رکھنا ضرور ھے ، مگر مشکل یہ ھے کہ تم کہتے ھو کہ وہ اکیلی ھے تن تنہا ۔ آدمی زیادہ رکھے جائیں تو تمھاری چادر میں[۵] اتنے پاؤں پھیلانے کی گنجائش نہیں ۔ پس صرف یہی ایک تدبیر ھے کہ زنانے مکان میں پورپ کی طرف جو ایک کھانچا سا نکل گیا ھے ، پردے کی دیوار کھچوا لو اور ڈیوڑھی میں سے دروازہ پھوڑ کر اتنا گھر الگ کر لو اور حقیقت میں یہ تھا بھی دوسرا گھر ؛ ماموں باوا نے مول لے کر باھر گلی کا دروازہ تیغہ کرا کے زنانے مکان میں ملا لیا تھا ۔ تیغے کا نشان اب تک موجود ھے ۔ اتنا مکان ایک مختصر خانہ داری کے لیے بخوبی کافی ھے ، ضرورت کی سب چیزیں موجود ھیں ۔ دالان در دالان : آگے سائبان ، دونوں طرف بڑی بڑی دو دو کوٹھریاں ، باورچی خانہ ۔ اس کے بغل میں چیز بست رکھنے کو لمبی کو لکی ، سامنے کے ضلع میں سہ درہ ، بس اور چاھئے کیا ۔ بڑے گھر کی طرف خدا کے فضل سے آدمی زیادہ ھیں اور خرچ بھی بہت ھے ۔ برابری اگر چاھو تو

---

۴ ۔ سید حاضر کی زبان سے یہ تشبیہہ بعید از قیاس ھے ۔ آج سے ایک صدی قبل سائنسی معلومات اتنی عام نہ تھی کہ گاؤں کا ایک معمولی خواندہ آدمی بھی ان مسائل سے آگاہ ھوتا ۔

۵ ۔ یعنی تم کو اتنا مقدور نہیں* ۔

نوں گھروں میں ممکن نہیں اور ضرور بھی نہیں اور مناسب بھی
ں - چھوٹے ماموں باوا پینسٹھ روپے کی تنخواھیں اور کرایہ
ارے نام کرا گئے ھیں اور ساٹھ کی غیرت بیگم کے نام - سو اپنے
سٹھ میں تیس چھوٹی بی بی کو دیا کرو - اکیلا دم ھے فراغت
بسر کر سکتی ھے - پینتیس تم کو بچیں گے ، اس میں تمھارا
ڑا ھے اور باھر مردانے کا خرچ - غیرت بیگم کے ساٹھ
ھاتھ مت لگاؤ - ایک دن بڑے گھر میں رھو ، ایک دن
وٹے گھر میں - نہ ھڑھڑ نہ کھڑکھڑ ، اللہ اللہ خیر صلاح -''
لا تو اپنی جگہ یہ ڈر رھا تھا کہ نہیں معلوم شہر سے
وائیں گے یا قید ڈلوائیں گے یا گھر بار ضبط کرائیں گے -
حاضر کا فیصلہ سننے کے ساتھ اس کے پیروں پر گر پڑا کہ
س اس میں اگر میری طرف سے کبھی سرمو فرق ھو تو
ئے گا کہ میری اصالت میں فرق ھے -'' ھریالی بھی اپنی جگہ
خوش ھوئی اور سمجھی کہ '' اب میرا بی بی ھونا سب
وں نے جانا - گھر بنٹوا پایا - میاں کے پینتیس بھی میرے
ھی ھیں ، وہ ملا کر تنخواھوں میں ، کرائے میں بڑا آدھا
ی طرف رھا - کہاں غیرت بیگم سیدانی ، اشراف ، میاں کی
پھی زاد بہن ، صاحب اولاد ، آٹھ نو برس کی بیاھی ھوئی اور
اں میں! انصاف کی رو سے تو میں ان کی جوتی کی برابری نہیں
سکتی ؛ قربان جاؤں خدا کے کہ اس نے مجھ گنہگار ناچیز
نوبہ کو ایسا نوازا کہ ان ھی کے سگے بھائی کے ھاتھ سے
کو جتوایا -'' غیرت بیگم کو تو سوکن کے نام کی جلن
، اس کو مکان سے تنخواہ سے کچھ بحث ھی نہ تھی -
الی کو کیسے ھی برے احوال سے رکھتے ، مگر جب تک
ت بیگم یہ جانتی تھی کہ یہ میری سوکن ھے کسی طرح

وہ راضی ہو ہی نہیں سکتی تھی ، لیکن بڑے بھائی نے جب ایک فیصلہ کر دیا تو کیا کرتی ، دل میں پیچ و تاب کھا کر چپکی ہو رہی ۔ مبتلا کے ساتھ بولنا بات کرنا پہلے ہی سے کم تھا ، اب بالکل چھوڑ دیا ، غرض صحن میں پردے کی دیوار اٹھائی گئی ، ڈیوڑھی میں دروازہ لگا ، ہریالی نے الگ گھر کر کے رہنا شروع کیا ۔

بائیسویں فصل

دو سوکنوں کی لڑائی کا سلسلہ اور اس کا اثر بد مبتلا پر، مبتلا کی اولاد پر، اُس کی بیبیوں اور انتظام خانہ‌داری پر

آدمی الگ گھر کرتا ہے تو پلنگ پیڑھی، تخت چوکی، چولھا چکی برتن بھانڈا سبھی چیزیں اُس کو درکار ہوتی ہیں۔ غیرت بیگم کے یہاں اسباب کے اٹم لگے ہوئے تھے، مگر کس کی مجال تھی کہ تنکا تو اُٹھا کر ادھر سے اُدھر لے جائے۔ ہریالی کو ابتدا میں سخت تکلیف ہوئی، مگر سلیقہ بھی عجب چیز ہے؛ دو ہی برس میں ہریالی نے رفتہ رفتہ اپنا گھر ایسا درست کر لیا کہ غیرت بیگم کے کئی پشتوں کے جمے ہوئے گھر میں ایک چیز وقت پر نہیں بھی ملتی تھی، مگر ہریالی کے یہاں، آتا تو کون تھا، لیکن اگر دس مہمان بھی آ جاتے تو آسایش کا ہمہ سامان موجود پاتے۔ ایک مرتبہ پرانا سرکہ درکار تھا، تعجب کی بات ہے کہ سارے محلے میں کسی کے یہاں سے نہ نکلا؛ ہریالی نے (جس کی طرف کسی کا ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا تھا) سنتے کے ساتھ ہی پیالہ بھر کر بھجوا دیا۔ جس طرح سید حاضر نے ٹھہرا دیا تھا، مبتلا ایک ایک دن باری باری سے دونوں گھروں میں

رهتا تها - بڑے گهر میں تو اُس سے کوئی بولتا چالتا نه تها - کسی دن اگر معصوم کو پکڑ پایا تو گهڑی دو گهڑی اس کے ساتھ جی بہلایا ورنه منه لپیٹا سو رها - خاطرداری سمجهو ، مدارات سمجهو ، آؤ بهگت سمجهو ، جو کچھ تهی سو چهوٹے گهر میں تهی ؛ مگر غیرت بیگم اُس کو وهاں بهی چین سے نہیں رهنے دیتی تهی - وه اپنے گهر میں تو مبتلا سے ایسی بے رخی کرتی که گویا اُس کو میاں کی ذرا بهی پروا نہیں اور چهوٹے گهر کی باری آئی اور صبح سے اُس نے مبتلا کی نگرانی شروع کی - مردانے میں کتنی دیر بیٹهے ، گهر میں کس وقت آئے ، کہاں سوئے ، کیا کهایا اور کتنا کهایا ، هریالی کے ساتھ کیا باتیں کیں - گهر کے نوکروں پر ایک نیا کام یه اور پڑا که سارے سارے دن اور پهر پهر رات گئے تک ایک ڈیوڑهی میں کهڑی جهانک رهی هے ، تو ایک دروازے میں کان لگائے سن رهی هے اور ایک هے که جس طرح جلاها تانا بانا تنتا پهرتا هے ، اوپر تلے بیسیوں پهیرے زنانے سے مردانے میں اور مردانے سے زنانے میں - باوجودے که غیرت بیگم نے ایک مبتلا کے پیچهے اتنے جاسوس لگا رکهے تهے اس پر بهی اُس کا جی نہیں مانتا تها - ایک سوکها تو اُس نے پاخانے کی دیوار میں کیا که چهوٹے گهر کے سه درے کی ذرا ذرا بات وهاں سے سنائی دیتی تهی - رہ گیا ایک ضلع صحن سایه بان اور سایه بان کے اندر کا دالان سو غیرت بیگم کی طرف ایک بالا خانه تها اور اُس میں تهی ایک کهڑکی ، کهول دوتو صحن سے لے کر اندر والے دالان تک سب کچھ دکهائی دیتا - یا تو غیرت بیگم نے جس دن سے بیاهی آئی کبهی بالا خانے پر پاؤں نہیں رکها تها ، یا اب سوکن کی ضد پر جس دن چهوٹے گهر کی باری هوتی صبح سویرے سے کوٹهے پر چڑهی چڑهی اگلی صبح کو اُترتی - غرض ساری

کرمی غیرت بیگم نے میاں کو ہریالی سے بات نہیں کرنے دی ۔ جاڑا آیا اور پردے چھوڑ کر دالان میں سونے لگے تب تھک کر بیٹھی ۔ شروع شروع میں تو نوکروں کو آنے جانے کی ایسی سخت ممانعت تھی کہ ایک مرتبہ ایک لونڈی نے باہر ڈیوڑھی میں سے آگ پکڑا دی تھی ، غیرت بیگم کو خبر ہوئی تو اس کے ہاتھ پر جلتا ہوا انگارا رکھ دیا ، لیکن پھر سوچی کہ نوکروں سے خبریں ملتی ہیں ان کا روکنا ٹھیک نہیں ؛ بندی کھول دی ، مگر اس سے خرابی کیا پیدا ہوئی کہ ماما ، لونڈی جو کوئی چھوٹے گھر سے ہو کر آتی ، غیرت بیگم اس سے حال پوچھتی ، اگر وہ اس کی خواہش کے مطابق کچھ بیان نہ کرتی تو اس پر خفا ہوتی کہ تو جھوٹی ہے یا چھپاتی ہے یا تو ادھر ملی ہوئی ہے ۔ ناچار اس کی بدگمانیوں سے بچنے کے لیے نوکروں نے جی سے باتیں بنانی شروع کیں ۔ حقیقت میں تو وہ باتیں ہوتی نہیں بے اصل ، مگر اس کو ایک ایک بات کا ہفتوں جھکڑ لگا رہتا تھا ۔ آپ رنجیدہ رہتی اور مبتلا پر اپنی بدنفسی اور حماقت ثابت کرتی ۔ ایک آتی اور دل سے جوڑ کر کہتی ، ''بیوی آج تو تمہاری سوکن کے عجب ٹھاٹھ ہیں ، ایسی بن سنور کر بیٹھی ہیں جیسے کوئی نئی دلہن ، سر میں چنبیلی کا تیل پڑا ہوا ہے ، مگر کوئی چار روپے سیر کا ۔ سارا گھر پڑا مہک رہا ہے ۔ چوٹی گندھی ہے ، یہ بڑے بڑے موتیا کے پھولوں کا سارا گہنا ، البتہ ڈیڑھ دو روپے سے کیا کم کا ہوگا ؛ ملا گیری چنا ہوا مہین رینگ کا دوپٹا ، اچھا خاصا چار انگل کا چوڑا سنہری ٹھپا ٹنکا ہوا ؛ سفید ترپن بیل کا پاجامہ ، پائنچوں میں بیل دار کنارہ ، کنارے پر کیکری ، کیکری پر بانکڑی کی پیمک'' غیرت بیگم یہ سن کر ایک ٹھنڈا سانس بھر کر کہتی ''ہاں صاحب ، جن کے بھاگ ان کے سہاگ ۔'' دوسری

یہ بات بناتی کہ ''وہ آپ تو صحن میں کرسی بچھائے بیٹھی ہیں ، میاں سامنے کھڑے گنا چھیل رہے ہیں ۔ گنڈیریاں بنا بنا کر آپ بھی کھاتے جاتے ہیں اور اپنے ہاتھ سے ان کے منہ میں بھی دیتے جاتے ہیں ۔ میں تو یہ دیکھ کر الٹے پاؤں پلٹ آئی ۔ ماما باہر بیٹھی کھانا پکا رہی ہے ۔'' غیرت بیگم ''لعنت خدا کی ! پھٹے منہ ، حیا اور شرم تو مطلق چھو نہیں گئی ۔'' تیسری اشارے سے بیوی کو بلاتی کہ ''ذرا آپ بھی تو موکھے میں سے دیکھئے آج میاں کا جی کیسا ہے ، دولائی اوڑھے پڑے ہیں اور کنچنی پاس بیٹھی پاؤں دبا رہی ہے ۔'' غیرت بیگم ''اری کم بخت تجھ کو دھوکا ہوا ہوگا : کنچنی لپٹی ہوگی اور میاں پاؤں دبا رہے ہوں گے ۔'' اس طرح کی سیکڑوں باتیں صبح سے شام تک اپنے ہی گھر کے نوکر غیرت بیگم سے آ آ کر کہتے تھے اور سب میں زیادہ منہ لگی وہ تھی جو اس طرح کی باتیں خود تصنیف کر سکتی تھی ۔ اتنی تو کسی کی مجال نہ تھی کہ غیرت بیگم کے منہ پر ہریالی کو ہریالی کہہ دے اور اگر کسی کی زبان سے بھولے سے بھی چھوٹی بیوی نکل جاتا تو بے شک غیرت بیگم تڑ سے اس کے منہ پر جوتی کھینچ مارتی ۔ نام سے تو اتنی نفرت اور پھر رات دن اسی کی تسبیح ۔ آخر سوچ کر غیرت بیگم نے سوکن کو بے غیرت کا خطاب دیا اور جتنے لوگ غیرت بیگم کے طرف دار تھے ، یہاں تک کہ ادنیٰ ادنیٰ نوکر اس کی حمایت پا کر سب نے تامل ہریالی کو پکار پکار کر بے غیرت کہتے تھے اور دیوار کے پیچھے ہریالی اپنے کانوں سے سنتی تھی ، بلکہ اس نے سیکڑوں بار مبتلا کو سنوا سنوا دیا ۔ مبتلا کو نوکروں کے منہ سے یہ لفظ سن کر سخت رنج ہوتا تھا ، کیونکہ ہریالی جو کچھ

تھی سو تھی ، مگر راجا کے گھر آئی اور رانی کہلائی ، اب تو اس کی منکوحہ تھی ۔ نوکروں کو اور گھر کی لونڈیوں کو کیا زیبا تھا کہ اس کی منکوحہ کو یوں منہ بھر بھر کر گالیاں دیں ، مگر وہ کیا کر سکتا تھا ؟ ہریالی کو سمجھا دیتا کہ ''کچھ تم سے پرخاش نہیں ، مجھ کو نوکروں کے ہاتھ سے ذلیل کرانا منظور ہے ۔ خدا کی شان میرے نوکر میرے لونڈی غلام اور ایسے گستاخ ! اتنے بے ادب ! کیا کروں کچھ کرتے بن نہیں پڑتا ، میں صبر کرتا ہوں تم بھی صبر کرو ۔'' غیرت بیگم کو سوکن کی طرف سے ہر طرح کی بد گمانی تو تھی ہی ؛ بتول کو تو اس طرف کوئی لے جانے نہیں پاتا تھا ، مگر معصوم اپنے پاؤں دوڑا دوڑا پھرتا تھا ، اس کو کون روکے ؟ غیرت بیگم بہتیرا ڈراتی ، دھمکاتی ، گھرکتی مگر یہ کس کی سنتا تھا آنکھ بچی اور چھوٹے گھر میں ۔ غیرت بیگم سے اور مبتلا سے تو روز بروز عداوت بڑھتی چلتی جاتی تھی ۔ مبتلا کے جلانے اور چھیڑنے اور ایذا دینے کو جہاں غیرت بیگم اور بہتیری باتیں کرتی تھی ، ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ بچوں کے ساتھ اس کی اگلی سی مدارات باقی نہیں رہی تھی ، اب تو وہ بات بات پر معصوم کو مار بیٹھتی اور کو سنا تو تکیۂ کلام ہوگیا تھا ۔ بچوں کا تو قاعدہ ہے کہ وحشی جانوروں کی طرح ہلانے اور پر چانے سے رام ہوتے ہیں ۔ معصوم کا یہ حال ہوگیا تھا کہ غیرت بیگم کی شکل سے دور بھاگتا اور اس کی پرچھائیں سے ڈرتا ۔ چھوٹے گھر میں اس کی ایسی خاطرداری ہوتی تھی کہ اس نے اندر پاؤں رکھا اور ہریالی نے دوڑ کر اس کو گود میں لیا ، ہاتھ منہ دھلایا ، بالوں میں تیل ڈالا ، کنگھی کی ، آنکھوں میں سرمہ لگایا ۔ میوہ مٹھائی اس کے لیے لگا رکھتی تھی ، جو کچھ موجود ہوا

کھلایا ۔ گھنڈی تکمہ اگر ٹوٹ گیا ہے ٹانک دیا ، کبھی کبھار کوئی کھلونا منگوادیا ۔ آپ پان کھاتی ہوئی تو اُس کو بھی ٹکڑا بنادیا ۔ آئینہ ہاتھ میں دے دیا کہ دیکھو تو کیا منہ لال لال ہوا ہے ۔ پس معصوم سارے سارے دن چھوٹے گھر میں کھیلتا اور اگر بڑے گھر میں بلاتے تو روتا اور مچلتا۔ ایک دن غیرت بیگم معصوم کا انگرکھا قطع کررہی تھیں کہ لونڈی سے کہا کہ ''جا ذرا معصوم کو جلد بلا لا ، میں انگرکھا اُس کے قد سے ناپ لوں ، ایسا نہ ہو جائے اونچا ہوجائے''۔ لونڈی نے چھوٹے گھر میں جا کر معصوم سے کہا ''چلو میاں ! بی بی بلاتی ہیں''۔ لونڈی کی صورت دیکھ کر اور طلبی سن کر معصوم زمین میں لوٹ گیا ۔ بہتیرا لونڈی گود میں اٹھاتی ہے ، نکل نکل پڑتا ہے اس کشتم کشتا میں تھوڑی دیر لگ گئی اور وہاں غیرت بیگم ہاتھ میں کپڑا لیے انتظار کر رہی ہیں ؛ آخر دوسری کو دوڑایا کہ ''بسنتی معصوم کو بلانے گئی تھی وہیں مر کر رہ گئی ۔ بس آپ بھی اس کے ساتھ کھیل میں لگ گئی ہوگی ۔ جا دونوں کو پکڑ کے تو لا''۔ غیرت بیگم جو بگڑ اور خفا ہوکر زور سے بولی تو اپنے گھر میں ہریالی نے بھی سنا اور اُس نے جلدی سے اُٹھ کر معصوم سے کہا ''آہا ! بڑی اماں کے یہاں کیسے کیسے بہار کے کپڑے ہیں ! جلدی بھاگ کر جاؤ تمہاری بھی اچکن بیونتی جائے ۔ وہ بڑی اماں بیٹھی کہہ رہی ہیں ''آنکھیں میچیں کون آئے ، آنکھیں میچیں کون آئے !'' معصوم سامنے گیا تو غیرت بیگم بولی ، ''موئے جان مار ! یوں ہی سارے دن خدائی خوار خاک چھانتا پڑا پھر ، دیکھ اب تجھ کو کیسے ظالم استاد کے پاس پڑھنے بٹھاتی ہوں کہ تو بھی یاد کرے !'' معصوم ''میں اپنی چھوٹی اماں کے پاس بھاگ جاؤں گا''

غیرت بیگم ''لانا دسپنے[1] میں ایک بڑا سا انگارا کہ اس کم بخت ناشدنی کا منہ جلاؤں ، نگوڑا بدوں کا بد ،گندی بوٹی کا بساندا شوربا ! آخر اپنی اصالت پر گیا ، کنچنی کو میا بنایا[2] ؛ میرے سامنے اگر پھر اس مردار کو اماں کہا ہوگا تو جبو پکڑ کر کاٹ ڈالوں گی ۔'' معصوم یہ سن کر آدھی دور سے پھر الٹا بھاگ گیا ، بسنتی پیچھے دوڑی بھی مگر اب وہ کس کے ہاتھ آتا تھا ۔ ڈیوڑھی میں کھڑا ہوا غیرت بیگم کے چڑانے[3] کو پکار پکار کر ''چھوٹی اماں ، چھوٹی اماں'' کہتا تھا اور جہاں غیرت بیگم نے دیکھا تو آڑ میں ہوگیا اور پھر ذرا سی دیر میں سامنے آکر '' چھوٹی اماں ، چھوٹی اماں'' کہنے لگا ۔ غیرت بیگم نے دالان میں سے بیٹھے بیٹھے جوتی کھینچ کر ماری ، مگر وہ ڈیوڑھی تک کیا پہنچتی ۔ غرض معصوم کو جو دھت لگی تو غیرت بیگم کو اسی طرح گھڑی بھر تک دق کرتا رہا اور پھر چھوٹے گھر میں جا گھسا ۔ غیرت بیگم ہریالی کی ساری باتوں کو برائی پر ڈھال لے جاتی تھی ۔ معصوم کے ساتھ جو ہریالی عام ماؤں سے اور خصوصاً غیرت بیگم سے بڑھ کر محبت کرتی تھی تو میاں کی خوشامد پر محمول کرنا شاید چنداں بے جا نہ تھا ۔ مگر ہریالی کی مخالفت میں غیرت بیگم کے خیالات ایسے بڑھے ہوئے تھے کہ اس کا بھی وہ دوسرا ہی مطلب لگاتی تھی ۔ اس کا مقولہ یہ تھا ''دیکھا نامراد کٹنی کو ! کیسی معصوم کی للو پتوں میں لگی رہتی ہے اور مجھ کو یقین ہے کہ وہ ضرور اس کو مجھ سے تڑا کر رہے گی ۔ ابھی سے اس کو میری صورت

۱- دست پناہ (چمٹا) بول چال میں بگڑ کر دسپنا ہو گیا ۔
۲- ماں کی تصغیر 'میا' اور جیب (یا جیبھ بمعنی زبان) کی تصغیر جبو ۔
۳- ایک ننھے بچے کی ضد اور شرارت کی یہ عکاسی قابل توجہ ہے ۔

سے بیزار کردیا ہے ، نہیں تو اتنے بچے ماؤں سے ایک لمحے کے لیے پرے نہیں ہٹتے اور معصوم کو تو اگر میں نہ بلاؤں کبھی بھول کر بھی ادھر کا رخ نہ کرے ۔'' غیرت بیگم کو تو الٹے سیدھے ہر طرح ہریالی کو الاھنا دینا منظور تھا ۔ معصوم اگر کبھی بیمار ہوتا اور چھوٹے بچے اکثر بیمار ہوتے ہی رہتے ہیں تو مصیبت یہ تھی کہ میاں کی ضد کے مارے دوا علاج کچھ نہ کرتی اور جو کوئی کہتا تو بگڑ کر جواب دیتی کہ ''کوئی دکھ ہو تو علاج کروں ، اس کو تو دشمنوں نے کچھ کردیا ہے اور دشمن کون یہی بغلی گھونسا ۔ یہ کیا ہم میں سے کسی کو جیتا چھوڑے گی ، لیکن اگر میرے بچے کا بال بیکا ہوا تو کوٹھری میں کیا مار ماری تھی ؛ اگر جان سے نہ مارڈالوں تو سید کی جنی نہیں ! اور پھر اس کے حمائتیوں کو دیکھ لوں گی ۔'' ہریالی عجب پس وپیش میں تھی ، اگر معصوم کو نہیں آنے دیتی تو کہیں ، ''خود جو بے اولادی ہے ، جلتی ہے ۔ دیکھ نہیں سکتی ، اور آنے دیتی ہوں تو اس کی ذمہ‌داری کون کرے کہ بچہ بیمار نہ پڑے یا بیمار پڑے تو ضرور اچھا ہوجایا کرے ۔ پس ذرا بھی معصوم کا جی ماندہ ہوتا تو ہریالی کا کئی چلو لہو خشک ہوجاتا کہ خداخیر کرے ۔ انتظام خانہ‌داری کی یہ صورت ہوئی کہ آخر اس کو بھی صاحب خانہ کی توجہ درکار ہے ۔ یہاں آپس کی کہا سنی ، تاک جھانک ، لڑائی جھگڑے ، قصے قضیے سے اتنی فرصت ہی کس کو تھی کہ انتظام کی طرف متوجہ ہوتا اور فرصت تھی بھی تو دلوں میں شوق نہیں ، رغبت نہیں ، اطمینان نہیں ، امنگ نہیں ، کس کی بلا کو غرض پڑی تھی کہ یہ درد سر مول لے ؟ خانہ داری میں سب سے بڑا انتظام کھانے کا کہ صبح بھی ہو اور

شام بھی ہو - سو کھانے کا یہ حال کہ ڑے گھر میں تو مبتلا نے کبھی پیٹ بھر کھانا کھایا ھی نہیں - میاں بی بی میں نا خوشی تو سدا کی تھی ، تاھم کھانا دونوں ایک ھی دسترخوان پر کھایا کرتے تھے - جس دن سے ھریالی نے الگ گھر کیا ، غیرت بیگم نے میاں کے ساتھ بات چیت کرنی کیا چھوڑی ، بات چیت کے ساتھ کھانا اور کھانے کے ساتھ دیکھنا بھالنا نکالنا سب کچھ چھوڑدیا - دو چار بار مبتلا نے منہ پھوڑ کر کہا بھی ، جواب ندارد - پس کھانا تیار ھوتا تو گھر کے نوکروں میں سے کسی نے میاں کا حصہ نکال کر لا آگے رکھ دیا - اس بے وقری کے ساتھ جو کھانا دیا جاتا تھا تو مبتلا کو اس قدر طیش آتا تھا کہ اگر اس کا بس چلے تو غیرت بیگم کو کچی اٹھا کر کھا جائے ، مگر وہ اپنا خون جگر پی کر چپ ھورھتا تھا - ڈر کے مارے ذرا کی ذرا منہ جھٹلایا اور کھڑا ھوگیا - غیرت بیگم خود تو کبھی خبر نہیں لیتی تھی ، اگر کبھی کوئی نوکر خدا کے واسطے کو کہہ بیٹھا کہ میاں تو پوری ایک چپاتی بھی نہیں کھاتے تو بولتی ''اس مال زادی کے بدون میاں کے حلق سے نوالہ کیوں اترنے لگا اور ان کو گھر کا کھانا کیوں بھانے لگا ؟ ''غیرت بیگم جلے تن کا مبتلا سے بد تر حال تھا - وہ آپ ھی اپنے دل سے باتیں پیدا کرتی اور آپ ھی آن کی آدھیڑ بن میں دو دو وقت کھانا نہ کھاتی - نوکروں نے جو دیکھا گھر والے دو ، میاں اور بیوی اور دونوں کو کھانے کی طرف مطلق رغبت نہیں ، یہ لوگ بھی سستی اور بے پروائی اور چوری اور طرح طرح کی خرابیاں کرنے لگے - نتیجہ یہ ھوا کہ خرچ تو ڈیوڑھا اور دونا بڑھ گیا اور برکت آدھی اور پاؤ بھی باقی نہ رھی -

غیرت بیگم کی طرف تو بہت سویرے سے خاک اڑنے لگی۔ چھوٹا گھر خیر یوں ہی لشٹم پشٹم چلا جاتا تھا۔ گھر کی عزت ہوتی ہے مردانے سے اور مردانے کی رونق مردوں سے، مردوں کے شوق کے اہتمام سے۔ مبتلا، جس کا کبھی یہ حال تھا کہ ایک دن بالوں میں تیل نہ پڑتا تو اُس کا سر درد کرنے لگتا۔ دن میں اگر چار مرتبہ گھر سے باہر نکلتا تو چار طرح کی پوشاک پہن کر۔ ایک چیز اگر جگہ سے بے جگہ رکھی ہوتی تو بے چین ہوجاتا۔ فرش پر سلوٹ پڑی دیکھی اور تیوری پر بل پڑا۔ آندھی ہو مینہ ہو سردی ہو گرمی ہو، چار گھڑی دن رہے گھوڑے کی سواری کبھی ناغہ ہونے ہی نہیں دی۔ ہر چیز صاف ستھری، قیمتی، انوکھی؛ یا اب خانہ داری کے جھگڑوں نے اس کو اس قدر عاجز اور ناچار کر دیا تھا کہ اس کو اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہ تھا۔ بال الجھ کر نمدہ ہو گئے ہیں کس کو دماغ ہے کہ کنگھی کرے۔ معلوم ہے کہ کپڑے میلے چکٹ ہو رہے ہیں، مگر بدلتے ہوئے آلکسی آتی ہے، چیز بے ٹھکانے پڑی ہے زبان کون ہلائے کہ اس کو موقع سے رکھو۔ سفید چاندنی دھبے پڑ پڑ کر جا جم بن گئی ہے، نوکروں کو توفیق نہیں کہ بدلیں، میاں کو خیال نہیں کہ بدلوائیں؛ گھوڑا نسل ولایتی[۴]، جس پر مکھی پھسلتی تھی، پٹھوں پر نالی پڑی

۴- ولایتی سے مراد کابلی ہے۔ پہلے کابل کے علاقے کو ولایت کہتے تھے، بعد میں یہ لفظ انگلستان کے لیے مخصوص ہوگیا۔ مکھی پھسلتی تھی، یعنی فربہی کی وجہ سے بدن کی کھال اتنی چکنی تھی کہ مکھی بیٹھے تو پھسل جائے۔ پانچوں عیب سے انسان کے ''پنج عیب شرعی'' مراد نہیں، بلکہ گھوڑے کے پانچ عیب جو شہسواروں کی اصطلاح میں یہ ہیں: مٹھا، موتیا، رس، بیل، پرساتی۔ بادی نے آدبایا، یعنی ریاح کا مرض ہوگیا۔ پرتل کا ٹٹو یعنی لدو گھوڑا۔

ہوئی ؛ سواری جو ہوئی موقوف ، تھان پر بندھے بندھے پانچوں عیب نکال لایا ۔ بادی نے آ دبایا ۔ مالش میں ہوئی کمی اور دانے میں ہوئی چوری ، تھوڑے دن میں پرتل کا ٹٹو معلوم ہونے لگا ۔ سیکڑوں روپے کا اسباب صرف غور اور پرداخت کے نہ ہونے سے کوڑے کی طرح بے قیمت ہو گیا ۔ غرض لوگ جو کہاوت کہتے ہیں کہ دو ملا میں مرغی حرام ، دو بیبیوں کی کش مکش میں گھر کی مٹی ایسی پلید ہوئی کہ باہر سے لے کر اندر تک نکبت اور مفلسی اور بے رونقی چھا گئی ۔ ایک مدت تک غیرت بیگم کی طرف سے انواع و اقسام کے ظلم ہریالی پر ہوتے رہے اور بدلہ لینا کیسا اس کی اتنی بھی مجال نہ تھی کہ آف کرے ۔ نام لے کر کر ، پکار پکار کر ، سنا سنا کر گالیوں کی بوچھار برسا رکھی ہے اور کوسنوں کا تار باندھ دیا ہے اور دم بخود ، مگر کتنا صبر ، کہاں تک برداشت ! آخر اس کا منہ کھلا تو ایسا کھلا کہ لوگوں نے اپنے اپنے کان بند کر لیے ۔ برکت ، رونق فراغت عافیت ، محبت ، مروت سب کچھ غارت ہو ہوا کر ایک آبرو ، وہ بھی محلے والوں کی نظروں میں باقی رہی تھی ، ہر وقت کی تھکا فضیحت میں وہ بھی گئی گزری ہوئی ۔ کم بختیں اس بہودگی کے ساتھ آپس میں لڑتی تھیں کہ کنجڑنوں[۵] قصابنوں کو مات کر دیا تھا ، اور دھوبنوں بھٹیاریوں کو شرمندہ ۔ غیرت بیگم تو کسی کے قابو کی تھی نہیں ، مگر ہاں ہریالی کو اگر مبتلا منع کر دیتا تو وہ بے شک باز آ جاتی ؛ پر غیرت بیگم کی طرف سے مبتلا کو ایسے ایسے رنج پہنچے تھے کہ روکنا کیسا وہ

۵- اس طبقے کی عورتیں زبان دراز اور گالی گلوچ میں بے باک ہوتی ہیں، خصوصاً کنجڑنوں اور بھٹیارنوں کی معرکہ آرائی تو ضرب المثل بن گئی ہے ۔

تو کبھی کبھی ہریالی کو اور اشتعالک دے دے کر اس کی آڑ میں اپنے دل کے جلے پھپولے پھوڑ لیتا تھا ۔ ان لوگوں میں جو باھمی رنجشیں اور عداوتیں تھیں پہلے چند روز تک دلوں میں رھیں ، بڑھتے بڑھتے دلوں سے منہ تک آئیں ، اب اور زیادہ ہوئیں تو پھوٹ کر ایسی بہیں جیسے کوہ آتش فشاں کا ملغوبہ ، آگے آگے آپ اور پیچھے پیچھے تباھی اور بربادی ۔

تینتیسویں فصل

ہریالی کا اُمید سے ہونا - غیرت بیگم کا اس بات کو جاننا اور اپنی ماما خاتون سے اس کو سنکھیا دلوانا - مقدمے کا کوتوالی میں دائر ہونا اور آخر ناظر کی تدبیر سے دب دبا جانا ، مگر مبتلا کا دیوالہ نکال کر

اتفاق سے ہریالی پڑی بیمار - شاموں شام سر دھویا ، سردی دھائی ، زکام ہوا ، بخار آنے لگا - چند روز کچھ دھیان نہ کیا ، بخار تھا کہ چمچڑ ہو گیا ، بلکہ ذرا ذرا کھانسی کی بھی دھسک شروع ہوگئی - معمولی طور پر حکیموں کے علاج کیے - منضج ہوئے ، مسہل ہوئے ، بخار ہے کہ جنبش نہیں کھاتا - کھانسی کو اتنا آرام ہوا سمجھو کہ سوکھی سے تر ہو گئی - ایک دن بلغم میں کچھ سرخی کی جھلک دکھائی دی تو تردد ہوا اور تردد کی بات ہی تھی - خیال کیا کہ پان کی سرخی ہو گی ، مگر پھر ثابت ہوا کہ نہیں خون کی ہے - تب تو مبتلا بہت گھبرایا - غیرت بیگم کے ہاتھوں سے تو اس کو ایسی ایسی ایذائیں پہنچی نہیں کہ اس کے نام سے اس کا دل بے زار تھا - اس کو تھوڑی

یا بہت جو کچھ دل بستگی تھی ہریالی کے ساتھ تھی ۔ اب جو اس کو خون تھوکتے دیکھا قریب تھا کہ سودائی ہو جائے ۔ شبہ تو تھا بہت دنوں سے کہ ایسا نہ ہو کہیں غیرت بیگم نے کچھ کر کرا دیا[1] ہو ۔ کھانسی کے ساتھ خون کا آنا تھا کہ یقین کیسا حق الیقین ہو گیا کہ غیرت بیگم نے پون بٹھائی ۔ خدا نخواستہ ایسا تو پرانا بخار بھی نہیں کہ سل ہونے کا اندیشہ ہو ۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر سیانے اور بھگت بلائے آئے ، سب نے اپنے اپنے جادو چلائے ، مگر کم بخت پون کی کچھ اصل ، جادو کی کچھ حقیقت ہو تو روگ میں کمی ، مرض میں خفت ہو ؛ خبط کے جادو ، وہم کی پون ، اس کو اتارے کون ؟ ہریالی کا حال بہت پتلا ہوتا چلا ۔ آخر کسی نے صلاح دی کہ سب کچھ تو کر چکے ، ذرا ڈاکٹر چنبیلی کو بھی تو ایک نظر دکھاؤ ۔ چنبیلی کا نام اصل میں مس بیلی تھا ۔ ولایت سے نئی آئی ہوئی تھی کہ اس نے نواب اقتدارالدولہ بہادر کے محل میں ایک بڑے معرکے کا علاج کیا ، تب ہی سے شہر میں بڑی شہرت ہوئی ۔ نواب صاحب کی محل سرا میں اس کو چنبیلی چنبیلی پکارتے تھے ۔ وہاں کی سنی سنائی اور لوگ بھی چنبیلی کہنے لگے ۔ دایہ گری کے فن میں نہایت تجربہ کار اور مشاق تھی اور خود مبتلا کے گھر میں معصوم اور بتول دونوں کے ہونے میں بلائی جا چکی تھی ۔ ہریالی اور ہریالی کے تیمار دار کسی کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ ہریالی کی حالت ڈاکٹر چنبیلی کے علاج کی متقاضی ہے ۔ ڈاکٹر چنبیلی کو جب بلایا گیا تو غیرت بیگم سمجھ کر ، معرفت سابقہ کے لحاظ سے ، بلا عذر بہت خوشی کے ساتھ فوراً چلی آئی ؛ اس کو یہاں آکر معلوم ہوا کہ مبتلا نے

---

۱ ۔ ٹونا ، ٹوٹکا ، گنڈا ، تعویذ یا اسی قسم کا کوئی عمل ۔

دوسری بی‌بی کی ہے ۔ اس نے بیمار کو دیکھا تو سہی ، مگر مبتلا سے کہا کہ مجھ سے اور غیرت بیگم سے دوستی یا بہناپا تو نہیں ہے پر تم کو معلوم ہے کہ ان کے دو بچوں کے ہونے میں میں نے ان کی خبر گیری کی ہے ؛ تو تمھاری اس بی‌بی کا علاج کرنے کو میرا جی نہیں چاہتا ، اس کو میں خلاف مروت سمجھتی ہوں ، اور میرے علاج کی چنداں ضرورت بھی نہیں ۔ جس حکیم کا علاج کرتے ہو اُن کو صرف اتنا اشارہ کر دینا کہ دو جانوں کی رعایت سے علاج کریں ۔ اتنا کہہ کر ڈاکٹر چنبیلی غیرت بیگم کی طرف گئی ، معصوم اور بتول دونوں کو گود میں لے کر پیار کیا ، پھر غیرت بیگم سے بولی کہ ''اگر میں دوسرے گھر میں نہ بلائی گئی ہوتی تو میں تم سے پوچھتی کہ اس قدر دبلی کیوں ہو ؟ ہم لوگوں میں مرد دوسری بی‌بی نہیں کر سکتے اور مرد اور عورت دونوں کے حقوق کو تولا جائے تو شاید عورت ہی کا پلہ جھکتا ہوا رہے گا ، پھر بھی مرد اور عورت کا تعلق اس قسم کا ہے کہ بیاہ ہو جانے سے عورت مرد کے بس میں آ جاتی ہے ۔ یہی سمجھ کر میں نے اپنا بیاہ نہیں کیا اور کرنے کا ارادہ بھی نہیں ۔ میں تمھاری حالت پر افسوس کرتی ہوں اور اس سے زیادہ افسوس اس مجبوری کا ہے کہ مدد کرنے کی جگہ نہیں ، لیکن اگر کبھی میرا کام آ پڑے تو ضرور مجھ کو یاد کرنا ۔'' غیرت بیگم نے اگرچہ دیہات میں پرورش پائی تھی پر وہ اتنی بھی تو بے تمیز نہیں تھی کہ چنبیلی کے آنے کا ، اس کی محبت کا ، مروت کا ، ہمدردی کا شکریہ ادا نہ کرتی ، مگر سوکن کے جھگڑ میں اس کو کسی چیز کی سدھ نہ تھی ۔ چنبیلی اس سے بات کر رہی تھی اور یہ اس فکر میں تھی کہ کب چپ کرے اور میں سوکن کا حال پوچھوں ۔ غرض غیرت بیگم نے

چھوٹتے ھی پوچھا ''کہو کیا دیکھا ؟ چنبیلی بولی ، ''حکیم کو دھوکا ھوا ، اس نے پہچانا نہیں کہ یہ عورت چار مہینے ھوئے دوجی سے بیٹھی ھے ۔ میں نے تمھارے میاں کو جتا دیا ھے ۔ اب بھی اگر سمجھ بوجھ کر علاج ھو گا تو بچے کو تو میں نہیں کہہ سکتی ، کیونکہ ادھر تو ھوئے جلاب اور ادھر بخار کی وجہ سے ملیں اوپر تلے ٹھنڈی ٹھنڈی دوائیں ، بچے کو سردی نے پکڑ لیا ، مگر احتیاط کی جائے تو میرے نزدیک بچے والی کو ابھی تک کچھ بڑی جوکھوں نہیں ھے ۔ اس لیے کہتے ھیں کہ ''آدمی فربہ شود از راہ گوش ''۔ ھریالی نے جو سنا تو اس کے دل کو اس قدر تقویت پہنچی کہ کیسی دوا اور کس کا علاج ، گھڑیوں اس کا مزاج خود بخود بحال ھوتا چلا گیا ، یہاں تک کہ یا تو آپ سے کروٹ نہیں بدل سکتی تھی یا ایک ھی ھفتے میں چلنے پھرنے لگی ؛ یہ تو اُٹھ کھڑی ھوئی اور اس کی جگہ اب غیرت بیگم پڑی ۔ غیرت بیگم کا سارا غرور ، سارا گھمنڈ ، سارا ناز بے جا اولاد کے برتے پر تھا ؛ اب جو اس نے دیکھا کہ سوکن نے اس میں بھی ساجھا لڑایا تو حقیقت میں اس کی کمر ٹوٹ گئی ، اور سمجھی کہ بس اب ھریالی کے مقابلے میں نہیں پنپتی ۔ اس کو اس بات کی بڑی تسلی تھی کہ ھریالی لاکھ میاں کی پیاری کیوں نہ ھو ، آخر ھے تو بے اولاد ۔ نہ کوئی نام کا لینے والا نہ پانی کا دینے والا ۔ کھا لے جتنا اس کی تقدیر میں ھے اور پہن لے جس قدر اس کے نصیب کا ھے ۔ پھر میں ھوں تو میں اور نہیں تو اللہ رکھے اور پروان چڑھائے میری اولاد ۔ اس خیال سے کبھی اس نے سوکن کو سوکن مانا ھی نہیں ۔ اب البتہ اس کو سوکن کی حقیقت کھلی اور آدھی اور ساری کا سوچ پیدا ھوا ۔ چنبیلی ایسا کوئی دو تین گھڑی دن چڑھتے چڑھتے آئی

تھی ، اس کے گیے پیچھے سے جو غیرت بیگم گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھی تو دوپہر ڈھلتے ڈھل گئی ، مگر اللہ کی بندی نے گردن اونچی نہ کی ۔ دو تین بار کھانے کی اطلاع ہوئی ، مگر اس نے یہی کہہ دیا کہ مجھے بھوک نہیں ۔ اس کے گھر میں ایک بہت پرانی نوکر تھی خاتون ۔ وہ گھر کی داروغہ[۲] تو نہ تھی ، مگر کبر سنی اور قدیم الخدمتی اور ہوشیاری اور سلیقے کی وجہ سے گھر کے نوکروں میں سب سے سربر آوردہ تھی ۔ غیرت بیگم کو اس سے مانوس ہونے کا ایک سبب خاص یہ بھی تھا کہ جس طرح مبتلا نے غیرت بیگم پر سوکن کی ، اسی طرح خاتون پر بھی اس کے میاں نے سوکن کی تھی ۔ غیرت بیگم کا تو ایسی باتوں میں بہت جی لگتا تھا ۔ خاتون گھڑیوں اپنی سوکن کی باتیں کرتی اور غیرت بیگم کرید کرید کر پوچھتی اور ایک ایک بات کو بار بار کہلواتی ۔ پس خاتون نوکر کی نوکر تھی ، قصہ خواں کی قصہ خواں اور بیوی کی ہمدرد ۔ جب خاتون نے دیکھا کہ جس گھڑی سے چنبیلی آئی بیوی کچھ ایسی سوچ میں گئی ہیں کہ پان تک نہیں کھایا ۔ کھانے کا وقت بھی ٹل گیا تو اس نے قریب جا کر پوچھا کہ ”بیوی! آج جو تم اس قدر اداس بیٹھی ہو اس کا سبب کیا ہے ؟“ غیرت بیگم ”تم نے نہیں سنا کہ بے غیرت کے یہاں بال بچہ ہونے والا ہے ۔ ابھی اس نے کیا اٹھا رکھا ہے ، بال بچہ ہوئے پیچھے تو وہ مجھ کو اس گھر میں کھڑا پانی بھی نہیں پینے دے گی ۔“ خاتون ”بال بچہ ہونے والا ہوتا تو حکیم کیا ایسے اندھے ہیں ، جلابوں پر جلاب کیوں دیتے ؟“ غیرت بیگم ”حکیموں کو دھوکا ہوا ، انھوں

۲- جو ملازم یا ملازمہ نگرانی کے کاموں پر مامور ہو اسے داروغہ کہتے تھے ۔

نے جانا ٹھنڈی ٹھنڈی دوائیں دی جا رہی ہیں پیٹ میں بادی بھر گئی ہے ؛ اب چنبیلی نے دیکھا تو بتایا ۔ کیوں خاتون بی! میں تو سنتی تھی کنچنیوں کے اولاد نہیں ہوتی ۔ کیا میری ہی تقدیر پر ایسے پتھر پڑے تھے کہ مجھ پر کنچنی بھی آئی تو آتے دیر نہ ہو اور ماں بن جائے!'' خاتون ''نہیں بیوی ، کون کہتا ہے کہ کنچنیوں کے اولاد نہیں ہوتی ؟ ہوتی ہے اور نہیں بھی ہوتی ۔ کیا تم بھول گئیں ، میری سوکن کون تھی ، اصل نسل کی کنچنی ۔ جب میرا میاں اس کو لایا تو خدا جانے نامرادیں مردوں کی آنکھوں میں کیا ٹپکی ڈال دیتی ہیں ، وہ جانتا تھا کہ سترہ اٹھارہ برس کی لڑکی ہے ۔ پیچھے معلوم ہوا کہ چار کی ماں تو وہ اس وقت تھی اور ہمارے یہاں تو بیوی ، پانچ برس وہ جی ، میری اتنی روک ٹوک پر سات یا آٹھ دفعہ اس نے تیاری کی ، مگر واہ ری چنیا! دائی ہو تو ایسی ہو ، کبھی چوتھا نہ لگنے دیا ۔'' غیرت بیگم ۔ ''وہ چنیا اب ہے ؟'' خاتون ''مدتیں ہوئیں مر کھپ گئی ۔ ستر پچھتر برس کی تو وہ میری سوکن کے وقت میں تھی ۔'' غیرت بیگم ''پھر خاتون ، کوئی ویسی ہی تدبیر یہاں نہیں کرتیں؟'' خاتون ''بیوی ! تمھارے یہاں افتاد دوسرے طور کی ہے ۔ ہم تو غریب آدمی اب بھی ہیں اور تب بھی تھے ۔ میاں سات روپے مہینے پر ایک عطار کی دکان پر بیٹھتا تھا ۔ سامنے تھا اس بیسوا کا کوٹھا ؛ آدمی تھا وہ بھی طرح دار ، یہ نامراد اس کے سر ہوئی ۔ میں بارہ آنے مہینے کرائے پر دینا بیگ خاں کے کٹرے میں رہتی تھی ۔ ذرا سا مکان ، میرے اکیلے دم کا اس میں گزر ہوتا تھا ۔ سوکن صاحب جو آئیں بس میری گود میں بیٹھیں ۔ مردوا کم بخت اس طرح کا ظالم کہ گالی دے بیٹھنا اس کے آگے ایک

بات اور بات بات میں مکا اور لات ۔ اگر وہ کبھی مجھ کو اور سوکن کو آپس میں لڑتے دیکھ پائے تو دونوں کے ڈنڈے لگائے ۔ سو بیوی اپنی عزت اپنے ہاتھ ، میں نے تو چوں نہیں کی اور ظاہر میں سوکن سے ایسی گھلی ملی رہی جیسے سگی بہن ، پر دل سے تو وہ میری جان کی دشمن تھی اور میں اس کی ۔ ایک جگہ کے رہنے سہنے اور ظاہر کے میل ملاپ سے ایک یہ فائدہ تو تھا کہ میں جو چاہتی تھی سو کر گزرتی تھی ، اور اس کو یا مردوے کو شبہ نہیں ہونے پاتا تھا ۔ تمہارے یہاں بیوی اول دن سے کھلم کھلا بگاڑ پڑے ہوئے ہیں ۔ ایسی جگہ کوئی تدبیر چلنی ذرا مشکل ہے ، نہیں تو کیا بڑی بات تھی ۔ چنیا نہیں چنیا کی بہنیں اور بھتیری ، اور دائی کا بھی اس میں کیا کام ، ایک سے ایک دوا مجھ کو ایسی معلوم ہے کہ چٹکی بجاتے میں کھڑا پھٹکا نہ کھائے ۔'' غیرت بیگم ''اے ہے! اچھی میری خاتون ، ایسی کوئی دوا ہو تو ضرور مجھ کو بتاؤ ۔'' خاتون ''دوائیں تو بہت ، پر کچھ کاڑھے ہیں پینے کے ، کچھ لیپ ہیں لگانے کے ۔ آج کو یہاں دوا بنتی چھنتی ہوتی تو کچھ بھی مشکل نہ تھا ۔ دوا تو بناتے ہیں اپنے ہاتھوں سے میاں ، کوئی ڈرے تو کیا کرے؟'' غیرت بیگم ''پھر تم ہی کچھ تدبیر نکالو گی تو نکلے گی ، ورنہ میں تو اپنی جان پر کھیلے بیٹھی ہوں اور یہی بات اس وقت میں سوچ بھی رہی تھی ۔ خدا مجھ کو تو اس دن کے واسطے نہ رکھے ۔ ہائے ، کن آنکھوں سے دیکھوں گی کہ اس کے بچے کھیلتے پھریں اور کن کانوں سے سنوں گی کہ وہ اماں پکاری جائے ۔ تم سے کچھ ہو سکتا ہو تو کرو ، نہیں تو تم اکیلی کیا ، دنیا دیکھ لے گی کہ جلا ہوا دل بہت برا ہوتا ہے ۔ اور کسی پر زور نہیں چلتا ، اپنی جان تو اپنے بس کی ہے ۔

جان جائے گی بلا سے ۔ غیرت میرا نام ہے ، نام کے پیچھے جان دوں تو سہی ۔'' خاتون ''بیوی! خدا کے واسطے تم ایسی ایسی باتیں میرے سامنے تو کرو مت ۔ سن سن کر میرے تو ہوش اڑے جاتے ہیں ۔ جان سی چیز کہاں پائیے ، تم اپنے ننھے ننھے بچوں کا منہ کرو ۔ خدا تمہاری سلامتی میں ان کو پروان چڑھائے ! الٰہی تم کو ان کی بہاریں دیکھنی نصیب! اور قربان کی وہ نامراد سوکن ، خدا چاہے گا تو وہی نہ رہے گی ۔ ہراساں ہو تمہاری بلا اور غم کرے تمہاری پاپوش ۔ جب خدا نہ کرے تمہاری ہی جان پر آئے گی تو ہم پندرہ بیس بندے جو تمہاری جوتیوں سے لگے ہیں کیا منہ دیکھنے کے واسطے ہیں ؟ پہلے ہم سب تم پر سے تصدق ہو لیں گے تب جو بات سو بات ۔ پر بیوی جو بات تم چاہتی ہو جان جوکھوں کا کام ہے ۔ پہلے اپنی جان سے ہاتھ دھو لے تو اس کا بیڑا اٹھائے ۔ پھر اس کو چاہیے آدمی دل کا پکا ، پیٹ کا گہرا ، بھروسے کا پورا کہ خدا نخواستہ کل کلاں کو کچھ ایسی ویسی ہو تو اپنے اوپر جھیل لے جائے اور مالک کو بال بال بچائے ۔ سو تمہارے گھر میں تو میں اس ڈھب کا کسی کو نہیں پاتی ۔ چھوکریاں ہیں چھچھوری کہ آدھی بات سن پائیں تو ایک ایک کی چار چار دل سے بنائیں اور سارے محلے میں دھوم مچائیں ۔ رہ گئیں مامائیں ، نوکریں تو ہر کسی سے کہتے جی لرزتا ہے اور مجھ اکیلی سے سارا سر انجام ہو نہیں سکتا ۔ ایک میرا بھانجا ہے جو میرے میاں کی جگہ عطار کی دکان پر نوکر ہے ، اگر وہ گنٹھ جائے تو بس سارے کام آسان ہیں ۔ دیکھو میں اس سے ذکر کروں گی ۔ پر بیوی تم اپنی جگہ بھی سمجھ لو ۔ میری تو اگر جان بھی تمہارے کام آ جائے تو دریغ نہیں ۔ میں نے تمہارا نمک کھایا ہے اور میں اب

دنیا میں جی کر بھی کیا کروں گی، بہتیرا جی چکی ؛ پر میرا بھانجا بال بچے دار آدمی ہے ، عمر بھی کچھ اس کی ایسی بہت نہیں ۔ اس کو تو کچھ ایسا ہی بھاری لالچ دیا جائے گا تو شاید وہ اس کام میں ہاتھ ڈالے تو ڈالے ۔'' غیرت بیگم ''مجھ کو تو اگر کوئی کھڑا کر کے بیچ لے تو بھی عذر نہیں ، پر کسی طرح اس عذاب سے چھٹکارا ہو ۔'' خاتون ''بیوی دیکھو خبردار ! میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں ، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو ۔ نہیں تو سارے گھر پر آفت آ جائے گی ۔'' غیرت بیگم ''خیر خیر مناؤ ، تم نے کیا مجھ کو ایسا نادان سمجھ لیا ہے ۔ میں خوب سمجھتی ہوں کہ بڑے اندیشے کی بات ہے ۔ مجھ کو اپنے دونوں بچوں کی جان کی قسم کیا مجال کہ منہ تک بات آ جائے ۔'' خاتون ''بس تو بات کو اپنے ہی تک رہنے دو ۔ جب سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا تو میں تم کو خبر کر دوں گی اور میں تم کو یہی صلاح دیتی ہوں کہ مل جاؤ کیوں کہ ملاپ میں خوب کام نکلتا ہے ، مگر ملو نہیں تو یہ ہر وقت کا جھگڑا بکھیڑا تو موقوف کر دو ، ورنہ کرے گا کالا چور اور پکڑے جائیں گے تمہارے دشمن ، برا چاہنے والے ۔'' خاتون کے سمجھانے بجھانے سے غیرت بیگم نے ، باوجودے کہ نا وقت ہو گیا تھا ، منگوا کر کھانا کھایا اور وہ جو سارے سارے دن ہریالی کا جھکڑ لگا رہتا تھا وہ بھی بند ہوا ۔ آدمی لاکھ چھپائے پر دل کی کپٹ بے ظاہر ہوئے نہیں رہتی ۔ لوگ جو چوری یا دوسرے جرموں کے مرتکب ہوتے ہیں اپنے پندار میں بڑی بڑی پیش بندیاں کرتے ہیں اور آخر کو وہی پیش بندیاں ان کو رسوا اور فضیحت کراتی ہیں یا تو تمام تمام دن دونوں سوکنوں کی لڑائی کا ایک غل پڑا رہتا تھا یا ایک دم سے ہوا سناٹا تو غیرت بیگم اور خاتون کے سوائے سبھی

کو حیرت تھی کہ دلوں میں ایسی کیا نیکی خدا جانے ڈالی کہ آپ سے آپ لڑتے لڑتے رک گئیں ۔ باوجودے کہ خاتون نے سمجھا دیا تھا کہ جب سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا تو میں تم کو خبر کر دوں گی ، مگر غیرت بیگم کو اتنا صبر کہاں تھا ۔ اس نے تو اگلے ہی دن سے خاتون کی جان کھانی شروع کر دی ۔ ''کیوں بی ! اب کب ہو گا ، کیا دیر ہے ، کاہے کا انتظار ہے ۔ اے ہے ، کبھی ہو بھی چکے گا یا نہیں ! بس اب خاک ہو گا ۔ تم کو نہیں کرنا منظور تھا تو مجھ کو آس کیوں دی تھی؟ ''سخی[۳] سے سوم بھلا جو ترت دے جواب ۔'' آخر جب تقاضا حد سے گزر گیا تو ایک دن خاتون نے کہا '' لو بیوی ! خدا نے مجھ کو تم سے سرخرو کیا ۔ اب کہیں اتنے دنوں میں جا کر بڑی مشکل سے معاملہ طے ہوا ۔ میں تو سمجھتی تھی خدا جانے سرے سے حامی بھی بھرے یا نہ بھرے اور بھرے تو دس ہزار مانگے پندرہ ہزار مانگے ، پر ماشاء اللہ قسمت تمھاری بڑی زبردست ہے ، سستا چک گیا ۔ ایک ہزار روپے پہلے اور پھر چپ چپاتے خاطر خواہ کام ہوئے پیچھے ایک ہزار اور؛ اور جو خدا نہ کرے کہیں کھل کھلا پڑے تو دو ہزار ۔'' غیرت تو کہہ ہی چکی تھی اگر مجھ کو کوئی کھڑا کر کے بیچ ڈالے تو بھی عذر نہیں ۔ سننے کے ساتھ لگی ہاتھوں سے سونے کے ٹھوس کڑوں کی جوڑی اتارنے کہ اتنے میں خاتون بولی ''بیوی کڑے مت دو ، میرا جی کڑھتا ہے ! ننگے ہاتھ برے لگیں گے اور لوگوں میں بھی پرچول پڑے گی ، بلکہ جتنا گہنا تم پہنے رہتی ہو اس میں سے کچھ بھی مت دو ۔'' غرض جس جس طرح خاتون کہتی گئی

۳- یہ مثل اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص امید دلا کر ٹال مٹول کرے ۔ سوم ، یعنی کنجوس ۔ ترت ، یعنی فوراً ۔

کچھ نقد ، جنس ملا کر ہزار پورے کر اس کے پلے باندھے ۔
ہزار معجل[۴] اور ہزار موجل کے بدلے خاتون نے یہ کار نمایاں
کیا کہ چوھوں کے بہانے سے تھوڑی سی سنکھیا بھانجے سے مانگ
ئی ۔ دونوں گھروں میں دودھ کا راتب بندھا ہوا تھا ۔ گھوسن
ڑے سویرے آتی اور سب سے پہلے یہیں کا راتب لاتی ۔ خاتون
ندھیرے منہ آٹھ مردانے میں جا بیٹھی ۔ جوں ہی گھوسن نے
اؤں اندر رکھا کہ خاتون اس سے لڑنا شروع کیا کہ ''ساری
نیا میں حلوائی ہوئے ، گھوسی ہوئے دودھ میں پانی ملاتے ہیں ؛
ہ کہیں سے بے چاری انوکھی گھوسن نکلی کہ پانی میں دودھ ملا
ر لاتی ہے ۔ پرسوں کھیر پکی کسی نے منہ پر نہیں رکھی ۔ کل
وں چاھا کہ سویوں میں ڈالیں نیلا نیلا نسوت پانی ۔ ہر روز
وی کو ہم لوگوں پر خفا کرواتی ہے ۔ لا تیری ہنڈیا بیوی
تو لے جا کر دکھاؤں تب تو انہیں یقین آئے گا ۔'' غرض
بردستی گھوسن کے ھاتھ سے ہنڈیا چھین ڈیوڑھی میں لے گھسی
ر سنکھیا کی پڑیا دودھ میں گھول ، ہنڈیا گھوسن کو پھیر
ی کہ بیوی کہتی ہیں ''میرے پاس حرام کا پیسہ نہیں ہے ۔ جا دور
و ، اب میرنے گھر دودھ نہ لانا ۔'' برسوں کی لگی ہوئی
ہوسن اور روز کا راتب ، اس طرح ملونی کرتی تو اتنی مدت
یوں کر نبھتی ۔ بے چاری رونکھی اور کھسیانی ہو کر خاتون
منہ دیکھنے لگی اور چھوٹے گھر کی ماما کو آواز دے بھری
نیا اس کے حوالے کی کہ بڑی بی بی نے تو آج کئی برس
ے بعد جواب دیا ، چھوٹی بی بی بھی اگر دوسری گھوسن لگا لیں

۴- مہر نکاح کی دو قسمیں ہیں : معجل ، جو نکاح کے بعد فوراً ادا کیا
ئے اور مؤجل جو بعد میں کسی وقت دیا جا سکے ۔ یہاں پر یہ الفاظ نقد
ر اُدھار کے معنی میں مزاحاً استعمال ہوئے ہیں ۔

تو میری ہر روز صبح سویرے کی اتنی دور کی ربڑ بچے - ہریالی نے دیکھا تو دودھ ہر روز جیسا گاڑھا اور چکنا - اس کے جی میں آگیا کہ میاں کئی بار فیرینی کی فرمایش بھی کر چکے ہیں، لاؤ آج قلفیاں جما دیں - سارے کا سارا دودھ لے لیا - جب دودھ لے چکی تب اس کو خیال آیا کہ آج تو بڑے گھر کی باری ہے - ماما سے کہا ''دیکھو تو کیا مجھ سے بھول ہوئی، بڑے گھر کی باری کا خیال نہ رہا اور فیرینی کے لیے اتنا سارا دودھ لے بیٹھی، اب کیا کروں؟'' ماما نے کہا ''مضائقہ کیا ہے - جاڑے کے دن ہیں اس وقت کی جمی ہوئی باسی قلفیاں تو کل تک ٹھنڈی اور بھی مزے کی ہوں گی -'' غرض فیرینی پکا، قلفیاں بھر، الماری میں رکھ اوپر سے قفل لگا دیا - جن لوگوں کے بال بچے نہیں ہوتے، جی بہلانے کو اکثر جانور پال لیا کرتے ہیں - ہریالی نے بھی طوطا اور مینا اور بلی اور کبوتر اور مرغیاں، بہت سے جانور پال رکھے تھے - اچھا ایک پیالہ بھر کر فیرینی ان جانوروں کے لیے الگ نکال کر تھوڑی ماما کے لیے دیگچی میں لگی چھوڑ دی تھی - دو سیر دودھ، مسا کر پاؤ بھر چاول، برابر کی کھانڈ، فیرینی کا ہے کو تھی اچھا خاصا کھویا کہنا چاہئے - جس نے پائی خوب مزے سے کھائی - دو گھنٹے نہیں گزرنے پائے تھے کہ سب سے پہلے میاں مٹھو ٹیں[۵] ہوئے - پھر تو باری باری سے اوپر سویر کوئی جلدی کوئی دیر، مینا سکڑی، بلی بولائی، کبوتر چکرائے، مرغیاں اونگھنے لگیں - ماما مارے قے اور دستوں کے بدحواس ہو گئی - ڈولی میں لاد اس کے گھر پہنچوایا - اس کا بیٹا کہیں

۵- ٹھنڈے ہو گئے یا مر گئے - میاں مٹھو کی آواز (ٹیں ٹیں) کی رعایت سے ' ٹیں ہو گئے ' ایک خاص لطف رکھتا ہے - بلی کے لیے بولائی (یعنی پاگل ہو گئی) بھی ایک صوتی رعایت سے لایا گیا ہے -

ہانے میں نوکر تھا ، سنتے کے ساتھ بھاگا ہوا آیا ۔ ماں کو
کھا تو آدمی کو نہیں پہچانتی تھی ۔ نیم جان کو اٹھا کر
سپتال لے گیا ۔ ڈاکٹر نے پچکاری سے پیٹ صاف کیا ۔ پانی جو
ٹ میں سے نکلا تھوڑے سے میں کوئی دوا ڈال کر دیکھا تو
کھیا تھی ۔ آخر ڈاکٹر نے سوچ سوچ کر یہ کہا کہ ہم
نہیں بتا سکتے کہ اس نے کتنی سنکھیا کھائی اور ٹھیک
س وقت کھائی ، لیکن جس قدر اس کے پیٹ میں سے نکلی ہے
ر اتنی بھی ہضم ہو کر خون میں مل گئی ہوگی تو
مدے کی رو سے اس کو مرنا نہیں چاہئے ۔ غرض سنکھیا کے
ڑ کا جو تریاق انگریزوں کے یہاں ہوتا ہوگا اوپر تلے دینا
روع کیا ۔ اگلے دن صبح ہوتے ہوتے بیمار کی طبیعت
چھ سنبھلی ۔ آخر لوٹ پیٹ کر کچھ اچھی تو ہوئی ، مگر
چھ ایسا روگ لگ گیا کہ جب تک زندہ رہی مارے دھڑکن
، بیچاری کو ساری ساری رات بیٹھے گزر جاتی تھی ۔ ادھر
یالی کے یہاں جس جس جانور نے ذرا سی فیرینی کھائی
ھی کی تو موت آئی ۔ ہریالی اپنے اس کنبے کے سوگ میں تھی
ہ کوئی چار گھڑی دن رہتے رہتے تو کوتوالی کے لوگ
دانے میں آ بھرے ۔ پکڑ دھکڑ ہونے لگی ۔ فیرینی کی قلفیاں
ر مرے ہوئے جانوروں کی لاشیں تو کوتوالی والوں نے فوراً
سپتال کو ڈاکٹر کے پاس چلتی کیں اور لگے اپنے دستور کے مطابق
ک ایک کو الگ الگ لے جا کر پوچھ گچھ کرنے ۔ غرض
گھڑی رات کی توپ نہیں چلی تھی کہ کوتوالی والوں نے
ا مقدمہ مرتب کر لیا ۔ محلے والوں نے اظہار دئے کہ
نوں گھروں میں ہر وقت کوسم کاٹا رہا کرتی تھی ، اب
نے عشرے سے امن ہے ۔ گھوسن نے بیان دیا کہ میں مدت سے

دونوں گھروں میں دودھ کا راتب لاتی ہوں ، کبھی کسی ۔
دودھ کو برا نہیں بتایا ۔ کل خاتون نے پہلے پہل مجھ سے کہ
کہ تیرے دودھ میں ملونی ہوتی ہے اور ہنڈیا میرے ہاتھ سے لے
ڈیوڑھی میں گھس گئی اور پھر الٹے پاؤں ہنڈیا لے کر باہر
آئی کہ بیوی نہیں لیتیں ۔ میں نے وہی ہنڈیا جوں کی توں
چھوٹے گھر میں بھیج دی ۔ دونوں گھروں کی ماماؤں ۔
ایک زبان گواہی دی کہ گھوسن نے کبھی دودھ برا نہیں دیا
حکیم[۶] عطار نے تصدیق کی کہ میری دکان پر خاتون کا بھائی
بیٹھتا ہے اور جس وقت میں دکان پر نہیں ہوتا وہی بیچتا کھوچنا
ہے اور میری دکان میں سنکھیا بھی رہتی ہے ، مگر میری سخت
تاکید ہے کہ دیکھو سنکھیا[۷] ، کچلا ، جال گوٹا ، شنجرف
ہڑتال ، بچناگ ، دھتورا ، اس قسم کی چیزیں انجان آدمی کے ہاتھ
مت بیچنا ۔ ان چیزوں کی فروخت کا حساب کتاب میں کر
شہر میں کوئی عطار بھی نہیں رکھتا ۔ خاتون کے بھانجے کو بلوایا
بہتیرا ڈھونڈا ، اتفاق سے اس وقت نہیں ملا ، بلکہ کوتوالی والوں
کو شبہ ہوا کہ کہیں خبر پاکر روپوش تو نہیں ہوگیا
بس اسی کے آنے کی کسر رہ گئی ورنہ مقدمہ اسی وقت لکھ
پڑھی ہوکر چالان ہوجاتا ۔ گھر کے نوکروں میں خاتون ذر
سب سے زیادہ معزز تھی اور ڈیوڑھی تک بھی بہت ہی کم
آتی جاتی تھی ؛ کوتوالی والوں کو ہوا تامل کہ اس کو
دوسرے نوکروں کی طرح باہر بلوائیں یا آپ ڈیوڑھی کے
پاس جا کر اس سے پوچھ پاچھ کرلیں ۔ اتنے میں تو سید ناظر

۶- حکیم کا نام ۔

۷- یہ سب چیزیں دواؤں میں کام آتی ہیں ، لیکن کم و بیش سب ہی تیز اور زہریلے اثرات رکھتی ہیں ، لہٰذا ان کے استعمال میں خاص احتیاط

خبر پا کر آموجود ہوئے ۔ اگر ناظر ذری دیر اور نہ آتے تو خاتون کی کیا اصل تھی ، کوتوالی والے تو اس کے اچھے سے قبول کروالیتے، بلکہ وہ تو اس فکر میں تھے کہ اپنی طرف سے کسی عورت کو اندر بھیج کر خود بیگم صاحب کی مزاج پرسی کریں ۔ ناظر کا آنا تھا کہ مقدمے کا رنگ بدل گیا ۔ کوتوال نے مناسب سمجھا کہ رات گئی ہے زیادہ اس وقت تحقیقات کو ملتوی کیا جائے ۔ فیرینی کی قلفیاں اور مرے ہوئے جانوروں کی لاشیں یہی دو بڑے ثبوت تھے ، سو دونوں ہمارے ہاتھ میں ہیں ۔ اب ناظر نہیں ناظر کے باپ بھی قبر سے اٹھ کر آئیں تو کیا کر لیں گے ؟ ما ما کے پیٹ میں سے سنکھیا نکل چکی ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ اتنے سارے جانور سب سنکھیا سے مرے اور فیرینی میں سنکھیا موجود ۔ اب رہ گئی یہ بات کہ سنکھیا دی تو کس نے دی ، سو نہ دونوں سو کنوں سے انکار ہوسکتا ہے اور نہ دونوں کی عداوت سے ۔ زہر خورانی کا مقدمہ اس سے زیادہ اور کیا ہوگا ۔ صاحب مجسٹریٹ کوتوالی کے چالان کیے ہوئے مجرم اکثر چھوڑ دیا کرتے ہیں اور ان کو کوتوالی کے ساتھ خدا واسطے کو ایک ضد سی آ پڑی ہے ، لیکن اگر اس مقدمے کو بگاڑا تو علم[۸] کی قسم صاحب سپرنڈنٹ کو سمجھا کر صدر کو ایسی رپورٹ کراؤں کہ جواب دیتے بن نہ پڑے اور میاں ناظر کو بھی وکالت کا بڑا گھمنڈ ہے ۔ بڑی مدت میں اونٹ پہاڑ کے تلے آیا ہے ؛ دیکھیں تو اب ہائی کورٹ کی کون سی نظیر پیش کر کے بہن کو بچاتے ہیں ۔'' غرض کوتوال خاتون کو ناظر کے سپرد کر ،

۸- کوتوال صاحب ذات کے ہندو کایستھ ہیں اور کایستھوں میں علم کی بڑی قدر ہے لہٰذا علم کی قسم کھائی ہے۔

حوالہ نامہ لکھوا ، گھوسن کو ساتھ لے ، چلتا ہوا ، اور سیدھا پہنچا صاحب سپرنٹنڈنٹ کے پاس اور ان کو مقدمے کی روداد سمجھا کر کہا کہ ''مقدمہ ہے سنگین اور مجرم عورتیں پردہ نشین ۔ سید ناظر وکیل کا نام حضور نے سنا ہوگا ، اصل میں ان کی بہن نے سوکن کو زہر دلوایا ، مگر وہ اتفاق سے بچ گئی ۔ کل حضور بھی موقع واردات تک چلیں ورنہ وکیل صاحب بڑے شورہ پشت اور ثقہ بدمعاش ہیں ، ہم لوگوں کے قابو آنے والی اسامی نہیں ۔'' ادھر ناظر بہن کے پاس گیا تو دیکھا سارے ہول کے دست پر دست چلے آرہے ہیں ۔ دیکھتے کے ساتھ ہوش ہی تو خطا ہوگیے اور سمجھا سب سے بڑا ثبوت تو خود ان کی حالت ہے ۔ آخر بہن سے اتنا کہا کہ ''بڑے بھائی نے تم کو اس قدر ڈرا دھمکا دیا تھا ، مگر تم نے نہ مانا اور دل کی بودی طبیعت کی کچی ، ہمت کی ہیٹی تھیں تو ایسے کام پر تم کو جرأت کیوں کر ہوئی ؟ بس اب تین پہر رات اور ہے ، صبح ہوئی اور تمہاری ڈولی کوتوالی چلی ۔'' بھائی کے منہ سے اتنی بات سن غیرت بیگم کو اور تو کچھ نہ سوجھا : بہت دن ہوئے تولہ بھر افیون منگوا کر صندوقچے میں رکھ چھوڑی تھی ، دوڑی دوڑی کوٹھری میں جا ، صندوقچہ کھول ، افیون کا گولا نکال ، اوپر سے بھرا کٹورا پانی کا ہی لیا ۔ بتول کی انا کو یہ حال معلوم تھا کہ انھوں نے صندوقچے میں افیون رکھ چھوڑی ہے ۔ دالان کے ایک کونے میں بیٹھی ہوئی بھائی بہن کی باتیں سن رہی تھی ۔ بیوی کو جو اس طرح گھبرا کر اندھیری کوٹھری میں جاتے ہوئے دیکھا ، جلدی سے بتول کو چارپائی پر لٹا ، پیٹتی ہوئی بھاگی کہ ''اے ہے ! خاک پڑے اس جھگڑے پر ! لو اب تو دشمنوں کو ٹھنڈک پڑی ! وہ

بیوی نے افیون کھالی۔'' اتنے میں تو غیرت بیگم بھی کوٹھری سے یہ کہتی ہوئی نکلی کہ''بھائی ! تم کچھ تردد مت کرو ۔ مجھ بری سے خدا نے تم سب کا پیچھا چھڑایا ۔ صبح تک میں ہی نہیں رہوں گی ۔ کوتوال کو اختیار ہے ، میرا مردہ لے جا کر کوتوالی میں دفن کرے ۔'' زہر خورانی کا ایک مقدمہ تو قائم تھا ہی ، اقدام خود کشی کا دوسرا اور ہوا ۔ معصوم اور بتول دونوں بے خبر پڑے سوتے تھے ، غیرت بیگم نے سوتوں کو لے کر پیار کیا اور دونوں کو گلے لگا کر ایسی بلک بلک کر روئی کہ گھر میں قیامت برپا ہو گئی ۔ ناظر نے جو بہن کا بلبلانا دیکھا اور ساتھ ہی خیال آیا کہ بس یہ بھی دنیا میں تھوڑی دیر کی مہمان اور ہے پھر کہاں ہم اور کہاں بہن ، اس کے سر پر ایسا جنون سوار ہوا کہ نہ پکارا نہ کنڈی کھڑکھڑائی نہ دستک دی نہ اجازت لی ، منہ اٹھا سیدھا چھوٹے گھر میں جا گھسا ۔ دونوں میاں بیوی سر جوڑے بیٹھے ہوئے خدا جانے کیا صلاحیں کر رہے تھے ۔ مبتلا نے آہٹ پا کر دور سے ڈانٹا ''ایں ایں کیا بدتمیزی ہے ! اندھے ہو ؟ تم تو معلوم نہیں کہ پردہ ہے ۔ آج مرتبہ بہن کو مداخلت بے جا کی نالش پر آمادہ کرتے تھے اب یہ مداخلت بے جا نہیں ہے ؟'' ناظر ''اللہ رے تیرا پردہ! نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی ! یہی نالائق پردے والی بنی تو پردے والی نے افیون کھائی اور دنیا جہاں سے روپوش ہونے کی تیاری کی ۔'' مبتلا ''الحمد اللہ ، خس کم جہاں پاک ! مگر تم خیریت سے چلتے پھرتے تو نظر آؤ ۔ سامنے سے پرے ہٹتے ہو یا میں آٹھ کر تم کو رستہ دکھاؤں ؟'' مبتلا کا اتنا کہنا تھا کہ ناظر یا تو صحن میں تھا یا مبتلا کی چھاتی پر ۔ پھر تو دونوں میں خوب کشتی ہوئی ۔ ناظر دیہات میں

پیدا ہوا ، دیہات میں پلا ؛ ہاتھ پاؤں کا ٹھلا ، گٹھیلا ، برسوں اکھاڑے کا لڑا ہوا ، بیسیوں داؤں یاد ، پچاسوں گھاتیں معلوم ، سیکڑوں پیچ رواں ، اور اب تک بھی دو وقت ڈنڈ مگدر کبھی اس نے ناغہ ہونے نہیں دیے ۔ مبتلا ۔ چارے نازنین ، میر[۹] پھویا مرزا مہین ، ناظر نے وہ پٹخنیاں دیں اور ایسا ایسا رگڑا کہ آنکھیں نکل نکل پڑیں اور سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے ۔ مبتلا کے پاس پھکیتی بچیتی کل جمع تین حربے : چٹکیاں لینا ، نوچنا ، کاٹنا ؛ سو ناظر کی پھرتی کے مقابلے میں ایک بھی کار گر نہ ہوا ۔ مبتلا کو اگر معلوم ہو کہ یہ کم بخت ، چھوٹا کھوٹا ، چھپا رستم ایسے غضب کا بجھا ہوا ہے تو کبھی بھول کر بھی اس سے دوبدو نہ ہو ، مگر اس کی تقدیر میں تو دو بیبیاں کر کے ہر طرح کی مصیبت اٹھانی تھی ۔ چھوٹا سمجھ کر اس کو ایک ڈانٹ بتائی ، بیٹھے بٹھائے اور اپنی شامت لوائی ۔ ہریالی نے جب دیکھا کہ میاں کو ناظر گیند کی طرح اچھالے اچھالے پڑا پھرتا ہے ؛ یہاں سے اٹھایا اور وہاں دے مارا اور اُدھر سے اچھالا ادھر لا پٹکا ؛ ایسی دہشت دل میں سمائی کہ اس کا حمل جس کے سبب سے اتنا سارا فساد ہوا ، ساقط ہوگیا ۔ ناظر کیا مبتلا کو جیتا چھوڑتا ، وہ تو خدا کا کرنا عین وقت پر سید حاضر آ پہنچے ۔ دیکھا تو گھر میں مجموعۂ تعزیرات ہند[۱۰]

---

۹ - ''مرزا پھویا میر مہین'' کہا جاتا ہے ۔ مرزا پھویا — ایک روایتی کردار جو جسمانی نزاکت کے لیے ضرب المثل ہے ۔ میر مہین بھی ایک فرضی نام جو طنز و استہزا کے لیے گھڑ لیا گیا ہے (مہین یعنی باریک) ۔

۱۰ - تعزیرات ہند — انڈین پینل کوڈ کا اردو ترجمہ (مترجمہ مولوی نذیر احمد) جس میں قانون فوج داری کی دفعات اور جرائم کی تفصیل درج ہے ۔ چونکہ گھر میں یہ یک وقت کئی جرائم سرزد ہو چکے ہیں لہٰذا مبالغے کے پیرائے میں کہا گیا کہ ''گھر میں مجموعۂ تعزیرات ہند پھیلا پڑا ہے ۔''

پھیلا پڑا ہے ، مگر کیا قایم مزاج[۱۱] آدمی تھا ۔ آتے کے ساتھ سب سے پہلے تو ناظر اور مبتلا کو چھڑایا ، پھر نمک ڈال بھر بھر لوٹے گرم پانی غیرت بیگم کو پلانا شروع کیا ۔ غیرت بیگم اس طرح کی ضدی عورت تھی کہ اگر ساری دنیا ایک طرف ہوتی تو گرم پانی کا کٹورا منہ کو نہ لگانے دیتی ، مگر کچھ تو بڑے بھائی کا لحاظ اور ادھر چپکے سے کسی نے کان میں جھک کر کہہ دیا کہ ''مبارک ہو ، ہریالی کا حمل تو گر گیا'' بے عذر خوب ڈگڈگا کر پانی پی لیا ۔ پانی کا حلق سے اترنا تھا کہ استفراغ ہوا اور استفراغ کے ساتھ کھٹ سے افیون کا گولا سموچے کا سموچا نکل کر الگ جا پڑا ۔ ادھر ہریالی کی خدمت کے لیے دھری دھری دائیاں بلوائیں اور پھر مبتلا اور ناظر دونوں کو ساتھ لے جا کر بیٹھا کہ ''ہر چند تم دونوں کی طبیعتیں اس وقت حاضر نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ مزاج میرا بھی ٹھکانے نہیں ، مگر میں دیکھتا ہوں تو آدھی رات ڈھل چکی ہے صرف سوا پہر کی مہلت ہے ۔ سامان تو بد قسمتی سے ایسا جمع ہوا ہے کہ اب آبرو بچتی ہوئی نظر نہیں آتی اور جب آبرو پر بنی تو سب سے پہلا شخص جو جان دینے میں دریغ نہ کرے میں ہوں ۔ دیکھو تو کتنے آدمی ہم لوگوں کے ملاقاتی ہیں ، مگر ہمدردی اور مدد تو درکنار مرد عورت کوئی آ کر بھی جھانکا ؟ سچ کہا ہے گاڑی بھر آشنائی کام کی نہیں اور رتی بھر ناتا کام آتا ہے ۔ بڑے سخت افسوس کی بات ہے کہ جب ناتے سے کام لینے کا وقت آیا تو تم لوگ آپس ہی میں لڑنے لگے ۔ جس طرح پر تم دونوں میں لڑائی شروع ہوئی میں سب سن چکا ہوں ۔ تم میں سے کسی کو مجھ سے یہ توقع

---

۱۱ - مستقل مزاجی ، حلم و تدبر حاضر کے کردار کا نمایاں پہلو ہے ۔

نہیں رکھنی چاہئے کہ میں ایک کو ملزم ٹھہراؤں اور دوسرے کو بری - جس طرح تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی اسی طرح لڑائی کبھی ایک کے لڑنے سے نہیں لڑی جاتی - میں تم دونوں کو برابر الزام دیتا ہوں ، لیکن رشتہ‌داروں میں اگر کسی بات پر چخ بھی ہو جاتی ہے ، تاہم ان کے خون ملے ہوئے ہیں - وہ ظاہر میں جدا ہیں اور باطن میں ایک - غیرت بیگم کا افیون کھا لینا سن کر مبتلا بھائی کو منہ سے الحمد للہ کہہ دینا بہت آسان تھا ، لیکن جب غیرت بیگم کی مدت حیات پوری ہو اور خدا کرے[۱۲] کہ مبتلا بھائی اس کو اپنے ہاتھوں سے مٹی دیں تو دنیا میں سب سے بڑھ کر رنج کرنے والے بھی یہی ہوں گے - گھر کس کا برباد ہوگا؟ ان کا ، اولاد کس کی بے ماں کی ماری ماری پھرے گی؟ ان کی - کنبے والوں کا میل ملاپ کس سے چھوٹ جائے گا؟ ان سے - بھلے مانسوں میں جو خانہ داری کی ساکھ ہوتی ہے ، یعنی تمدنی عزت وہ کس کی جاتی رہے گی؟ ان کی - اس میں شک نہیں چھوٹی بھاوج کی وجہ سے دلوں میں بڑے فرق پڑ گئے ہیں اور پڑنے ضرور تھے ، مگر پھر بھی غیرت بیگم کی ناموس کا پاس ہم کو چھٹانک بھر ہوگا تو مبتلا بھائی کو سیر بھر - میں جانتا ہوں کہ مبتلا بھائی بڑے ضبط کے آدمی ہیں ، منہ سے نہیں کہتے ، مگر ان کے تلوں سے لگی ہے - ناظر! کیا کوئی تم سے خیر کی توقع کرے گا جب تم ایسی مصیبت میں مبتلا بھائی کی مدد نہ کرو - ہزاروں قدموں میں تم بہ طبع صلہ پیروی کرتے ہو ، اس ایک مقدمے میں صلہ رحم سمجھو اور میری خاطر سے ، اپنی بہن کی

۱۲- سہاگن کی موت پانا (یعنی شوہر کی زندگی میں مر جانا) عورت کے لیے عین سعادت سمجھی جاتی ہے-

اطر سے ، بھانجے بھانجی کی خاطر سے غصے کو تھوک کر بجاؤ کی
وئی صورت نکالو اور تم مبتلا بھائی! از برائے خدا رحم کرو
ے چھوٹے چھوٹے بچوں پر ، بزرگوں کے نام پر خاندان کی
ت پر! تم کو معاملات مقدمات کا کبھی اتفاق نہیں پڑا ۔
وتوالی والے مدت سے تم پر دانت لگائے بیٹھے ہیں ؛ خدا جانے
س بلا میں تم کو پھنسا دیں گے ۔ ناظر تمھارا خورد ہے اگر
ے نے بے تمیزی کی تو بہت برا کیا ، جھک مارا ؛ میں اس کی
ف سے معذرت کرتا اور تمھاری ٹھوڑی میں ہاتھ ڈالتا ہوں ؛
نے دو ، معاف کرو!'' اس کے بعد ناظر کو پکڑ کر مبتلا کے
وں پر گرایا اور ناظر اور مبتلا دونوں کو گلے لگوایا ۔
دونوں بھی ایک دوسرے سے مل کر روئے ۔ حاضر بہن کی
ھی کا تصور کر کے مغموم تو پہلے سے تھا اب ان کو
تا ہوا دیکھ کر آپ بھی رونے لگا ۔ جب سب کے دلوں کی
ڑاس نکل چکی تو حاضر نے ناظر سے پوچھا'' کیوں بھائی اب
رنا کیا چاہئے؟'' ناظر'' خیر اب آپ فرماتے ہیں اور آپ کا
م درمیان میں ہے تو میں اس مقدسے میں ہاتھ ڈالتا ہوں ،
ر مبتلا بھائی نے آج اس رنڈی کے سامنے (آپ برا مانیں یا
لا مانیں ، میں تو اس کو ساری عمر بھاوج کہنے والا نہیں) ایسا
بل کیا ہے کہ میں اس رنج کو کبھی بھول نہیں سکتا ۔
ب آپا نے میرے بیٹھے پر افیون کھائی تو میں گھبرا کر
غرض سے ان کے پاس دوڑا ہوا گیا کہ ہم دونوں ہم صلاح
کر تدبیر کریں ۔ انھوں نے مجھ کو دروازے میں سے
کھ کر اس طرح دتکارا کہ کوئی کتے کو بھی نہیں دتکارتا ۔
کو رہ رہ کر غصہ آتا ہے کہ انھوں نے تو شرم اور حیا
ب کو بالائے طاق رکھ دیا ۔ اب آپ کے سامنے میرا منہ

کھلواتے ہیں ۔ کل کی بات ہے کہ یہی نالائق جو آج بڑا لمبا چوڑا پردہ لگا کر بیٹھی ہے (بے اختیار جی چاہتا ہے کہ مارے جوتیوں کے بد ذات کے سر پر ایک بال باقی نہ رکھوں) ٹکے ٹکے پر ماری ماری پڑی پھرتی تھی اور کوئی اس پر تھوکتا بھی نہ تھا ۔ انھی سے پوچھیے کہ کے بار میرے یہاں اس کا مجرا ہوا۔ جب آتی تھی ڈیوڑھی میں سے فراشی سلام، یا اب اس کو یہ بھاگ لگے ہیں کہ ہمارے سامنے ہونے سے اس کی بے پردگی ہوتی ہے ۔ عزت بنانے سے نہیں بنتی، بلکہ خدا داد چیز ہے ۔ آج یہ پردہ نشین بنی کل کو سیدانی بن کر چاہے گی کہ ہماری ماں بہنوں کے ساتھ بیوی کی صحنک کھائے ؛ پرسوں اس کے بال بچے ہوں گے اور کہے گی کہ سیدوں میں رشتہ ناتا کرتی ہوں تو کوئی بھلا مانس اس کو جائز رکھے گا ؟ یہ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں سب ہماری آپا کا صبر پڑ رہا ہے اور ابھی کیا ہے یہ مظلمہ تو مبتلا بھائی کو ایسے ناچ نچائے گا کہ ہریالی کو ساری عمر ایسا ناچ ناچنے کا اتفاق نہ ہوا ہوگا ۔'' ناظر تو باتوں باتوں میں گرم ہوتا جاتا تھا اور مبتلا کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں کہ اب کے پھر کہیں یہ جن لپٹ پڑا تو ہڈی پسلی ایک کر کے رکھ دے گا ۔ حاضر کے بیٹھے کی اگر ڈھارس نہ ہو تو قریب تھا کہ مبتلا کی گھگھی بندھ جائے ۔ بارے حاضر نے کہا ''بھائی ناظر! یہ تو تم پھر بگاڑ کی سی باتیں کرتے ہو ۔ یہ سچ ہے کہ مبتلا بھائی کی نادانی نے سارے گھر کو تہ و بالا کر دیا، مگر یہ بھی تو نہیں ہو سکتا کہ ہم غیروں کی طرح دور کھڑے ہوئے تماشا دیکھیں ۔'' ناظر ''یہ تو میں نے وہ حقیقت بیان کی جو میرے دل میں تھی؛ رہ گیا مقدمہ، اس سے آپ اطمینان رکھیے ۔ مبتلا بھائی کو

روپیہ تو بہت خرچ کرنا پڑے گا ، ایسا کوئی پانچ چھ ہزار ، مگر خدا نے چاہا تو ان پر اور ان کے طفیل میں ہریالی پر کوئی گزند نہیں آنے پائے گا ۔ اس وقت تک مبتلا کو مقدمے کی واقعی روداد اور کوتوالی کی تحقیقات سے اپنی اور ہریالی دونوں کی طرف سے پورا اطمینان تھا اور دونوں اپنی جگہ خوش تھے کہ ''چاہ کن را چاہ در پیش'' سنکھیا دی اسی غرض سے کہ ہم دونوں کھائیں اور مر کر رہ جائیں ؛ خدا کی قدرت ہم دونوں کے منہ پر رکھنے کی نوبت بھی نہ آئی اور اوپر ہی اوپر ماما کے بیٹے نے جا سرکار میں خبر پہنچائی ؛ اب لینے کے دینے پڑے ۔ غیرت بیگم کو پھانسی ہو تو پھانسی ، عمر قید میں تو شک ہی نہیں ۔ چلو سستے چھوٹے اور روز کا ٹنٹا مٹا ۔ ناظر کے منہ سے یہ کلام سن کر کہ پانچ چھ ہزار روپیہ خرچ کرو تو تم پر گزند نہیں آنے پائے گا ، مبتلا تو حیران ہو کر اس کا منہ دیکھنے لگا اور بے اختیار بول اٹھا ''کیوں صاحب! الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے ، مجھی کو زہر دیا جائے اور میں ہی گزند سے بچنے کے لیے پانچ چھ ہزار روپیہ بھی خرچ کروں! کیا انگریز کی عملداری میں یہی انصاف ہے؟'' ناظر ۔ ''ہوش کی بنواؤ! تماش بینی اور شے ہے اور مقدمے کی باریکی کو پہنچنا کچھ اور چیز ہے ۔ تم کو اتنا تو معلوم ہی نہیں کہ معاملہ کس کو کہتے ہیں اور مقدمہ کس جانور کا نام ہے ۔ میں تو زبان دے چکا ہوں اور بد عہدی کسی شریف آدمی کا کام نہیں ، اس لیے چند تہہ کی باتیں تم کو سمجھاتا ہوں ۔ کوتوالی کی تحقیقات کو تو عدالت میں کوئی پوچھتا تک نہیں ۔ روداد ہی معتبر ہے جو عدالت کی مثل میں ہو ۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ کوتوالی کے لوگ زبانی

پوچھ گچھ کے سوا کسی کا اظہار تک قلم بند نہیں کر سکتے
اصل بات یہ ہے کہ پہلے کوتوالی اور فوجداری ایک تھی
جب یہ لوگ لگے اظہار کارگزاری کے لیے ہر واردات بے سر
کے لیے مجرم بنانے، اور اصل مجرموں سے سازش کر کے بے گناہ
کو ناحق پھنسانے، تو سرکار نے کوتوالی اور فوجداری
الگ کر دیا۔ اب تو کوتوالی والوں کا اتنا ہی اختیار
کہ جس کو اپنے نزدیک مجرم سمجھیں حاکم عدالت کے
چالان کر دیں۔ حاکم عدالت مدعی اور مدعا علیہ، گواہوں
اظہار قلم بند کرتا ہے اور اپنے یہاں کی روداد پر سزا یا
کرتا ہے۔ کوتوالی والے اناپ شناپ جس کو پکڑ پاتے
چالان کر دیتے ہیں۔ عدالت میں گئے اور رہا ہوئے
ہمارے صاحب مجسٹریٹ کوتوالی سے اس قدر بدظن ہیں
مجسٹریٹی کا اجلاس کرتے ہوئے پورا برس نہیں ہوا، اتنے
دنوں میں کوتوالی والوں سے جیل خانہ بھر دیا۔ غ
کوتوال اور ان کی تحقیقات کی تو کچھ بھی حقیقت نہ
اب رہ گئی مقدمے کی روداد۔ سو اس کا حال یہ ہے کہ سنا
حقیقت میں پکڑی گئی ہریالی کے یہاں، بس مدعا علیہ
ہوئی ہریالی اور پہلے اسی پر اشتباہ کیا جائے گا کہ اسی
فیریٹی میں ڈالی یا ڈلوائی۔'' مبتلا ''بھلا وہ کم بخت بدنص
کس کو سنکھیا دینے اٹھی تھی؟ اپنے تئیں یا مجھ کو
اپنی ماما کو جو سال ہا سال سے نوکر ہے اور کبھی اس
پھٹے منہ تک نہیں کہا، یا اپنے پالے ہوئے جانوروں کو ج
وہ بچوں کی طرح عزیز رکھتی ہے؟'' ناظر ''جانوروں کی
بات الگ ہے، لیکن دوسرے احتمالات میں تو کوئی استبعا
بات نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے سنکھیا کھانے کا

کیا ہو ؛ عورتیں اکثر خود کشی کر بیٹھتی ہیں یا تم کو اس نے زہر دینا چاہا ہو تو عجب نہیں۔ بازاری خلقت کا بھروسا کیا ، خدا جانے اس نے کیا سمجھ کر تم سے نکاح پڑھایا اور اب جو اس کی مراد بر نہ آئی تو اس نے اپنا پنڈ چھڑانے کے لیے یہ تدبیر کی ۔ اگر وہ اپنی حالت سابقہ پر عود کرنے کی آرزو مند ہو تو اس سے کچھ دور نہیں ۔ ماما تم خود کہتے ہو کہ اس کے پاس مدت سے ہے ، تو ضرور اس کے پچھلے حالات سے بخوبی واقف ہوگی اور عداوت کے لیے اتنی بات کافی ہے ، اور سنکھیا کے لیے تمھاری اور ہریالی کی ماما کی کیا تخصیص ہے ، معصوم سارے سارے دن ہریالی کے یہاں رہتا ہے ، وہ یقیناً اس کی جان کی دشمن ہے ۔ ان کے علاوہ ایک احتمال اور ہے اور وہ سب میں زیادہ قرین قیاس ہے کہ آپا کے پھنسانے کے لیے یہ سارا منصوبہ سوچا گیا ہے ورنہ سبب کیا کہ جانوروں تک کو فیرینی کھلائے اور آپ منہ تک نہ لے جائے اور بد ذات نے کیا چالاکی اور بے رحمی کی ہے کہ بے زبان جانوروں کو تو اتنی فیرینی نہسائی کہ ایک نہ بچا اور لہو لگا شہیدوں میں داخل ماما کو بھی ذرا سی چٹا دی کہ دو چار دست آ کر اچھی خاصی کی خاصی ۔'' مبتلا ''ہاں ! لیکن کیا گھوسن کی گواہی پر کچھ لحاظ نہ ہوگا ؟'' ناظر ''کیا معلوم کہ عدالت تک پہنچتے پہنچتے گھوسن اپنے بیان پر قائم بھی رہتی ہے یا نہیں؟ اور فرض کرو قائم رہے تو اس نے تو سنکھیا کا نام تک بھی نہیں لیا، بلکہ میری نظر سے دیکھو تو گھوسن کا بیان ہریالی کے حق میں سم قاتل ہے ۔ وہ کہتی ہے کہ خاتون نے مجھ کو دودھ کی ہنڈیا واپس کر دی ۔ بہت خوب ، ہریالی نے جب یہ سن لیا تھا کہ بڑے گھر سے دودھ برا سمجھ کر واپس کیا گیا تو اس نے چپ چپاتے ضرورت سے زیادہ بھری کی بھری ہنڈیا رکھ کیوں لی؟ بس

یہیں تو پانی مرتا ہے ۔ اس سے صاف شبہ ہوتا ہے کہ ہریا
نے گھوسن سے مل کر اسی کے گھر دودھ میں سنکھیا گھلوا
اور جب خاتون دھوکے میں نہ آئی تو دوسری چال چلی ، اور یہ
یہ بھی سمجھ لو کہ ہریالی اور تم دو نہیں ہو ۔ ہریالی کا کر
عین تمہارا کرنا ہے ، اور ابھی خاتون کے بیان کی تو نوبت آ
دو ، دیکھو تو وہ کیا زہر اگلتی ہے ۔ کوتوالی والوں کی کاروا
میں فی الواقع ہمیشہ ایک بڑا نقص یہ ہوتا ہے کہ تحقیقات سے پہلے
مقدمے کو کسی ایک پہلو پر ڈھال لے جاتے ہیں اور پھر باصر
اخیر تک اسی پہلو کی تائید میں لگے رہتے ہیں ۔ جو باتیں میں
نے تم سے سرسری طور پر بیان کی ہیں ان میں سے ایک کی طرف
بھی کوتوال صاحب کا ذہن منتقل نہ ہوا ہوگا اور ہم لوگو
کو تو باتیں حاکم کی میز پر سوجھتی ہیں ۔ عین وقت پر کچ
اس طرح کا بہرہ کھل جاتا ہے کہ خود بخود بات میں سے بات
نکلتی چلی آتی ہے ۔'' مبتلا کی ساری ہمت تمام عمر رہی مصروف
حسن و عشق میں ، مدعی اور مدعا علیہ بننا درکنار اس کو کبھی
گواہی دینے کا بھی اتفاق نہیں پڑا ۔ بچپن کا لاڈلا ، جوانی کا چھیلا
وہ وکیلوں کے چھل فریب کیا سمجھے ۔ ناظر نے جو الٹی سیدھی
باتیں سمجھائیں ، چھکے ہی تو چھوٹ گیے اور سمجھا کہ بس اب
نہیں بچتا ۔ سنکھیا کا غصہ ، ہریالی کا رنج ، اپنی چوٹ ، اگلے پچھلے
گلے شکوے ، سب کچھ بھلا بسرا ناظر کے گلے سے لپٹ گیا کہ
''بس اب اوپر خدا ہے اور نیچے تم ؛ چاہو مارو چاہو جلاؤ
چاہو اُجاڑو چاہو بساؤ ۔'' ناظر ''مقدمہ تو میری طرف آیا گ
ہوا ، اور سمجھو کہ مقدمے کا میں بیمہ لے چکا ، خرچ کا بندوبس
تم کرو ۔'' مبتلا ''خرچ کا بندوبست بھی تمھی کو کرنا پڑے گ
تم کو تو ہر گھر کا ذرا ذرا حال معلوم ہے ۔'' ناظر ''کیا مضائقہ

خرچ کا بھی انتظام ہو جائے گا ، مگر آخر دینا تو تمھی کو پڑے گا ۔'' مبتلا ''کوڑی کوڑی ۔'' ناظر ''خیر تو آپ دو رقعے میرے نام لکھیے ۔ ایک تو کل کی تاریخ میں ـــــ کہ چوھوں کی جیسی کثرت ھے تم کو معلوم ھے ، اب تو یہ نوبت پہنچتی ھے کہ کھونٹیوں پر لٹکے ھوئے کپڑے کاٹ کاٹ کر ٹکڑے کیے ڈالتے ھیں ۔ ناچار تھوڑی سنکھیا منگوائی ۔ پڑیا چھوٹے گھر کے بیچ والے دالان میں اس خیال سے کہ کسی کا ھاتھ نہ پڑے اونچے پر رکھوائی تھی ۔ یہ ذکر کوئی سات یا آٹھ دن پہلے کا ھے ۔ کل کیا اتفاق ھوا کہ شام کے وقت ایک روپے کی کھانڈ کا پڑا آیا اور جیسا دستور ھے پڑے کے ساتھ تمونے کی پڑیا ۔ سنکھیا کا تو خیال نہ تھا ، کھانڈ کا پڑا اور پڑیا دونوں کو اسی طاق میں رکھوا دیا جس میں سنکھیا کی پڑیا تھی ۔ آج خود گھر والی نے اپنے ھاتھ سے فیرینی میں کھانڈ ڈالی تو انھوں نے کہا پڑیا کی کھانڈ بھی کیوں ضائع ھو ، پڑا اور پڑیا دونوں اتارتی لائیں ، مگر پڑیا سنکھیا کی تھی ۔ باورچی خانے میں بھی دھوئیں کی وجہ سے کچھ دکھائی نہ دیا اور چونکہ دل میں کسی طرح کا کھٹکا نہ تھا انھوں نے دیکھا بھی نہیں ۔ فیرینی پک کر تیار ھوئی ، تو تھوڑی جانوروں کو دی جو گھر والی نے اپنے شوق کے لیے پال رکھے ھیں اور جو دیگچی میں لگی رہ گئی تھی ماما نے پونچھ کھائی ۔ جانور تو مرگئے ، ماما کو کچھ دست آئے ، مگر بچ گئی ۔ کوتوالی کے لوگ مقدمے کو طول دینا چاھتے ھیں ، تم مختارکارانہ اس کی خبر گیری کرو ـــــ اور دوسرا رقعہ اب سے مہینے سوا مہینے ، جتنے دن پہلے کا چاھو لکھ دو ـــــ کہ مجھ کو اتنے روپے کی ضرورت ھے جہاں سے بن پڑے بندوبست کر دو ـــــ بس اللہ اللہ خیر صلاح اور چیں سے پیر پھیلا کر سو رھو ۔ سنکھیا کے

رقعے کا مضمون سن کر تو مبتلا کی عقل دنگ رہ گئی اور سمجھا کہ ''ناظر بھی بڑا زہر کا بجھا ہوا ہے ۔ دیکھو تو کیا مغز سے بات اتاری ہے ! ایسے شخص سے پار لے جا سکتا ہوں ! میرا بچاؤ تو اسی میں ہے کہ جو یہ کہے اس میں ذرا کان نہ ہلاؤں ۔ غرض اسی وقت دونوں رقعے لکھ ناظر کے ہاتھ دیے اور پوچھا کہ ''بھلا صاحب ! اب صبح کوتوال صاحب آئیں تو کیا کرنا ہوگا ؟'' ناظر نے کہا '' اب بندۂ درگاہ کے رہتے کوتوال صاحب کیا آتے ہیں ؟ آب[۱۳] آمد تیمم برخاست اور اگر آئے بھی تو کوتوال بن کر نہیں ، نڈھال بد حال سراپا اضمحلال ۔'' مبتلا ''اور کیوں صاحب ، جیسا اس کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا ، اگر اس نے انگریز کو جو کوتوالی کا افسر ہے لا کھڑا کیا ؟'' ناظر ''او ہم[۱۴] سگ زرد برادر شغال !'' باوجودیکہ ابھی جھٹ پٹا تھا ، ناظر فوراً سوار ہو سیدھا کوتوال کے پاس پہنچا ۔ کوتوال سمجھا کہ ایسے وقت آئے ہیں تو معلوم ہوتا ہے ضرور کچھ نہ کچھ بوھنی کرائیں گے ۔ دور سے ہنس کر بولا ، ''آئیے ! آج تو سویرے ہی سویرے اچھے سخی کے درشن ہوئے ۔ میں تو آپ کے یہاں آنے کو وردی پہن کر تیار لیس بیٹھا ہوں ۔ صاحب سپرنٹنڈنٹ سے سات بجے کا وعدہ ہے ۔'' ناظر '' کیا تیار بیٹھے ہو ، وہاں تو رات بڑا غضب ہو گیا ۔'' کوتوال ''کیا کوئی اور صاحب سنکھیا کھا کر شہید ہوئے ؟'' ناظر '' نہیں سنکھیا تو نہیں ، مگر آپ تو جانتے ہیں مبتلا بھائی کے گھر میں جو زہ

۱۳- پانی کی موجودگی میں تیمم کا حکم اٹھ جاتا ہے ۔ یعنی میرے ہوتے کوتوال کی کیا ضرورت اور کیا مجال !

۱۴- وہ بھی گیدڑ کا بھائی کتا—یعنی میں کوتوال کی طرح اسے بھی کچھ نہیں سمجھتا ۔

ری عورت ہے ، پورے دنوں سے تھی ؛ کل نہیں معلوم آپ
سپاہیوں نے اس کو کیا کیا ڈرایا دھمکایا ؛ طبیعت تو اس کی
کے رہتے ہی بگڑ چلی تھی ، آپ ادھر آئے ، شاید کوتوالی
نہ پہنچے ہوں گے کہ اس کا حمل ساقط ہو گیا ۔ ساری رات
کے تردد میں پلک نہ جھپکی ۔ خیر حمل تو حمل اب اسی کی
کے لالے پڑے ہیں ۔ دیکھیے وہ بھی بچتی ہے یا نہیں ۔ مبتلا بھائی
اس عورت کے ساتھ اس درجے کا تعشق ہے کہ جس وقت سے
اردات ہوئی ہے سارے گھر میں بولائے بولائے پڑے پھر رہے
۔ وہ تو ڈاکٹر چنبیلی کو بلاتے تھے ، میں نے بہ ہزار مشکل
کہ انگریزوں کے کان پڑی ہوئی بات پھر اپنے قابو کی نہیں
، ۔ ایک چھوڑ دو دو دائیاں بلوا دی ہیں ۔ بارے
کہیں جا کر کسی قدر طبیعت سنبھلی تو میں آپ کے پاس
ہوا آیا ۔ میں تو رقعہ لکھنے کو تھا پھر خیال آیا کہ خدا
کس کے ہاتھ پڑے ، آپ چل کر کہنا چاہیے ۔'' یہ کہنا
کہ کوتوال کو کاٹو تو بدن میں لہو کی بوند نہیں ؛
ادا کر بولا ''آپ کے یہاں ہم تابعداروں کی مجال ہے کہ
ں دھمکائیں یا کوئی خلاف قاعدہ کاروائی کریں ۔ آپ جس وقت
ف لائے ہیں ، آپ نے بھی دیکھا ہو گا کہ مردانے میں
دو ہی کانسٹیبل میرے ساتھ تھے اور وہ دونوں بے چارے
اصطبل کے پاس کھڑے تھے ۔ میں نے آپ کے آدمی وفادار
اتھ ماماؤں اور لونڈیوں کو بلا بلا کر ہولے سے دو دو باتیں
لیں ۔ اصل حقیقت تو یہ ہے ، اور ہم نے تو جس دن پولیس

۱ ۔ کوتوال کی لجاجت آمیز باتیں اور دیگر بزدلانہ حرکتیں اس کے
و منصب کے شایاں نہیں ، لیکن یہ کردار نگاری کی خامی نہیں ، بلکہ
ہے ، کیونکہ کوتوال بے چارہ ایک ایسی قوم (کایستھ) کا فرد ہے
حکمرانی اور سپہ گری کے کاموں سے کبھی کوئی واسطہ نہیں رہا ۔

میں نام لکھوایا اسی دن سمجھ لیا تھا کہ ایک نہ ایک دن ضرور قید ہوں گے ۔ یہ ایسی تیسی نوکری ہی اس قسم کی ہے ؛ کوئلوں کی دکان داری کہ بے کالا منہ ہوئے نہیں رہتا ۔ بڑوں[۱۶] کا کہا اور آنولے کا کھایا پیچھے مزہ دیتا ہے ۔ لالہ جی[۱۷] بہتیرا سر پٹکتے رہے کہ ہم لوگ ٹھہرے لکھنی[۱۸] چند ، ہم کو سپاہیوں کا بھیس سزاوار نہیں ۔ ہرکارے وہر مردے ۔ اس وقت ان کی بات کچھ دھیان میں نہ آئی ، سو اپنے کئے کی سزا پائی ۔'' ناظر ''یہ میں خوب جانتا ہوں کہ آپ نے کوئی بے جا کاروائی نہیں کی ہوگی ۔ آدمی کا حال چھپا نہیں رہتا ۔ سارا شہر آپ کا مداح ہے اور اگر آپ احتیاط نہ کرتے تو اتنے دن کوتوالی کا چلنا بھی محال تھا ، خصوصاً صاحب مجسٹریٹ حال کے وقت میں ، مگر عورتیں تو جیسی ڈرپوک اور کچے دل کی ہوتی ہیں آپ خوب جانتے ہیں ۔ آپ کا آنا ہی سن کر اُن کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے ہوں گے اور پھر کسی سپاہی نے کوئی ایک آدھ بات بھی کہہ دی ہوگی ، حالت تو نازک تھی ہی اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہوگیا ۔ چھوٹے گھر میں تو خیر ایک واردات بھی ہوئی تھی کہ جانور مرے ، ماما کو دست آئے ، فیرینی میں سنکھیا نکلی ؛ بڑا گھر جس کو واردات سے کچھ بھی تعلق نہیں ، وہاں کیا حال تھا ، جا کر دیکھتا ہوں تو چولھا تک نہیں سلگا ۔

۱۶- آنولہ بد مزہ اور کسیلا ہوتا ہے ، لیکن اُسے کھا کر پانی پینے سے مٹھاس محسوس ہوتی ہے ، نیز اس کا استعمال مفید صحت ہے ۔ اسی طرح بزرگوں کی نصیحت بھی پہلے کڑوی لگتی ہے بعد میں کارآمد ثابت ہوتی ہے ۔

۱۷- کوتوال صاحب کے باپ ۔

۱۸- یعنی ہم لوگ آبائی پیشے کے لحاظ سے قلم گھسنے والے کلرک ہیں ۔ کایستھوں کا پیشہ صدیوں سے دفتری ملازمت یا منشی گری رہا ہے اور اُن کے بعض ناموں میں 'چند' آتا ہے جیسے پریم چند ، مول چند وغیرہ ، اسی مناسبت سے لکھنی چند کی ترکیب وضع کی گئی

وہ تو جب میں نے سمجھایا کہ یہ کیا اس سے بڑی بڑی اتفاق اور ناگہانی وارداتیں ہو جاتی ہیں اور آخر کار مقدمہ داخل دفتر ، تب سب کو تسلی ہوئی ۔ کوتوال ''اتفاق کیسی ؟'' تب ناظر نے مبتلا کا رقعہ دیا کہ وہ خونی دروازے میں جو ایک شخص نے اپنی آشنا کو دھتورا کھلا کر مار ڈالا تھا اور شاید آپ ہی نے اس مقدمے کی بھی تحقیقات کی تھی ، کل اس کی پیشی تھی اور میں مدعا علیہ کا وکیل تھا ۔ آپ کے اسسٹنٹ سوپرنٹنڈنٹ بھی سرکار کی طرف سے پیروی کے لیے موجود تھے ۔ بڑے بڑے مباحثے رہے ، آخر ساڑھے چار بجتے بجتے مدعا علیہ کی رہائی ہوئی ۔ ہاں تو یہ رقعہ مجھ کو عین اجلاس پر ملا تھا اور اسی کو دیکھ کر میں کچہری سے سیدھا وہیں چلا گیا ۔ کوتوال نے رقعہ پڑھا تو مقدمے کی طرف سے بھی اس کی آس ٹوٹ گئی ۔ کمر سے کرچ کھول ناظر کے پیروں پر رکھ دی کہ نوکری تو یہ حاضر ہے ، خدا واسطے کو ایک اتنا سلوک کیجیے کہ عزت پر ہاتھ نہ ڈالیے ۔ ناظر نے بہت تسلی کی کہ ''بھلا اتنا تو سمجھیے کہ اگر میرے دل میں کچھ فساد ہوتا تو میں اس قدر سویرے اندھیرے منہ آپ کے پاس دوڑا ہوا کیوں آتا ؟ خیر جو کچھ ہونا تھا سو ہوا ۔ جس طرح بن پڑے گا مبتلا بھائی کو سمجھا لوں گا ۔ جب سے انھوں نے دوسری عورت کر لی ہے ذرا تنگ دست رہتے ہیں ۔ یہی نا کہ دوا درمن کا خرچ اور اوپر سے سو دو سو روپیہ اور ان کو دے دیا جائے گا ، اور ہاں سنکھیا کے مقدمے میں آپ کچھ زیادہ چھیڑ چھاڑ نہ کیجیے گا ۔ اس میں کچھ ہونا ہوا نا بھی نہیں ۔'' ناظر چلنے لگا تو کوتوال نے کہا ''پھر اس کرچ کو تو آپ اپنے ہاتھ سے باندھ دیں گے تو میں کمر سے لگاؤں گا ، ورنہ جہاں پڑی ہے ، پڑی رہے

گی ۔'' ناظر نے جلدی سے کرچ اٹھا بسم‌اللہ کر کے کوتوال کی کمر سے باندھی ، گویا اپنی طرف سے کوتوالی دی ۔ کوتوال نے کہا ''بس اب ہاتھ پکڑے کی لاج آپ کو کرنی ہو گی ۔'' صاحب سپرنٹنڈنٹ کو وہاں ایک اور ضرورت پیش آ گئی کہ کسی انگریز کے یہاں سوڈا واٹر کی ایک دو بھی نہیں اکٹھی آدھی درجن[۱۹] بوتلیں چوری ہوگئیں ۔ صاحب نے چٹھی لکھی اور سپرنٹنڈنٹ صاحب اس کی تحقیقات کو بھاگے گیے ۔ کوتوال سے کہلا بھیجا ہمارا آنا نہیں ہو سکتا ۔ پھر کوئی پندرہ بیس دن بعد خود سپرنٹنڈنٹ صاحب ہی کو خیال آیا تو پوچھا ''کیوں کوتوال صاحب ؛ وہ کس وکیل صاحب کے یہاں کی زہر خورانی کا آپ نے تذکرہ کیا تھا ، اس کا کیا ہوا؟'' کوتوال نے کہا ، ''حضور ! فدوی نے تو اگلے ہی دن ۲۲ ۳ نمبر کا روز نامچہ خاص بھیج دیا تھا کہ واردات اتفاقی ہے ، بات رفت و گزشت ہوئی ۔'' دو چار دن تو مبتلا کو کھٹکا رہا ؛ پھر اس نے دیکھا کہ کوتوالی والوں میں سے کسی نے آ کر بھی نہ جھانکا تو اس کو یقین ہوا کہ ناظر کو حکام کے مزاج میں کچھ اس طرح کا درخور ہے کہ آج جو چاہے سو کر گزرے ۔ ناظر نے اس مقدمے میں اچھی برد ماری ، ہزار روپے تو چپکے سے اس نے وہ اگلوا لیے جو خاتون کٹنی غیرت بیگم کو بہکا پھسلا کر لے اڑی تھی ، اور رقعے کے بدلے مبتلا سے اس کے حصے کی دکانوں کا قطعی بیع نامہ اپنے نام لکھوا لیا ، اور پھر سب میں سرخرو ۔ اب بیچارے مبتلا کے پاس پینسٹھ روپے ماہوار کی جگہ صرف ستائیس روپے مہینے کی نری تنخواہیں رہ گئیں ، وہ بھی کس طرح

---

۱۹ ۔ انگریزی اقتدار پر گہرا طنز ۔ سوڈے کی بوتلیں صاحب بہادر کی تھیں، اس لیے ان کی چوری ، زہر خورانی سے زیادہ سنگین واردات تھی کہ خود سپرنٹنڈنٹ صاحب بھاگے بھاگے پھر رہے تھے

کی کہ کوئی چھٹے مہینے آدھی پاؤ وصول ہوئی تو کوئی برس بھر بعد اور کوئی مار میں بھی آ گئی ، اور غیرت بیگم کی یہ تاکید کہ بھلا کوئی ایک لوٹا پانی تو اس کے گھر میں سے مبتلا کو دے دیکھے ۔ غیرت بیگم کے یہاں پہلے ہی مبتلا کی کون سی قدر کی جاتی تھی ، اب جس دن سے یہ معاملے مقدمے کھڑے ہوئے ، رہا سہا اور بھی نظروں سے گر گیا ۔ پہلے بے رخی تھی ، رفتہ رفتہ بد مزاجی ہوئی ؛ بد مزاجی سے بد دماغی کی نوبت پہنچ گئی ، بلکہ طرز مدارات سے ایسا مستنبط ہونے لگا کہ سید حاضر نے جو ایک دن بیچ کے آنے کا معمول باندھ دیا تھا ، اب مبتلا کا اتنا آنا بھی گوارا نہیں ۔ غیرت بیگم کو مبتلا سے بات چیت کیے ہوئے برسوں گزر گیے تھے ۔ لونڈیاں مامائیں میاں کا اتنا لحاظ کرتی تھیں کہ باری کے دن بچھونا صاف کر دیا ؛ جب تک گھر میں بیٹھے حقے کی خبر رکھی ، کھانے کو پوچھ لیا ، اور اب مقدموں کے بعد سے تو ان باتوں میں بھی مضایقہ ہونے لگا ۔ مبتلا لا کھ گیا گزرا تھا ، مگر آخر تھا تو صاحب خانہ ؛ یہ بے وقری دیکھ کر وہ بڑے گھر کی باری کو تپ و لرزہ کی باری سے کم نہیں سمجھتا تھا ، مگر حاضر ناظر سے اس قدر ڈرتا تھا جیسا مردہ نکیرین سے ؛ نا خواستہ دل آتا اور برخاستہ خاطر رہتا ۔ ایسی ایسی سنگین وارداتیں گھر میں ہو جائیں اور کسی کی نکسیر تک نہ پھوٹے ۔ غیرت بیگم اور بھی بے محابا ہو کر لگی بادل کی طرح گرجنے اور بجلی کی طرح کڑکنے ۔ سقہ اور دھوبی اور حلال خور وغیرہ جتنے اہل خدمت تھے ان تک کی بندی ہو گئی کہ چھوٹے گھر کا کام نہ کرنے پائیں ۔ ناچار گلی کی طرف کا قدیم دروازہ جو مدتوں سے بند تھا ، تیغا توڑ کر کھولا تب کام چلا ۔

چوبیسویں فصل

مبتلا اور ہریالی کا بگاڑ

جب تک باتوں کا زبانی جمع و خرچ رہا کہ غیرت بیگم نے اپنے گھر میں کوس کاٹ لیا اور ہریالی نے اپنی جگہ پکار پکار کر نہیں تو چپکے سے جو کچھ منہ میں آیا کہہ دیا ، تب تک اگر سچ پوچھو تو ہریالی کی جیت تھی، کیونکہ مبتلا اس کے پلے پر تھا اور آمدنی کے حساب سے دونوں گھر برابر سرابر - اب جو پینسٹھ کے رہ گئے ستائیس تو اس کا ایمان ڈگمگا چلا اور مبتلا سے کہا ، ''اُدھر اکیلے گھر میں ساٹھ اور ادھر مردانہ زنانہ دو گھروں میں پینسٹھ ، نگوڑا پانچ روپے کا بل - خدا جانے میں کیا کتربیونت کرتی تھی کہ خیر گزر ہوئی چلی گئی - تم اپنے ہاتھ میں خرچ رکھتے ہوتے تو حقیقت کھلتی ، اور میں تمہارے بڑے گھر میں جاتی نہیں تو آخر سنتی تو ہوں کہ آدمیوں کو ابالی دال ملتی ہے اور وہ بھی ایک وقت - بچوں کو سودا سلف تو درکنار کبھی آدھی کے چنے لے کر دینے نصیب نہیں ہوئے - اب تم نے پینسٹھ کے ستائیس کرائے ہیں تو تم ہی خرچ کا انتظام بھی کرو - میں کوئی اپنی بوٹیاں کاٹ کاٹ کر تو کھلانے سے رہی -'' مبتلا ''پینسٹھ کے ستائیس میں نے کرائے ہیں ؟'' ہریالی ''جانے بلا ، تم نے کرائے ہیں یا انھوں نے جو تمہارے

کچھ لگتے ہیں ۔'' مبتلا ''تم ہی نے فیرینی پکا کر بیٹھے بٹھا ۔ سارا فساد برپا کیا اور اُلٹا مجھ کو الاھنا دیتی ہو ۔'' ہریالی ''مجھے خبر تھی کہ دشمنوں نے دودھ میں سنکھیا گھول کر میری جان کے لینے کا سامان کیا ہے ؟'' مبتلا ''اسی کا تو پتا نہ چل سکا کہ کس نے دودھ میں سنکھیا گھولی ۔'' ہریالی ''تو کیا میں نے گھولی ؟'' مبتلا ''تم نے گھولی تو نہیں، مگر تم پر تھپ تو گئی ۔'' ہریالی ''تم نے تھپوائی تو تھپی ۔'' مبتلا ''یک نشد دو شد ۔ مہینہ میں نے کم کرایا ، سنکھیا کا الزام میں نے تم پر لگایا ، میں ہی برا ہوں تو خدا برے کو موت دے !'' ہریالی ''خدا نہ کرے تم کیوں برے ہونے لگے ، بری میں کہ تمہارے کارن گھر چھوڑا ، آرام چھوڑا ؛ اس کا یہ انعام ملا کہ تمہارے یہاں آ کر کوسنے سنے، گالیاں کھائیں ، بے عزتی کا کوئی درجہ باقی نہ رہا؛ دو دفعہ جان کا خطرہ[1] اٹھایا ۔'' مبتلا ''تم کو معلوم تھا کہ میرے بی بی بچے ہیں پھر نہ آئی ہوتیں ۔ کسی نے زبردستی کی تھی ؟ اور اب تمہارا جی چاہے تو اب چلی جاؤ ۔ تم سے کسی نے کچھ چھین تو نہیں لیا ۔'' ہریالی ''ہاں ہاں میں کیا مکرتی ہوں ، میں تمہاری بی بی کو جانتی تھی اور بچوں کا ہونا بھی معلوم تھا ، مگر مجھے خبر نہ تھی کہ تم اس طرح کے حیز ہو کہ ناظر کی صورت دیکھنے سے تمہارے ہوش باختہ ہوتے ہیں ، اور میں اگر جاؤں گی اور جاؤں گی نہیں تو کیا مفت میں اپنی جان گنواؤں گی ، تو ناظر کو جو وکالت کے گھمنڈ میں بہت اکڑا ہوا پڑا پھرتا ہے ، اور اس مکار حاضر کو جو ہر مرتبہ

۱- یعنی ایک بار غیرت بیگم ۔ مارتے مارتے ادھموا کر دیا تھا اور دوسری بار اس کا حمل ساقط ہو گیا ۔

بڑا مولوی بن کر وعظ کہنے کو آ بیٹھتا ہے ، اور تیری بھینا[۲] کوتوال کی جورو[۳] کو ، اور اس موئے کوتوال کو جس نے رشوتیں لے لے کر خون کے مقدموں کو ملیا میٹ کیا ہے اور سب کے ساتھ تجھ کو دنیا جہان میں الم نشرح کر کے جاؤں گی - میرا جانا کیا ایسا ہنسی ٹھٹھا ہے - میں نے تیرے پیچھے اپنے تئیں خاک میں ملا دیا اور آج تو نے اس کا یہ پھل دیا ؛ لے اب دیکھ میرا تماشا - تیرا تو کیا منہ ہے ، مگر بلا اپنے حمایتیوں کو کہ مجھے جاتی کو روکیں ! " یہ کہہ کر ہریالی کھڑی ہو سیدھی دروازے کی طرف چلی - بارے مبتلا نے ساری عمر میں ایک یہ بہادری تو کی کہ اس کو کوٹھری میں دھکیل جھٹ اوپر سے کنڈی لگا دی - ایں کار[۴] از تو آید و مرداں چنیں کنند - مبتلا تو ہریالی کو کوٹھری میں بند کر باہر چلا گیا ؛ ہریالی کے پاس جو پرانی ماما تھی وہ تھی ایک طرح کی اس کی کٹنی - اس نے ہریالی کو سمجھایا "بی بی مرد کا مزاج دیکھ کر بات کی جاتی ہے - اس کم بخت پر تو آپ ہی مصیبتیں پڑی ٹوٹ رہی ہیں ، تم اور چلیں گھاؤ میں اوپر سے مرچیں لگانے ، تھوڑے دن صبر کیا ہوتا - وہ اپنے تئیں بیچتا ، چوری کرتا کہیں نہ کہیں سے تمہارا بھرنا بھرتا اور اگر تمہاری مرضی جانے

۲- بھینا - بہن کی تصغیر - پورب میں اس طرح نہیں بولتے - ہریالی کے مکالموں میں مصنف نے لکھنؤ اور دھلی کی بول چال کا فرق ملحوظ نہیں رکھا-

۳- مراد غیرت بیگم - انتہائی غصے کے عالم میں سوکن کا نام لینا بھی گوارا نہیں - اسے مبتلا کی بہن اور کوتوال کی جورو کہہ کر گالی دیتی ہے -

۴- یہ کام تجھ ہی سے بن پڑے گا اور جواں مرد ایسا ہی کرتے ہیں— مبتلا کی اس کارگزاری کو طنزاً سراہا گیا ہے -

۵- یعنی تمہیں ہر بات کا حق پہنچتا ہے یا حق حاصل ہے -

کی ہوگی تو اس کی سو راہیں ہیں ۔ ڈھنڈورا پیٹنا اور ڈھول بجانا کیا ضرور ہے ۔ ادھر پان کے بہانے مبتلا کے پاس گئی اور اس سے کہا ''میاں برا کہو ، فضیحتی کرو ، سب تم کو پہنچتا ہے ، پر منہ بھر کر یہ کہہ بیٹھنا کہ چلی جا ، تم ہی انصاف کرو ، بڑی سخت بات ہے ۔ خیر غصہ حرام ہوتا ہے ۔ میاں بی‌بی کی لڑائی کیا اور میاں بی‌بی بھی تم جیسے کہ وہ تمھاری عاشق‌زار اور تم اس پر دل و جان سے نثار ۔ اٹھو گھر میں چلو ۔ بیوی کی بھی روتے روتے ہچکی بندھ گئی تھی ؛ اب میں نے اٹھا کر زبردستی پانی پلایا ہے ۔

پچیسویں فصل

مبتلا کی خانہ داری دونوں بیبیوں کے ساتھ کس طرح پر تھی

مبتلا اور ہریالی کی یہ لڑائی تو خیر اتفاق بات تھی ، مگر دیکھنا چاہیے کہ ان میں باہمی ارتباط کس درجے کا تھا ۔ دونوں نے ایک دوسرے کے سمجھنے میں غلطی کی ۔ ہریالی نے سمجھا تھا کہ یہ آدمی ہے حسن پرست ، بیوی اس کو بھائی نہیں اور مجھ پر ہو رہا ہے لٹو ، میں گئی نہیں اور اس کی بیوی سے تڑا چھڑا اپنے کھونٹے سے باندھا نہیں ۔ یہاں آ کر دیکھا تو بیوی کو میاں کا خصم پایا کہ وہ اس کو اس طرح لپٹی ہے جیسے مکھی کو شہد ۔ یہ بہتیری کوشش کرتا ہے کہ اس سے چھوٹ جاؤں ، مگر اور لتھڑتا چلا جاتا ہے ۔ چاہئے تھا کہ مجبور مجھ کر معذور رکھے ؛ خود غرضی جبر و اختیار میں فرق کرنے نہیں دیتی تھی ۔ وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا اور یہ جانتی تھی کہ اپنے ہیٹے پن سے خود نہیں کرتا ۔ وہ واری اور قربان تھی جب تک توقع میں جان تھی ، نا امیدی کا پیدا ہونا تھا کہ صاف ہتے سے اکھڑ گئی ۔ مبتلا تو اول دن سے حسن صورت کے پیچھے ایسا فریفتہ تھا کہ خوب صورتی کے آگے

حسب نسب ، سلیقه هنر ، عقل ، نیکی ، دین داری کسی چیز کو
ذیکھتا هی نه تھا ۔ بیوی سے تھی اس کو نفرت ؛ چوٹوں کی طرح
دو چار بار رات کو هریالی کے یہاں گیا آنکھوں میں کھب گئی ۔
نه انجام سوچا ، نه عاقبت کار پر نظر کی ، گھر میں لا بٹھایا ۔
مبتلا کے دل کو جو اچھی طرح سے ٹٹول کر دیکھا تو گھر میں آئے
پیچھے هریالی کی طرف اس کا اگلا سا رخ نه تھا ۔ اول تو اس نے
هریالی کے جانچنے اور آنکنے هی میں غلطی کی تھی ۔ اس میں
شک نہیں که هریالی خوب صورت تھی ، مگر نه اس درجے کی که
مبتلا جیسا حسین آدمی اس پر مفتون هو ۔ یونیورسٹی کی ڈگریاں
اگر خوب صورتوں کو ملتی هوتیں تو هریالی هماری نظر میں اس
سرے بس ایف ۔ اے کے قابل تھی ، مگر مبتلا تو اس کو نکاح سے
پہلے ایم ۔ اے کے درجے میں سمجھتا تھا ۔ دوسری ایک وجه
یه بھی هوئی که هریالی کو ویسا بناؤ سنگار نه تو اب میسر تھا
اور نه اس کا موقع تھا اور سب سے بڑا سبب تو همارے
سمجھنے میں یه تھا که کیسی هی کوئی نعمت کیوں نه هو
اس کی قدر طلب تک رهتی هے ؛ حاصل هوئی اور اس کی
منزلت گھٹی ، یہاں تک که رفته رفته انسان کو اس کا احساس
بھی باقی نہیں رهتا که یه نعمت کچھ نعمت بھی هے یا نہیں ۔
اگر غیرت بیگم کو ذرا بھی عقل هو که خدمت اور اطاعت
سے میاں کو اپنا کرنا چاهیے تو هریالی کی اتنی بھی قدر نه هو؛
یه اپنی صورت کو آئینه لیے بیٹھی چاٹا هی کرے اور اندر باهر
غیرت بیگم هی غیرت بیگم رهے ، مگر وه چال بری چلی ۔
اس نے چاها نکتوڑوں سے ، دباؤ سے ، بھائیوں کی حمایت سے
مبتلا کو زیر کرنا ۔ دل پھٹتے گئے اور طبیعتیں هٹتی گئیں ۔
هریالی نے پایا میدان خالی ، مبتلا کے دل میں جگه کر لی ؛

نہ خوب صورتی کے برتے پر، بلکہ سلیقے اور رضا جوئی کے بل پر۔ غیرت بیگم کے جھگڑے مبتلا کو چین تو لینے دیتے ھی نہ تھے، وہ ھریالی کی خوشی کیا مناتا ۔ دونوں میں میل جول رھا، مگر عاشقی معشوقی کا سا نہیں، بلکہ جیسا کہ عام طور پر میاں بیبیوں میں ھوا کرتا ھے ۔

چھبیسویں فصل

مبتلا نے تنگ ہو کر دونوں گھروں میں رہنا چھوڑا اور اس کی حالت یوماً فیوماً ردی ہوتی گئی، یہاں تک کہ ایک دن مر کر رہ گیا

جس شخص کی پینسٹھ کی آمدنی جا کر ستائیس کی رہ جاے اور وہ بھی غیر مقرر، اس کے دل سے پوچھنا چاہیے کہ اس پر کیا گزرتی ہوگی۔ تواتر مصائب اور ہجوم افکار نے مبتلا کو اس قدر تنک مزاج کر دیا تھا کہ دنیا کی کوئی چیز اس کو بھلی نہیں لگتی تھی۔ اس کو ہریالی کی لڑائی کا ایک بہانہ مل گیا اور اس نے دونوں گھروں کا جانا قاطبۃً موقوف کر دیا۔ سارے دن رات اٹوانٹی کھٹوانٹی لیے اکیلا مردانے میں پڑا رہتا تھا۔ نہ خود کسی کے پاس جاتا اور نہ اپنے پاس کسی کے آنے کا روادار ہوتا۔ اگر اتفاق سے کوئی آ نکلتا تو اس کی طرف مطلق ملتفت نہ ہوتا۔ اس رنج نے اس کو رہا سہا اور بھی اچھور کر دیا کہ دو دشمن اس کے اور تیار ہوئے، ناظر سے بڑھ کر معصوم اور غیرت بیگم سے زیادہ بتول۔ مبتلا اپنی طرف سے بہتیرا دونوں کو لپٹتا تھا، مگر یہ دونوں اتنا بھی نہیں جانتے تھے کہ ہمارا باپ ہے۔ جب سے ہوش سنبھالا باپ کو سنا برا برا، پس دونوں کے ذہن میں اس کی برائی ایسی راسخ ہو گئی تھی کہ

ابا یا باوا یا باپ کہنا کیسا دونوں خاصی طرح نام لیتے تھے ؛ معصوم گالی کے ساتھ اور بتول کوسنے کے ساتھ ۔ مبتلا نے جب دونوں گھروں سے ملول ہو کر مردانے میں رہنا اختیار کیا تو اس نے یہ خاصی تدبیر سوچی تھی اگر ہو سکے تو معصوم اور بتول دونوں کو ورنہ اکیلے معصوم کو خالی بیٹھا ہوا پڑھاؤں اور اسی طرح اپنا جی بہلاؤں ، مگر معصوم پٹھے[1] پر ہاتھ تو دھرنے ہی نہیں دیتا تھا ۔ مردانے مکان میں کب رونق تو ہریالی کے ساتھ آ چکی تھی ، اب تھوڑے ہی دن میں خاک اڑنے لگی ۔ جس مکان میں عمدہ اسباب کے اٹم کے اٹم لگے پڑے تھے اب اس میں کیا رہ گیا ، بانوں کے چند جھلنگے ۔ ایک کی چول ٹوٹی ہوئی ہے تو دوسرے میں ادوان نہیں ۔ کسی کی پٹی لچکی ہوئی ہے تو کسی کے سیروے میں جان نہیں ۔ شاید چھوٹی بڑی ملا کر چار یا پانچ چوکیاں وہ بھی بے جوڑ ، بوسیدہ ، بے مصرف ۔ نوکروں میں صرف ایک وفادار ، سو بھی کس طرح کہ یہاں سے تو اس کو کھانا تک نہیں ملتا تھا ، اور ملے کہاں سے دیں نہ دیں میاں ، سو میاں بے چارے کے پلے ٹکا نہیں ۔ دن کو مزدوری کرتا اور رات کو میاں کی پائنتی آ کر پڑ رہتا ۔ دنیا کا کوئی کام ، یا دین کا روزہ نماز ہو تو صبح و شام کا تفرقہ اور دن رات کا امتیاز ہو ۔ مبتلا کو سب وقت یکساں تھے ۔ اس کو سونے جاگنے کھانے پینے کسی بات کا کوئی وقت ہی مقرر نہ تھا ۔ جب دیکھو منہ اوندھائے چارپائی پر پڑا ہے ، معلوم نہیں سوتا ہے یا جاگتا ہے ۔ اپنی تباہی کا خیال ہے کہ کسی وقت دل سے نہیں جاتا ۔ جاگتا ہے تو اس کا سوچ ہے اور سوتا ہے

---

۱ ۔ یہ مثل گھوڑے کے حق میں کہی جاتی ہے کہ پٹھے پر ہاتھ تو دھرنے ہی نہیں دیتا نعل کیونکر لگائے جائیں* ۔

تو اسی کا خواب دیکھ رہا ہے ۔ وہ کبھی اپنے پچھلے وقتوں کو یاد کرتا اور اس کے چہرے پر ایک طرح کی بشاشت آجاتی ۔ تھوڑی دیر بعد خود بخود یکایک چونک کر ادھر اُدھر دیکھنے لگتا اور پھر اس کے منہ پر مردنی سی چھا جاتی ۔ غیرت بیگم اور اُس کے علاقہ داروں سے ، یہاں تک کہ اپنے بچوں سے تو اس کو مطلق نا اُمیدی تھی ۔ وہ خوب سمجھ چکا تھا کہ اب کسی حالت میں جیتے جی ان لوگوں سے صفائی کا ہونا ممکن نہیں ۔ رہ گیا قطع تعلق اس کے لیے چاہئے ہمت جرأت ، اور یہی باتیں اگر مبتلا میں ہوتیں تو یہاں تک نوبت ہی کیوں پہنچتی ۔ قاعدہ ہے کہ جس پر پڑتی ہے ، اسی کی طبیعت خوب لڑتی ہے ۔ رنجوں سے بچنے کا کون سا پہلو تھا جو مبتلا نے نہیں سوچا ، مگر جدھر جاتا تھا راہ نجات کو مسدود پاتا تھا ۔ مارے غم کے وہ اس قدر نحیف و ناتوان ہوگیا تھا جیسے کوئی برسوں کا بیمار ۔ شاید چھینکنے سے اس کو غش آتا اور کھانسی کے ساتھ اس کا سانس[۲] اکھڑ جاتا ۔ اللہ رے غیرت بیگم ! عورت ذات ہو کر اس قدر سخت دلی اور اس بلا کا غصہ کہ مبتلا گھلتے گھلتے چارپائی سے لگ گیا اور اس نے بھول کر بھی خبر نہیں لی ۔ ہریالی تھی تو رذالی پر خیر دکھاوا ، ظاہر داری ، جو چاہو سمجھو ، بیسیوں بار تو اپنی ماما کو بھیجا اور آخر خود گئی ۔ ہر چند منت خوشامد کی ، مگر مبتلا تو اپنی زندگی سے ہاتھ دھوئے بیٹھا تھا ، ذرا نہ پتیایا ۔ مبتلا خوب سمجھتا تھا کہ میں اس رنج سے جان بر نہیں ہو سکتا ۔ اختلاج قلب

---

۲ ۔ مذکر و مونث دونوں طرح جائز ہے ۔ اہل دہلی مذکر بولتے ہیں ۔

تو اس کو مہینوں سے تھا ، اب کسی کسی وقت میں ایک طرح کا ہلکا ہلکا درد بھی اٹھنے لگا ۔ تدبیر کچھ ہوئی نہیں دورے متواتر اور شدید ہونے لگے ۔ آخر ایک دن ادھر آفتاب ڈوبتا تھا ادھر یہ بے کس ، بے نصیب ، دل کے درد سے کھری چارپائی پر نہ تکیہ نہ بچھونا تڑپ تڑپ کر سرد ہو گیا ۔

ستائیسویں فصل

خاتمہ

ایک حسن پرستی کے پیچھے دنیا میں کیا کیا سختیاں اٹھائیں کہ خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے ۔ اپنا یا بیگانہ مرنا تو سبھی کا قابل افسوس ہے ، مگر نہیں تو مبتلا کا ۔ اس کا جینا قابل افسوس تھا اور مرنا قابل خوشی ، کیوں کہ مر کر وہ دنیا کی مصیبتوں سے تو چھوٹ گیا ۔ مصیبتیں تو اس کے دم کے ساتھ تھیں ، نہ مرتا اور مصیبت بھرتا ۔ پھر بھی ہم اس کے حق میں دعا کرتے ہیں کہ دنیاوی ایذائیں اس کے گناہوں کا کفارہ ہوں اور بیچارہ مصیبت کا مارا حسن صورت کا بہت فریفتہ تھا ، خدا اس کو جنت میں بہت سی حوریں دے ، بشرطیکہ غیرت بیگم اور ہریالی کی طرح آپس میں نہ لڑیں[1] ۔ عبرت کا مقام ہے ایک چھوڑ دو بیبیاں موجود ، بیٹا موجود بیٹی موجود ، بیبیوں کے نوکر چاکر موجود اور مرتے وقت منہ میں پانی ٹپکانے کو مبتلا کے پاس کوئی ۔ نہیں ، کہیں پہر رات گئے وفادار محنت مزدوری سے فارغ ہو کر آیا اور اس نے پکارا تو میاں کو مرا ہوا پایا ۔ چیخ اٹھا ۔ سارے محلے کو خبر

---

۱ - طنز و تمسخر کا یہ محل نہ تھا ، لیکن مصنف کی شوخئی طبع کہیں بھی باز نہیں رہتی ۔

ہوئی اور محلے والوں کے ساتھ محل کے لوگوں کو - ہریالی کو دیکھا تو وہ اور اس کی ماما اور اسباب سب ندارد - گھر میں جھاڑو دی ہوئی پڑی ہے - نہیں معلوم ایسا کون کالا چور اس کو بھگا کر لے گیا کہ پھر اس کا پتا نہ لگا - غیرت بیگم یا تو اس قدر میاں سے بگڑی رہتی تھی یا میاں کا مرنا سنتے ہی ایسا روئی اتنا پیٹی کہ بس جو بیوی میاں کی عاشق زار ہو گی وہ بھی اس سے زیادہ کیا روئے پیٹے گی - اب اس کو معلوم ہوا کہ میاں اس کا ظلم سہنے کے لیے سدا کو بیٹھا رہنے والا نہ تھا - وہ میاں کے مرنے پر اتنا نہیں روتی تھی جتنا اپنے ظلموں پر ، جن کی تلافی اب کچھ اس کے اختیار میں نہ تھی - روتے روتے دونوں آنکھوں میں ناسور پڑ گئے تھے اور ہتنی جیسا ڈیل ایسا سوکھا تھا جیسے کانٹا - مبتلا کی چھے ماہی بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ غیرت بیگم اسی رنج میں تمام ہوئی - مرتے مرتے وصیت کی کہ مجھ کو بتول کے باپ کی پائنتی دفن کرنا ، تاکہ اگر جیتے جی میں ان کے پاؤں نہ پڑ سکی تو خیر قبر میں ان کے پاؤں ہوں اور میرا سر - مبتلا کے مرنے پر تاریخیں اور مرثیے تو بہت لوگوں نے کہے ، مگر عارف کے مرثیے[۲] کے چند بند یاد

---

۲ - یہ نظم دراصل مسلمانوں کی تباہی اور قومی زوال کا مرثیہ ہے اور اپنے موضوع و خیالات کے اعتبار سے مولانا حالی کی شہرۂ آفاق مسدس سے ملتی جلتی ہے - نظم کے آخر میں دس بند مبتلا کے حسب حال بڑھا دئے گیے ہیں - اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں مصنف نے نظم کے بہت سے مصرعے بدل دئے ، ایک بند خارج کر دیا اور گیارہ بند نئے شامل کر لیے - ان تبدیلیوں کو حاشیے میں واضح کر دیا گیا ہے - بعد میں ۳۸ بند اور بڑھائے گیے جو کسی ایڈیشن میں درج نہیں ہیں - دسمبر ۱۸۸۸ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس لاہور میں نذیر احمد نے اپنی تقریر کے بعد پوری نظم سنائی تھی جو بعد ازاں ''اتمام حجت'' کے نام سے ایک رسالے کی صورت میں شائع ہوئی - نذیر احمد کی قومی نظموں کے مجموعے

رہ گئے ہیں وہ یہ ہیں :—

(اگلے صفحے پر ملاحظہ ہوں)

''نظم بے نظیر'' میں یہ نظم اسی عنوان سے پینتالیسویں نمبر پر درج ہے۔

گزشتہ صدی میں مولانا حالی کی مسدس کے بعد قومی شاعری کا ایک مستقل دور شروع ہوا اور حالی کے بعد شبلی اور نذیر احمد نے سب سے زیادہ قومی نظمیں لکھیں۔ جلسوں میں نذیر احمد کی تقریروں کی طرح اُن کی قومی نظمیں بھی، کچھ زور بیان اور کچھ اُن کی نظم خوانی کے دل کش و موثر انداز کی وجہ سے بہت پسند کی جاتی تھیں، لیکن نذیر احمد کو شاعر ہونے کا دعویٰ نہ تھا اور نہ کبھی انھیں شعراء کے زمرے میں شمار کیا گیا۔ اُن کی شاعری بھی ایک طرح کی منظوم خطابت ہے یا ان کی ذہانت اور طباعی کا ایک کرشمہ!

مرثیہ

دنیا عجیب مرحلۂ بے ثبات ہے
ہر ایک ذی حیات کو آخر ممات ہے

دن ہے تو دن کے بعد بلا شبہ رات ہے
جس کو فنا نہیں ہے وہی ایک ذات ہے

بیٹھی ہے موت تاک لگائے کمین میں
لے جائے گی یہ کھینچ کے آخر زمین میں

ایسا مکاں بتاؤ کہ بن کر گرا نہ ہو
پیدا ہوا ہے کوئی بشر جو مرا نہ ہو

ہے کوئی حال جس میں تغیر ذرا نہ ہو
حادث نہ ہو تو مدخل چون وچرا نہ ہو[1]

فانی ہر ایک چیز ہے فانی جہان ہے
مقصود اس فنا سے مگر امتحان ہے[2]

اعمال نیک ہیں تو زمرد کے ہیں قصور
خدمت کو لونڈیوں کی جگہ دست بستہ حور

---

۱ - پہلے ایڈیشن میں اس کی جگہ یہ مصرع چھپا ہے :-
محدود کیا اگر کہیں اس کا سرا نہ ہو

۲ - پہلے ایڈیشن میں یہ مصرع یوں درج ہے :-
انسان کی فنا سے غرض امتحان ہے

ھر طور ہ ھے عیش تو ھر طرح ہ سرور
یعنی خلاصہ یہ ھے کہ راضی ھوئے حضور

خوشنودی خدا ھی عبادت کا دام ھے
جنت بھی اک رضائے الٰہی کا نام ھے

اور ھیں عمل برے تو ھوئی عاقبت خراب
ایذائیں طرح طرح کی اقسام کے عذاب

اور سب سے بڑھ کے خالق کونین کا عتاب
گر پوچھنے پر آئے تو کیا بن پڑے جواب[۳]

حق کو جو نا پسند ھو تف ایسے کام پر
مالک ھی خوش نہیں ھے تو لعنت غلام پر

توفیق کار نیک ھمیں اے کریم دے
دل میں صلاح دے ھمیں طبع سلیم دے

شوق سلوک جادۂ مستقیم دے
ایمان درمیانۂ امید و بیم دے

ھم کو نہیں ھے بحث عذاب و ثواب سے
تیری رضا ملے ھمیں تیری جناب سے

اٹھ جائے دل کی آنکھ سے اسباب کا حجاب
دنیا دکھائی دینے لگے نقش سطح آب

ذرے میں رونما ھو حقیقت کا آفتاب
لاریب فیہ ھو خبر ذالک الکتاب

---

۳ - پہلے ایڈیشن میں یہ مصرع ھے :-
ھے کس کا زھرہ لا سکے اس کے غضب کی تاب -

کھل جائے اصل راز حیات و ممات کا[۴]
ہو ایک حال ماضی و مستقبلات کا

دل لوث حب دولت دنیا سے پاک ہو
دے وہ غنا کہ آنکھ میں اکسیر خاک ہو
لالچ ہو فائدے کا نہ نقصاں کا باک ہو
دیں سے شغف ہو دین میں ہی انہماک ہو[۵]
فرق نیاز فرش زمین پر پڑا ہوا[۶]
ہمت کا پاؤں عرش بریں پر گڑا ہوا

ہردم خیال موت کا پیش نظر رہے
جب تک جئے جئے جب اجل آئی مر رہے
رہ رو ہمیشہ چاہئے باندھے کمر رہے
دنیا وطن نہیں ہے کہ آئے پسر رہے
آئے ہیں ہم جہاں میں تو جانا ضرور ہے
سارا ہی قافلہ سر راہ مرور ہے[۷]

پھر بعد مرگ کیسی بنے کچھ خبر نہیں
یہ وہ خطر ہے جس سے کسی کو مفر نہیں
پر کیا ہی ڈھیٹ ہم ہیں کہ اس کا بھی ڈر نہیں
عقل معاد سے ہمیں بہرہ مگر نہیں

---

۴ - مراد یہ ہے کہ کلام اللہ کے مضامین کا پورا پورا یقین ہو*۔
پہلے ایڈیشن میں یہ مصرع درج ہے :- کھل جائے راز مسئلۂ کائنات کا
۵ - پہلے ایڈیشن میں یہ مصرع ہے :-
دل چاک ہو مگر نہ گریبان چاک ہو
۶ - پہلے ایڈیشن میں یوں ہے :- ہو فرق انکسار زمیں پر پڑا ہوا
۷ - پہلے ایڈیشن میں یہ مصرع ہے :-
سر پر کھڑی ہے موت نہ کہنا کہ دور ہے

رب العباد نعمت فکر معاد دے
فکر معاد دے ہمیں ذکر معاد دے

کیا جانب خدا سے ہدایت ہمیں نہیں
یا سوچنے کو عقل و درایت ہمیں نہیں
فی الاصل کچھ ضرورت و حاجت ہمیں نہیں
پر ہائے غور کرنے کی عادت ہمیں نہیں
ہم دیکھتے نہیں کبھی غائر نگاہ سے
سنتے نہیں ہیں بات کوئی انتباہ سے

غفلت کرا رہی ہے یہ ساری شرارتیں
بنوا رہی ہے رہنے کو پکی عمارتیں
اللہ رے دلیریاں بل بے جسارتیں
دنیاں کمائیں دین کی کر کے خسارتیں
غفلت کا کر علاج کہ اصل مرض ہے یہ
تیرا ہی کچھ بھلا ہو ہماری غرض ہے یہ

غفلت[۸] نہ ہو تو کینہ و بغض و حسد نہ ہو
جھگڑا نہ ہو لڑائی نہ ہو ردو کد نہ ہو

---

۸ - پہلے ایڈیشن میں اس بند سے پہلے یہ بند درج ہے جو بعد میں حذف کر دیا گیا :-

جھولا ہے یہ جہان تو غفلت ہے اس کی پینگ
غفلت کے ساتھ چاٹیو دیں کو لگا کے ہینگ
غفلت ہی کے نتیجے ہیں شیخی ، غرور ، ڈینگ
غفلت کچھ اور ہو گی کہ ہوں جس کے سر میں سینگ
غافل وہی ہے ہستی کو اپنی جو پھول جائے
اترائے ، اینٹھے اور تنے ، تن کے پھول جائے

بھائی کے پیٹھ پیچھے کبھی ذکر بد نہ ہو
انساں مشارک صفت دام و ددم نہ ہو[۹]
غفلت سے اس جہان میں سارا فساد ہے
غفلت کو آؤ مار ہٹائیں جہاد ہے

مخلوق ذی شعور ہے تو ہوشیار رہ
مت مستمند زندگی مستعار رہ
دنیا کا کاروبار کر اور دین دار رہ
امید وار رحمت پروردگار رہ
کس نے کہا ہے تجھ سے کہ دنیا کو چھوڑ بیٹھ
بس ایسی باتیں اپنی طرف سے نہ جوڑ بیٹھ !

کیا حال تھا رسول علیہ السلام کا
اصحاب کا ، ائمۂ عالی مقام کا
سر کردہ ہائے امت خیر الا نام کا
سکہ بٹھا گئے جو محمد کے نام کا
ان میں سے ایک بھی کبھی راہب[۱۰] ہوا کوئی
دنیا کو کھو کے دین کا طالب ہوا کوئی

دنیا بھی دیکھ ہماری طرح کی نہیں ذلیل
گر سو گھروں میں دیکھو تو ننانوے رذیل

---

۹ - پہلے ایڈیشن میں اس کی جگہ یہ مصرع درج ہے :-
تقریر لغو و باطل و نا مستند نہ ہو -

۱۰ - نصاریٰ میں جو لوگ ہندو جوگیوں سنیاسیوں کی طرح ترک دنیا کرتے تھے ، ان کو راہب کہتے تھے - اس طرح کے ترک دنیا کی اسلام میں سخت ممانعت ہے لا رھبانیۃ فی اسلام* -

روٹی کی با ہزار مشقت ہوئی سبیل
کپڑے کے واسطے وہی ستار ہے کفیل
گرمی کے دن تو خیر کسی ڈھب گزر گئے[۱۱]
جاڑا جو آیا رات کو سکڑے ٹھٹھر گئے

افلاس سے زیادہ جہاں میں نہیں وبال
افلاس ہے مقدمۂ قہر ذی الجلال
افلاس کر ہی دیتا ہے انساں کو پائمال
ڈرپوک، پست ہمت و سست و دنی خیال

مفلس کہ اس غریب کی دنیا نہیں درست
مشکل کہ اس کے ہاتھ سے ہو کار دیں درست

اور شاذ اگر ہوا کوئی محتاج دل غنی
سمجھا کہ یہ جہاں ہے جہاں گزشتنی
کے دن کی زندگی کے لیے اتنی سرزنی
اس کو نہ دوستی ہے کسی سے نہ دشمنی

ایسا بزرگ شک نہیں اس میں کہ نیک ہے
پر قوم کو ہوا نہ ہوا دونوں ایک ہے

سوچو تو کچھ بھی نیست کو نسبت ہے ہست سے؟
تم چاہتے ہو کام بلندی کا پست سے؟
کیا خیر ہو سکے گی بھلا تنگ دست سے؟
کوڑی تو لے ادھار کوئی فاقہ مست سے؟

---

۱۱ - پہلے ایڈیشن میں یہ شعر یوں درج ہے :-
گرمی کے دن تو خیر کسی طرح کٹ گیے
جاڑا جو آیا رات کو باہم لپٹ گیے

کیا اس سے فیض ہو کہ نہیں آپ جس کے پاس[۱۲]
دنیا میں چیل سے بھی ملا ہے کسی کو ماس ؟

گر مجھ سے پوچھتا ہے حقیقت میں ہم نشیں
ایصال نفع ہے مرے نزدیک اصل دیں[۱۳]

پر چاہیے ہے اس کے لیے نقد آستیں
خرمن بیار خواجہ کہ بسیار خوشہ چیں

دیں کے درست کرنے کو دنیا ضرور ہے
دنیا نہیں تو دعویٔ دیں مکر و زور ہے

اس[۱۴] واسطے جو معشر خیرالقرون تھے
اور کلہم عمارت دیں کے ستون تھے

امت کو کالنجوم[۱۵] سبھی رہ نمون تھے
اور مرجع ضمیر ہم المہتدون تھے

دنیا میں رہ کے دیں کا برتنا سکھا گئے
دونوں کے جمع کرنے کا رستہ دکھا گئے

۱۲ - پہلے ایڈیشن میں یہ شعر یوں ہے :-
کیا اس سے لے کوئی کہ نہیں آپ جس کے پاس
ہاں گھونسلے میں چیل کے آیا کہاں سے ماس

۱۳ - پہلے ایڈیشن میں یہ شعر درج ہے :-
اک بات میں کہوں اگر آئے تجھے یقین
کچھ دوسرے کو فائدہ پہنچا ، یہی ہے دین

۱۴ - اس میں حدیث ''خیر القرون قرنی'' کی طرف اشارہ ہے - معشر بمعنی گروہ - پس معشر خیر القرون سے پیغمبر کے اصحاب کرام مراد ہیں* -

۱۵ - یہ مضمون اس مشہور حدیث کا ہے '' اصحابی کا لنجوم بایہم اقتدیتم اھتدیتم''* -

راوی[۱۶] نے یوں لکھا ہے جناب عمر کا حال
جن روزوں آپ امیر تھے با ہیبت و جلال
اپنے ہی دست خاص سے پاتھا کیے سفال
تاریخ میں دکھائیے ایسی کوئی مثال
شاگرد تھے نبی کے پیمبر کے تھے جلیس
دنیا کو جانتے تھے پر پشۂ خسیس!

یسر آن کا تھا فراغ عبادت کے واسطے
کی سلطنت فلاح رعیت کے واسطے
عزت طلب تھے دین کی عزت کے واسطے
القصہ جو وہ کرتے تھے امت کے واسطے
ان کو کسی طرح طمع سیم و زر نہ تھی
ہرگز انھیں مفاد پر اپنے نظر نہ تھی

فیضان صحبت نبوی سے تھے مستفید
دیکھا انھوں نے نور رسالت کو چشم دید
پیدا ہوئے سعید جئے اور مرے سعید
تھی آن سے خواستگاری' دنیا بہت بعید
لیکن یہ انتظام الٰہی ہے مہربان
چڑھتا ہے بام پر کوئی بے وضع نردبان

زاھد تھے اور ملک ستانی کا اہتمام
دیکھو اگر یقین نہ آئے فتوح شام
دنیا میں ان کی دین تھا کالملح فی الطعام
دونوں کا پاس کرتے تھے قصہ ہوا تمام

---

۱۶ - یہ بند اور بعد کے تین بند پہلے ایڈیشن میں نہیں ہیں ، دوسرے ایڈیشن میں بڑھائے گیے ۔

بـــدلا اسی سبب سے زمـانے کا طور ہے
اســلام جب کا اور تھا اور اب کا اور ہے

دنیا سے ان کو ہوتی ذرا بھی اگر گریز
اسلام کی تو ہو ہی چکی ہوتی رست خیز

کہا جاتے لوگ گھور کے آنکھوں سے تیز تیز
تب دیکھتے زمانے کی کج دار اور مریز[۱۷]

پھر کون پوجتا تھا خدائے یگانہ کو
پاتا نہ کوئی زندگیٔ جاودانہ کو

اب بھی جو دیکھتے ہو انھی کا طفیل ہے
کم بیش سب کو جانب توحید میل ہے

اعمال و شرک جوں خس و خاشاک و سیل ہے[۱۸]
اتنا بھی گر نہ سمجھے تو انسان بیل ہے

مشرک کی کوئی شے نہیں کرتا خدا قبول
اس کی دعا قبول نہ کچھ التجا قبول

القصہ الف وہ دین تھا دنیا کا دوست دار
واعظ ، ادیب ، ناصح مشفق ، صلاح کار

مونس ، رفیق ، موجب تسکین ، غم گسار
ہم درد ، بے ریا و ہوا خواہ جان نثار

وہ کھینچتا تھا بار امیر و فقیر کا
دنیا میں اس میں ربط تھا شاہ و وزیر کا

---

۱۷ - کج دار مریز سے مراد ہے تکلیف مالا یطاق ، کیونکہ ٹیڑھا رکھ اور گرے نہ دے طلب محال ہے * -

۱۸ - اس میں لف و نشر مرتب ہے ، یعنی اعمال خس و خاشاک ہیں اور شرک میل * -

اب ہم نے اپنے دیں کو بنایا چھوئی موئی
دنیا میں اور دیں میں لگانے لگے دوئی

پھر قاصر اس قدر نظرنارسا ہوئی
شہتیر بن گیا جو حقیقت میں تھی سوئی[۱۹]
دیں کے عوض تعصب و اوہام رہ گئے
دیں دار اصل مر گئے بدنام رہ گئے

دنیا گئی کہ ہم نہ ہوئے اس کے خواستگار
اور کیونکہ ہوتے مولوی جنت کا چوبدار
مسجد میں وعظ کہتا تھا منبر پر آشکار
مفلس ہمیر مومن و دست از طلب بدار[۲۰]
دنیا و دیں کے ربط کی رسی کو کاٹ کے[۲۱]
دھوبی کے کتے ہو گئے گھر کے نہ گھاٹ کے

ادبار کا یہی تو ہے سب سے بڑا سبب
دنیا میں اور دیں میں عداوت، ارے غضب
دنیا بغیر سخت مصیبت ہے روز و شب
لازم ہے دین کا بھی کما حقہ، ادب

---

۱۹ - پہلے ایڈیشن میں یہ شعر یوں ہے :-
شہتیر بن گیا جو حقیقت میں تھا سوئی
اور نا کا پھیل پھیل کے ہوتا گیا کوئی

۲۰ - ترجمہ : اے مسلمان تو مفلسی ہی میں زندگی بسر کر اور دنیا کی طلب سے ہاتھ اٹھا لے - یعنی ہمارے علماء و مشائخ ہمیشہ قناعت و توکل کی تلقین کیا کرتے ہیں جس سے لوگوں میں ترک دنیا کے رجحانات پیدا ہو گیے ہیں -

۲۱ - پہلے ایڈیشن میں یہ مصرع یوں درج ہے :-
دنیا و دین کی رسن ربط کاٹ کے

خستہ ہوئے خراب ہوئے ہائے مٹ گئے
ان دونوں کی لڑائی میں ہم مفت پٹ گئے

دل بجھ گیا ہے دیکھ کے دنیا کا انقلاب
افسوس کیا خراب ہوئی قوم انتخاب
دیں کے خدا پرست وہ دنیا کے فتح یاب
آپس میں رحم و لطف عدو کے لیے عذاب

مسجد میں سر بہ سجدہ پڑے ہیں زمین پر
میدان میں ڈٹے ہوئے گھوڑوں کی زین پر
لوگوں کو گر مناصب دنیا گناہ ہوں
داخل محرمات میں اعزاز و جاہ ہوں
دنیا کی آبرو سے اگر دیں تباہ ہوں
ان کا تو دیں یہی تھا کہ ہم بادشاہ ہوں

اگلے بزرگ لوگ تھے خاص امتیاز کے
پیشانیوں[۲۲] پر اُن کی تھے گھٹے نماز کے
معمور ہیں خزائن انعام کردگار
بے انتہا، و بے حد و بے حصر و بے شمار
وہ چھینتا[۲۳] نہیں ہے کبھی دے کے ایک بار

۲۲- ان دو بندوں میں اشارہ ہے قرآن مجید کی اس آیت کی طرف :-
مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللهِ وَرِضْوَانًا سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ* - ۱۲

۲۳- اشارہ ہے طرف آیت ما کان اللہ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَىٰ قَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ کے* ۱۲ -

شایاں آسے نہیں ہے کہ بندوں کو دے ادھار
دنیا بدل گئی ہمہ نعمت بدل گئی !

اس واسطے کہ قوم کی ہمت بدل گئی
افسوس قوم میں عصبیت نہیں رہی

ہم میں کسی طرح کی مزیت نہیں رہی
مضبوطئی ارادہ و نیت نہیں رہی

جرأت کہاں سے ہو کہ حمیت نہیں رہی
ہم میں ہر اک بشر کے خیالات پست ہیں

پس لا جرم ذلیل ہیں اور تنگ دست ہیں
اے[۲۴] قوم یہ تباہی و افلاس جائے شرم

اے قوم یہ تعصب و وسواس جائے شرم
اس درجہ ضعف قوت احساس جائے شرم

تقصیر[۲۵] فی مقابلۃ الناس جائے شرم
تم اور تمہاری نسل ہو مشغول کھیل میں

اور لوگ چل رہے ہیں ترقی کی ریل میں
کیا خوب کہہ گیا ہے کوئی شخص خوش خیال

لفظ عرب میں نحن[۲۶] رجال وہم رجال
اب اے عزیزو تم سے ہمارا ہے یہ سوال

کیوں آ گیا ہے قوم کی حالت میں اختلال

۲۴- یہاں سے مسلسل گیارہ بند بعد میں بڑھائے گیے ، پہلے ایڈیشن میں نہیں ہیں -

۲۵- یعنی لوگوں کے مقابلے میں ہیٹا ہونا شرم کی بات ہے* -

۲۶- ہم بھی آدمی ہیں اور وہ بھی آدمی ہیں* -

اقوام روزگار میں ہیٹے ہو کس لیے
بے وقعتی کی خاک پہ لیٹے ہو کس لیے

کثرت سے تم میں صاحب مقدور کیوں نہیں
لوہا تمہارا مانتے جمہور کیوں نہیں
منہ پر تمہارے حسن نہ ہو نور کیوں نہیں
دل قوم کے شگفتہ و مسرور کیوں نہیں

آخر تمہاری قوم یہ، یہ کیا وبال ہے
جس شخص پر خیال کرو خستہ حال ہے

جب تک ہماری قوم میں تاج و نگیں رہا
ہم میں کسی کو فکر معیشت نہیں رہا
کس کس کا نام لیں کہ چنا اور چنیں رہا
ہر فرد عافیت سے غنا کے قریں رہا

ہم مالک خزائن روئے زمیں تھے
اہل زمانہ قاطبۃً خوشہ چیں تھے
یسر و فراغ و دولت و حشمت ہزار حیف!
وہ شوکت اور لوازم شوکت ہزار حیف!

عزت ہزار حیف حکومت ہزار حیف!
صد حیف قابلیت و نعمت ہزار حیف!

گو حور بعد کور[۲۷] اشد العذاب ہے
یاد از قبیل[۲۸] لیت یعود الشباب ہے

۲۷- یہ ایک حدیث کی طرف اشارہ ہے: نعوذ باللہ من الحور بعد الکور یعنی ہم اللہ سے پناہ مانگتے ہیں اس کمی سے جو زیادتی کے بعد ہو - ۱۲* -
۲۸- حور بعد کور بڑا عذاب ہے مگر اس کو یاد کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی گئی ہوئی جوانی کی پھر تمنا کرے* -

کیا فائدہ جو تذکرۂ ما مضا کریں
کیوں یاد رفتگاں میں ماتم بپا کریں

بے سود اگرچہ تا بہ قیامت بکا کریں
اک امر اختیار سے خارج ہے کیا کریں
فرہاد[۲۹] وار در صدد جوئے شیر کیا
اب جا چکا ہے سانپ تو پیٹیں لکیر کیا

پھر بھی ہے ایک وجہ تسلی بہت بڑی
قسمت ہمارے ملک کی اچھوں سے جا لڑی[۳۰]

جن کو فلاح خلق ہے منظور ہر گھڑی
لیکن یہ مشکل ایک بڑی سخت آ پڑی
ناواجب اڑ کے بیٹھے ہیں ہم اپنی بات پر[۳۱]
پیاسے تڑپ رہے ہیں کنار فرات پر

دروازہ کون سا ہے جو ہم پر کھلا نہیں
ناممکن الحصول کوئی مدعا نہیں

مذہب کا قوم و ملک کا ہاں تفرقہ نہیں
آزادی اس قدر ہے کہ کچھ انتہا نہیں

بے جوتے بوئے آپ اگے کا اناج کیا
ہم ہی اگر نہ چاہیں تو اس کا علاج کیا

۲۹- یہ ایک مشہور قصہ ہے کہ فرہاد اپنی معشوقہ شیریں کی فرمائش سے پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر لانے کی فکر میں تھا * -

۳۰- مصنّف کا اشارہ انگریز حکمرانوں کی طرف ہے* -

۳۱- یعنی جاہلانہ تعصبات کی وجہ سے ہم جدید تعلیم سے متنفر ہیں اور ترقی کے میدان میں پس ماندہ -

اس ضد احمقانہ کو للہ کم کرو
جانوں پر اپنی بہر خدا مت ستم کرو

چاہو ہمیں برا کہو یا متہم کرو
پر روٹیوں کا فکر تو بہر شکم کرو

ہم دیکھتے ہیں قوم کی حالت تباہ ہے
بیمار کو دوا نہ بتائیں گناہ ہے

پھر بھی تمہیں تمہیں ہو اگر دل پہ ٹھان لو
وہ وقت اب نہیں ہے کہ سیف و سنان لو

ہے علم پر مدار اسے خوب جان لو
اتنی سی ایک بات ہماری بھی مان لو

رکھتی ہے اپنا وقت مناسب ہر ایک شے
تصویف تا کجا و پس و پیش تا بہ کے

جا گو کہ شرط باندہ کے مردوں سے سو چکے
خار قنوط راہ تمنا میں بو چکے

جو کچھ تمہیں خدا نے دیا تھا سو کھو چکے
سن لینا ایک دن کہ مسلمان ہو چکے

قسمت میں قوم کی ہے لکھی صبح و شام موت
بے حرمتی کے جینے سے بہتر حرام موت !

دنیا میں جس قدر ہیں ذریعے معاش کے
ان میں ہمارا حصہ واجب ہو کاش کے

بودے ہیں جستجو کے طلب کے تلاش کے
ہاں مبتلا کی وضع کے اس کی قماش کے

گر چاہیے تو لاکھ میں نوے ہزار ہیں
طوطی چمن میں ایک ہے کوے ہزار ہیں

عبرت کی داستان ہے احوال مبتلا
آنکھوں کے آگے پھرتی ہے تمثال مبتلا

اللہ رے جمال خد و خال[۳۲] مبتلا
اور عنفوان عمر سن و سال مبتلا

جس وقت وہ شراب جوانی سے چور تھا
بے شک و شبہ رو کش غلمان و حور تھا

لیکن وہ حالت ایسی سریع الزوال تھی
بس دیکھتے ہی دیکھتے خواب و خیال تھی

وہ زلف جو کبھی دل عاشق کا جال تھی
خود دوش مبتلا پہ بلا تھی وبال تھی

دیکھا تو آخرش خورش کرم گور تھا
جس کے جمال و حسن کا عالم میں شور تھا

وہ مبتلا جو ناز و نعم میں پلے کبھی
سانچے میں ہاتھ پاؤں تھے جس کے ڈھلے کبھی

خنجر[۳۳] چلیں گر ایک قدم بھی چلے کبھی
تیغ ادا سے کٹتے تھے جس کی گلے کبھی

۳۲- خد عربی میں رخسارے کو کہتے ہیں شاید خط و خال غلط العام ہے* ۔

۳۳- یہ شعر پہلے ایڈیشن میں یوں ہے: -

آنکھیں بچھیں گر ایک قدم وہ چلے کبھی
دیکھا انھی کو تودۂ گل کے تلے کبھی

بس[۳۴] جنتری میں قبر کی سب بل نکل گئے
رکھتے کے ساتھ لحد کے سانچے میں ڈھل گئے
آفت ہے موت ، خاصۃً مبتلا کی موت
تکلیف و درد و محنت و رنج و عنا کی موت
قہر الٰہی و غضب کبریا کی موت
دشمن کو بھی نصیب نہ ہو اس بلا کی موت

انجام[۳۵] کار جو تری مرضی ہو کیجیو
پر ایسی موت بار خدایا نہ دیجیو

تھی اس پر ابتدا سے مسلط بلائے حسن
طفلی میں تھا وہ آئنۂ رونمائے حسن
مضمر ہر ایک وضع میں اس کی ادائے حسن
اک عالم اس کا شیفتہ و مبتلائے حسن

اول سے شوق حسن جو خاطر نشاں ہوا
خواہان روئے خوب ہوا جب جواں ہوا
شامت جو اس کی آئی کیا دوسرا نکاح
سمجھا کہ چار شرع پیمبر میں ہیں مباح
آئی مگر نظر نہ کبھی صورت فلاح
کیا ہی بری وہ رائے تھی اور کیسی بدصلاح

۳۴- اس شعر کی جگہ پہلے ایڈیشن میں یہ شعر درج ہے :-
پیدا ہوئے تو صبح کو اک دھوم دھام تھی
مرنے لگے تو شام غریبوں کی شام تھی

۳۵- یہ شعر بھی ترمیم شدہ ہے ، پہلے یوں تھا :-
دنیا سے جیسے چاہے ہمیں پار اتاریو
پر ایسی موت بار خدایا نہ ماریو

فرصت نہ دی پھر اس کو نزاع و جدال نے
سب کچھ حرام کر دیا اس اک حلال نے

امن و فراغ و عافیت و راحت و قرار
نام و نمود و عزت و توقیر و اعتبار

حسن معاشرت کہ تمدن کا ہے مدار
اور جس سے بے نیاز نہیں کوئی خانہ دار

سب چیز جا کے فقر ہوا گھر میں جا گزیں
جس چیز کو مکان میں پوچھو نہیں نہیں

جب مبتلا پر آ ہی گیا وقت احتضار
منہ میں چوانے[۳۶] پانی لگی چشم اشک بار

یس پڑھ رہی تھی کھڑی پاس غم گسار
اور دونوں آنکھیں ضعف نے دیں ڈھانک ایک بار

یوں بے کسا نہ ہائے جوانی میں جان دے
جنت میں اس کو بار الٰہا مکان دے

جو لوگ ہیں سعادت عظمیٰ سے بہرہ مند
کرتے ہیں بات بات سے وہ اکتساب پند

پرواز کو خیال کے رکھو ذرا بلند
مت ہو لذائذ نفسانی کے پائے بند

میری سنو اگر نہیں سمع قبول کر[۳۷]
دو بیبیاں نہ کیجیو زنہار بھول کر

۳۶- ٹپکانے کے معنی میں 'چوانا' اب متروک ہے - اس مصرع میں کریہہ قسم کی تعقید پائی جاتی ہے -

۳۷- کر بمعنی بہرا -

فرہنگ الفاظ و محاورات و امثال

الف

آدھا تیتر آدھا بٹیر	بے جوڑ - بے میل - جو کام یکساں نہ کیا جائے -
آفتابہ	لوٹا
آلکسی	سستی - آرام طلبی - یہ لفظ آلسی بھی آتا ہے -
آنبہ ہلدی	ایک قسم کی سرخ ہلدی جو دوا میں کام آتی ہے -
آنکنا	جانچنا - پرکھنا - قیمت کا تخمینہ لگانا -
آنکھوں پر ٹھیکری دھرنا	بے شرم یا بے مروت ہو جانا - پروا نہ کرنا -
اُبٹنا (یا ابٹن)	کھلی (کھل) میں خوشبو وغیرہ ملا کر ایک مسالہ بناتے ہیں جسے ملنے سے رنگت نکھر آتی ہے اور بدن نرم و خوشبودار ہو جاتا ہے -
اُتارن (یا اُترن)	استعمال شدہ پرانے کپڑے -
اُتر جانا	بچے کا مر جانا -

آتو کرنا	اس قدر مارنا کہ بدن پر نشان پڑ جائیں ۔ آتو یعنی وہ نقوش جو کپڑے پر بنائے جاتے ہیں ۔
اٹل ہو جانا	شکم سیر ہونا ۔ آسودہ ہونا (دھلی کا محاورہ)
اٹم	ڈھیر ۔ انبار ۔ اٹالا ۔
اٹواٹی کھٹواٹی لیے پڑا رہنا	غم و غصے کی حالت میں الگ جا کر پڑ رہنا ۔
اثبات	ثابت کرنا ۔
احقاق حق	حق کو ثابت کرنا ۔ حق دلانا ۔
احیاناً	اتفاقاً ۔ کبھی کبھی ۔
آچاپت	ادھار کا لین دین ۔
ادبدا کر	جان بوجھ کر ۔ ضد اور شرارت سے ۔ خواہ مخواہ ۔
ادعائی	بے دلیل بات ۔ من گھڑت ۔ فرضی بات ۔
اَدھر	ہوا میں ۔ بیچ میں ۔ درمیانی عرصہ ۔
اَدھی	نہایت حقیر ۔ کم قیمت شے ۔ پیسے کا آٹھواں حصہ ۔
ارباب نشاط	گانے بجانے اور ناچنے والے لوگ ۔ طوائف ۔ گوئیے ۔
اڑنگے لگانا	رکاوٹ ڈالنا ۔ چلتے کام میں روڑے اٹکانا ۔

اڑواڑ	وہ لکڑی جو پرانی چھت کو سہارا دینے کے لیے لگا دیتے ہیں ۔
اڑی پر آڑے آنا	مصیبت میں کام آنا ۔ مشکل حل کرنا۔
ازانجملہ	اُن سب میں سے ۔
ازواج طاہرات	پاک بیبیاں ۔ مراد آنحضرت صلعم کی بیویوں سے ۔
اسامی	عہدہ۔ منصب۔ ملازمت (کئی اور معنی)
استبعاد	دوری چاہنا ۔ مراد بعید از قیاس ۔
استحقاقاً	طلب حق کے طور پر ۔
استخفاف	ہلکا سمجھنا ۔ توہین ۔ تحقیر ۔ خفت ۔
استدلالاً	بطور دلیل۔ ثبوت پیش کرتے ہوئے۔
استشہاد کرنا	شہادت دلانا۔ بطور ثبوت پیش کرنا۔
استفراغ	قے کرنا ۔
استکراہ	نفرت ۔ کراہت ۔
استمالت	دل جوئی ۔ خوشامد ۔
استنباط	ایک بات سے دوسری بات اخذ کرنا ۔ نتیجہ نکالنا ۔
اسفل السافلین	پست ترین مقام ۔
اسم بامسمیٰ	وہ شخص جو اپنے نام کے مطابق صفات رکھتا ہو ۔
اصلاح ذات البین	باہمی صلح صفائی ۔
اضعافاً مضاعفۃً	دگنا تگنا ۔

اظہار دینا	بیان دینا (لینا) بیان تحریر کرنا ۔ گواہی لینا ۔
اعلیٰ علّیین	جنت کا بلند ترین مقام ۔
اعوان و انصار	مددگار ۔ حامیتی ۔
اغوا	بہکانا ۔ ورغلانا ۔ اکسانا ۔
الاھنا	گلہ ۔ شکوہ ۔ شکایت ۔
التیام	زخم کا بھرنا ۔ میل ملاپ ہونا ۔
اللہ آمین سے پالنا	ناز و نعمت سے پالنا ۔ دعاؤں اور مرادوں کے ساتھ پالنا ۔
الم نشرح کرنا	راز فاش کرنا ۔ رسوا کرنا ۔ تشہیر کرنا ۔
امچور	کچے آم کی سوکھی پھانکیں ۔ دبلا پتلا ۔ سوکھا ۔
امرد	بے داڑھی مونچھ کا لڑکا ۔ نوعمر لڑکا ۔
انابت	خدا کی طرف رجوع کرنا ۔ توبہ استغفار کرنا ۔
اناپ شناپ	فضول ۔ لغو ۔ اندھا دھند ۔ ضرورت سے زیادہ ۔
انچھر	حرف ۔
انقطاع	کٹ جانا ۔
انگشت نما	رسوا ہونا یا کرنا ۔
انگیز کرنا	برداشت کرنا ۔ سہارنا ۔

اونے پونے	کم قیمت پر ۔ نقصان اٹھا کر بیچنا ۔
ایجاب و قبول	شادی کے موقع پر مرد کا عورت کو اور عورت کا مرد کو قبول کرنا ۔ رضا مندی کا اظہار ۔

ب

باقسامہم	آن کی جملہ قسموں کے ساتھ ۔
بالاجمال	اختصار کے ساتھ ۔ مختصر طور پر ۔
بائع	بیچنے والا ۔
بُتے دینا	مغالطہ دینا ۔
بٹا لگانا	عیب لگانا ۔ نام دھرنا ۔
بداہت	صراحت ۔ کھلی ہوئی بات (بدیہی : ظاہر ۔ روشن۔ بدیہیات ایسے مسائل جن کے لیے دلیل کی ضرورت نہ ہو)۔
بدرجۂ اولیٰ	بہت بہتر ۔ نہایت اچھا ۔
بدعتی	دین میں کوئی نئی بات نکالنے والا ۔ رسم و رواج کا پیرو ۔
بدھیاں	لکڑی یا چھڑی کی مار سے جسم پر جو نشان پڑ جاتے ہیں۔
برتے پر	بل پر ۔ سہارے پر ۔ بھروسے پر ۔
بساند	(بساندھ یا بساھند) بدبو ۔ مچھلی یا گوشت کی بو ۔
بشرہ	چہرہ مہرہ ۔ حلیہ ۔ قیافہ ۔

بطلان	باطل ہونا ۔ باطل کرنا ۔ جھٹلانا ۔
بعثت	رسالت ۔ پیغمبر کا بھیجا جانا ۔ زمانۂ رسالت ۔
بغارے	بڑے بڑے سوراخ ۔
بغلی گھونسا	دوست نما دشمن ۔ آستین کا سانپ ۔
بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی	جس کی عادتیں بری ہوں وہ ایک نہ ایک دن ضرور پکڑا جائے گا ۔ پوری مثل یہ ہے : بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی ، آخر ایک دن چھری تلے آئے گی ۔
بکھرنا	ضد کرنا ۔ اڑ جانا ۔
بگٹٹ دوڑانا	بے تحاشا دوڑانا ۔
بل	فرق ۔ طاقت ۔ سہارا ۔
بمدارج	مرتبے میں ۔ درجے کے لحاظ سے ۔
بوٹیاں توڑنا	چٹکیاں بھرنا ۔ تکلیف دینا ۔
بوچھاڑ	(بوچھار) تیز بارش کے چھینٹے ۔ بھر مار ۔
بودا	کم ہمت ۔ بزدل ۔
بولانا	پاگل ہو جانا ۔
بوھنی	وہ بکری جو دن میں پہلے پہل ہو ۔ وہ رقم جو پہلے پہل ملے ۔
بھڑاس	غصہ ۔ دل کا بخار ۔

بھر پانا	کیے کی سزا پانا ۔ پھل پانا ۔ کُل وصول پانا ۔
بھگت	پارسا ۔ پرھیزگار ۔ جھاڑ پھونک کرنے والا (بگلا بھگت : ریاکار ۔ ڈھونگی) ۔
بھلمنساھت	شرافت ۔ انسانیت ۔
بھنانا	عاجز ھونا ۔ گھبرانا ۔
بھننگ (بھنک)	ھلکی دھیمی آواز ۔ اڑتی ھوئی خبر سننا ۔
بھونرے میں پلنا	لاڈ پیار میں پلنا ۔ (بھونرا ۔ تہہ خانہ) اگلے زمانے میں شہزادوں کو گرمی سردی کے اثرات سے بچانے کے لیے تہ خانوں میں رکھا جاتا تھا ۔
بھوبل (بھوبھل)	گرم ریت ۔ گرم راکھ ۔
بے بضاعتی	تہی دستی ۔ مفلسی ۔
بیچا (بیجا)	ھوّا ۔ بچوں کو ڈرانے کے لیے جو ھیبت ناک صورت بناتے ھیں ۔
بے مبالاتی	غفلت ۔ بے پروائی ۔
بیمہ لینا	ذمہ لینا ۔ ٹھیکا لینا ۔
بیونتنا	کپڑا کاٹنا ۔
بیوتات	گھر کے اخراجات یا اُس کا حساب ۔
بیوی کی صحنک	حضرت فاطمہ کی فاتحہ یا نیاز کا کونڈا ۔

پ

پار لے جانا	سبقت لے جانا ۔
پانی مرنا	نقص یا عیب ہونا ۔ الزام آنا ۔
پتا مارنا	بتکلیف برداشت کرنا ۔ مشقت کرنا ۔ غصے کو ضبط کرنا ۔
پتیانا	اعتبار کرنا ۔ نرم ہونا ۔ خاطر میں لانا ۔
پٹرے کا پٹرا	موٹا تازہ ۔ (پٹرا : تختہ) ۔
پٹکی ڈالنا	اندھا کرنا ۔ آنکھیں بند کر دینا ۔
پٹنا پڑنا	ہر وقت کسی کے پیچھے پڑے رہنا ۔ فکر و تردد ہونا ۔
پٹی	گاؤں کی اراضی کا حصہ (پٹی دار : گاوں کے حصے کا مالک)
پٹی پڑھانا	بہکانا ۔ سبق پڑھانا ۔ سکھانا ۔
پٹی جمانا	بالوں کو سنوارنا ۔ مانگ کے دونوں طرف بالوں کی تہ جمانا ۔
پچی ہونا	مضبوط بیٹھ جانا ۔ جم جانا ۔
پرتل	سوار کا سامان ۔
پرچانا	بہلانا پھسلانا ۔ مانوس کر لینا ۔
پرچول	جستجو ۔ چھان بین (رہنا ، کرنا یا ہونا کے ساتھ) ۔

پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑنا — گرد ہونا ۔ مستعدی سے پیچھے لگ جانا ۔

پون — جادو ۔ ٹونا ۔ ٹوٹکا ۔ (بٹھانا) جادو کرنا ۔

پولی — گٹھا ۔ گڈی ۔

پھبتی — ایسی تشبیہ جس میں طنز و مزاح کا پہلو ہو اور جو دوسرے پر چسپاں ہو جائے ۔

پھلونٹی — پہلی اولاد (پھلونٹی کی بیٹی یا بیٹا) ۔

پھٹیل — اکیلا ۔ علیحدہ ۔ (پھٹ پھٹکر یا پھٹکل بھی اسی معنی میں آتا ہے) ۔

پھٹکا نہ کھانا — فوراً مر جانا ۔ تڑپنے کا موقع نہ ملنا ۔

پھٹے منہ — کلمۂ تحقیر ۔ خدا کی لعنت ۔

پھنکیتی بچیتی — وار کرنے اور بچاؤ کرنے کے داؤ پیچ ۔

پیڑھی — ۱۔ چھوٹا کھٹولا ۔ ۲۔ پشت۔ نسل۔

پیٹ کا گہرا — (ضد ، پیٹ کا ہلکا) جو راز کو چھپا سکے۔ بات کو اپنے تک محدود رکھے ۔

ت

تابڑ توڑ — لگاتار ۔ مسلسل ۔

تابعین — اُس طبقے کے مسلمان جنھوں نے صحابۂ کرام کا زمانہ دیکھا ہو ۔ (تبع تابعین : جنھوں نے تابعین کا زمانہ دیکھا ہو) ۔

تڑانا (یا توڑ لینا)	کسی سے چھڑا کر اپنی طرف ملالینا ۔
تباین	اختلاف ۔ فرق ۔ ضد ۔
تجربیات	وہ باتیں جو تجربے و مشاہدے پر مبنی ہوں ۔
تخمہ	بد ہضمی ۔ ہیضہ ۔
تزلزل	جنبش ۔ ہلچل ۔ گڑبڑ ۔
تصرف	قبضہ ۔ اختیار ۔
تعرض	اردو میں کرنا کے ساتھ روک ٹوک یا مزاحمت کرنے یا چھیڑنے کے معنی میں آتا ہے ۔
تعلیق بالمحال	کسی بات کو کسی امر محال پر منحصر کرنا ۔
تقدیم	پہل کرنا ۔ پیش قدمی کرنا ۔
تکا چلانا	اٹکل پچو تیر چلانا ۔
تکلا	سوت کاتنے کا سؤا ۔ چرخے کی آہنی سلائی ۔
تلافئی مافات	جو امر فوت ہوگیا ہو یا جو نقصان ہو چکا ہو اس کا بدل یا معاوضہ ۔
تمول	امیری ۔ دولتمندی ۔
تناقض	ایک دوسرے کی ضد یا مخالف ہونا ۔
توالد و تناسل	اولاد پیدا کرنا ۔ نسل چلانا ۔
تہ دیگی	کھرچن ۔ دیگ میں نیچے کا کھانا جو روغن زیادہ جذب ہونے کی وجہ سے لذید ہوتا ہے ۔

تھپنا	الزام لگنا ۔ ذمے لگنا ۔
تھوپ تھاپ دینا	رفع دفع کر دینا یا دبا دینا ۔
تھونی	و لکڑی جو چھپر کے نیچے سہارا دینے کے لیے لگاتے ھیں ۔
تھالی جوڑ	سرپوش اور نیچے کی رکابی جس میں گلاس رکھ کر پانی پلاتے ھیں ۔
تیغا کرنا	محراب یا دروازے کو چنوا کر بند کر دینا ۔

ٹ

ٹس جانا	مطلب نکالنے کی تدبیر کرنا ۔ خوشامد سے کام چلانا ۔
ٹروں ٹوں	تن تنہا ، اکیلا رہ جانا ۔
ٹکاری دینا	آواز سے ھانکنا ۔ ایڑ لگانا ۔
ٹکٹکی باندھنا	غور سے بغیر پلک جھپکائے دیکھنا ۔
ٹوہ لگانا	سراغ لگانا ۔ خبر لگانا ۔
ٹوٹ کر	شدت سے ۔ کثرت سے ۔ تیزی سے ۔ سخت محنت اور مستعدی سے ۔
ٹہل	خدمت ۔ کام ۔
ٹھٹھکنا (ٹھٹکنا)	ھچکچانا ۔ حیرت زدہ رہ جانا ۔
ٹھلا	مضبوط ۔
ٹھٹ	آنکھ کی پھلی

ث

ثنہ بدمعاش	وہ بدمعاش جو بظاھر معزز اور شریف نظر آئے ۔ بگلا بھگت ۔

ج

جان هار	جان دینے والا - مرنے والا -
جڑنا	میسر آنا - نصیب هونا -
جذامی	کوڑھی -
جوارح	جمع جارحه کی - بدن کے اعضاء -
جوکھوں	خطره - تکلیف و ابتلا - وه مهم جس میں نقصان کا اندیشه هو -
(جوکھم)	
جھپاجھپ	بڑی تیزی سے - جلد جلد -
جھک مارنا	بیهوده بکنا - بیهودگی کرنا -
جھکڑ لگنا	کسی بات کے پیچھے پڑ جانا - دهن لگ جانا -
جھلنگا	ڈھیلی ، ٹوٹی هوئی چارپائی -

چ

چاندنی	سفید فرش -
چٹاچٹ بلائیں لینا	اس طرح بلائیں لینا که انگلیوں کے چٹخنے کی آواز آئے -
چچا بنانا	درست کردینا - ٹھیک کرنا - سزا دینا -
چرغنا	چڑیوں کے بولنے کی آواز - (چرکنا بھی کہتے هیں)
چڑھاوا	نذر و نیاز - بھینٹ - وه زیور جو دولھا والے دلھن کو دیتے هیں -
چکتا	کاٹے کا نشان یا زخم کا نشان -
چکٹ	بہت میلا -
چکلہ	کسبیوں کا محلہ -

چکوتا	فیصلہ - تصفیہ - بے باق -
چھکا	جلنے سے جو داغ پڑ جاتا ھے -
چوتھی کھیلنا	شادی کے دوسرے دن عورتیں آپس میں پھلوں اور ترکاری سے کھیلتی ھیں - اس رسم کو چوتھی کھیلنا کہتے ھیں -
چوھے کے ھاتھ ھلدی کی گرہ	کم ظرف سے معمولی بات پر اترانا - پوری مثل یہ ھے : چوھے کے ھاتھ لگی ھلدی کی گرہ، پنساری بن بیٹھا -
چھچھوری	کم ظرف - کمینی - رذیل -
چھپٹیاں	لکڑی کی چھیلن -
چھاتی پر مونگ دلنا	کسی کے سامنے ایسی حرکت کرنا جو اسے ناگوار ھو -
چھوٹتے کے ساتھ	فوراً
چھیلا	بانکا - رنگیلا -
چیں چپڑ کرنا	جھگڑا ، تکرار کرنا -

ح

حرف شناسی	ابتدائی درجے کی خواندگی -
حصہ بخرا چلنا	برادرانہ مراسم ھونا - تقریبات میں کھانے پینے کی چیزیں لینا دینا -
حق الیقین	یقین کامل جو ذاتی مشاھدے سے پیدا ھوتا ھے -
حقوق العباد	بندوں کے حقوق -
حقیت پدری	پدری ورثہ لینے کا حق -

حلول — آترنا، دخول (حلول مصیبت : مصیبت کا نزول) ۔

حمق — حماقت ۔

حیز — بزدل ۔ نامرد ۔

خ

خالصے لگنا — ضائع و برباد ہونا۔ بحق سرکار ضبط ہونا۔

خانگی — وہ عورتیں جو علانیہ پیشہ نہیں کرتیں، بلکہ پردہ داری کے ساتھ ناجائز تعلقات قایم کرتی ہیں ۔

خراش تراش — کاٹ چھانٹ ۔ سجانا ۔ وضع قطع ۔

خرچی — زنا کاری کا معاوضہ (کھانا کے ساتھ)۔

خروج کرنا — بغاوت کرنا ۔ حملہ کرنا ۔

خشونت — سختی ۔ درشتی ۔

خلع — عورت کا طلاق لینا ۔

خوارق — معجزے۔ کرامتیں۔ (خارق کی جمع)۔

د

داخل خارج — قانونی اصطلاح میں ایک شخص کے نام دوسرے کی ملکیت منتقل ہونا یا اندراج ملکیت ہونا ۔

دانت لگائے بیٹھنا (یا دانت رکھنا) — کسی چیز کے لالچ میں تاک لگائے رکھنا ۔

دایم الحبس — عمر قید ۔ حبس دوام ۔

درپے ہونا — پیچھے پڑنا ۔ گھات میں رہنا ۔

درخور ہونا — دخل ہونا ۔ لایق ہونا ۔

دق کرنا — ستانا ۔ پریشان کرنا ۔
دلالت — علامت۔ نشان ۔ ھدایت ۔
دور پار — خدا نہ کرے ۔ خدا نخواستہ ۔ (عورتوں کا محاورہ ، نوج) ۔
دھت — لت ۔ بری عادت ۔
دھتکار — لعنت ملامت ۔ ذلیل کرنا ۔ نکال دینا ۔
دُھر — اختتام۔ انتہا۔ حد۔ انتہائی بعد مسافت۔
دھڑیوں — پانچ سیر یا کہیں کہیں دس سیر کے وزن کو دھڑی کہتے ھیں ۔ مراد بکثرت ۔ بہ افراط ۔
دھسک — خفیف کھانسی ۔
دیوانی (عدالت) — وہ عدالت جس میں ملکیت ، وراثت اور مہر و طلاق وغیرہ کے مقدمے فیصل ہوتے ھیں ۔

ڈ

ڈاڑھیں مار کر رونا — زار و قطار رونا ۔ چیخ چیخ کر رونا ۔
ڈکڈکا کر پینا — بے تابی سے کھینچ کر پینا ۔
ڈنڈوت کرنا — ھندؤں میں سلام کرنے کا ایک طریقہ ۔ ھاتھ جوڑ کر اور سر جھکا کر آداب بجا لانا ۔
ڈھاک — ایک جنگلی درخت ۔ گہرے سرخ پھول چوڑے چکلے پتے ، لکڑی جلانے کے کام آتی ھے ۔
ڈھرا — ڈگر ۔ عام راستہ ۔
ڈھنڈیا پڑنا — کسی چیز کی تلاش ہونا ۔

ڈھی دے کر بیٹھنا — کسی جگہ جم کر بیٹھ جانا کہ اٹھنے کا نام ہی نہ لے۔ دھرنا دے کر بیٹھنا۔

ڈیل — جسم۔

ر

راتب — جانوروں کی بندھی ہوئی خوراک۔ بندھا ہوا راشن (بندھنا ۔ معمول مقرر کر لینا)۔

رام کرنا — بس میں لانا ۔ مانوس کر لینا۔

رہڑ — دوڑ دھوپ ۔ تکان ۔ محنت مشقت۔

رخ دیکھنا — توجہ دیکھنا۔

رجعت — لوٹنا ۔ واپسی۔

رضاع — دودھ پلانا۔

روڑ — پرانی روئی۔

ریجھنا — فریفتہ ہونا۔

ریس کرنا — برابری کرنا ۔ رشک یا حرص کرنا۔

ریزگی — سونے چاندی کے یا گوٹے کے چھوٹے ٹکڑے ۔ کترن۔

ریزگی لڑکے — چھوٹے لڑکے۔

ریں ریں کے ساتھ — بڑی مشکل سے ۔ رو دھو کر۔

ز

زار نالی — رونا پیٹنا ۔ چیخ پکار ۔ آہ و زاری۔

زچہ گیریاں — زچہ خانے کے گیت۔

زر بفت — سونے اور ریشم کے تاروں سے بنا ہوا کپڑا ۔ کم خواب۔

زّوار	زیارت کرنے والے ۔ (زائر کی جمع)
زود رنج	ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہو جانے والا ۔

س

سامان بندھنا	بندوبست ہونا ۔ کسی چیز کے مہیا ہونے کے آثار ہونا ۔
سبزۂ خط	نئی آگی ہوئی داڑھی جس کی رنگت سبزی مایل ہوتی ہے ۔
سسکیاں لینا	روتے ہوئے یا رونے کے بعد سسکیاں لینا ۔
ستواں (یاستی ہوئی)	پتلی اور نازک ناک ۔
سٹ پٹانا	گھبرانا ۔ پریشان ہونا ۔
سٹی بھول جانا	اوسان خطا ہو جانا ۔ گھبرانا ۔
سخافت	رکاکت ۔ بیہودگی ۔
سدھانا	مانوس کرنا ۔ جانور کو سکھانا ۔
سراپا	وہ نظم جس میں سر سے پاؤں تک محبوب کے ہر عضو بدن کی تعریف کی جائے ۔
سردست	فی الحال ۔ اس وقت ۔
سر خط	کرایہ نامہ ۔ قبالہ ۔
سر مونڈنا	لوٹنا ۔ ٹھگنا ۔ ایک قسم کی سزا ۔
سلفچی	ہاتھ دھونے کا برتن (چلمچی)
سوانا	گاؤں کی اراضی کی حد ۔

سودا	ضرورت کی چیزیں - بعض جگہ پھل میوہ مٹھائی وغیرہ کے معنی میں بھی آتا ہے -
سوم	بخیل - کنجوس -
سہائتا	مدد -
سیدھے سبھاؤ	فطری انداز سے - سادگی و صفائی کا برتاؤ -
سیر چشم	سخی - صابر- مستغنی - بے نیاز -
سیروا	چارپائی کے سرہانے کی پٹی -

ش

شارع	صاحب شریعت - شاہراہ -
شغف	بے حد رغبت - انتہائی شوق -
شکمی کاشت کار	وہ کاشت کار جو دوسرے سے زمین لے کر کھیتی کرے - ماتحت کاشت کار -
شنجرف	پارے اور گندھک کا مرکب (شنگرف)
شورہ پشت	سرکش - نافرمان - جھگڑالو -
شملہ	عمامہ - عمامے کا سرا یا چوٹی - سر سے باندھنے کی شال -

ص

صحف	مقدس کتابیں - (صحیفہ کی جمع)
صراحت	وضاحت - صاف طور سے -
صحنچی	چھوٹا صحن -
صلۂ رحم	خویش و اقربا سے نیک سلوک کرنا

ض

ضلع جگت — رعایت لفظی ۔ ایہام گوئی ۔

ط

طبیعت حاضر ہونا — کسی کام کی طرف طبیعت مایل ہونا ۔ موڈ، ہونا ۔

طرح دار — خوب صورت ۔ بانکا ۔ وضع دار ۔

طنطنہ — رعب داب ۔ کروفر ۔ آن بان ۔

ع

عرضی دعویٰ — وہ درخواست جس میں مدعی حالات مقدمہ لکھ کر عدالت میں دعویٰ دائر کرتا ہے ۔

عقل کل — جبریل ۔ عرش اعظم ۔ نور محمدی ۔ مجازاً وہ مشیر جن کے مشورے کے بعد کوئی کام نہ ہو سکے ۔

علم قیافہ — فراست ۔ چہرے سے دل کی بات یا چال چلن معلوم کرنے کا علم ۔

علیٰ رغم — بالمقابل ۔ برخلاف ۔ باوجود ۔

علیٰ قدر مراتب — مرتبے یا حیثیت کے مطابق ۔

غ

غلاف آنکھیں — بڑی، بڑی آنکھیں جن کے پپوٹے چوڑے اور جھکے ہوئے ہوں ۔

ف

فراشی سلام	وہ سلام جو بہت جھک کر کیا جائے کہ ہاتھ فرش کو جا لگے ۔
فروع	شاخیں ۔ (فرع کی جمع) مراد ضمنی باتیں جو کسی اور بات پر مبنی ہوں ۔
فسخ	باطل کر دینا ۔
فقیہہ	علم فقہ (یعنی قانون شریعت) کا عالم ۔
فوج داری	لڑائی جھگڑا ۔ مارپیٹ ۔ وہ عدالت جس میں اس قسم کے جرایم کی سماعت ہو ۔
فی البدیہہ	برجستہ ۔ بے ساختہ ۔
فی الوقت	فوراً ۔ اسی وقت ۔
فیرینی	ایک قسم کی کھیر جو پسے ہوئے چاول سے تیار کی جاتی ہے ۔
فیل مچانا	ضد کرنا ۔ مچلنا ۔
فی نفسہ	اپنی ذات سے ۔ بذات خود ۔

ق

قاطبۃً	تمام ۔ یکسر ۔ بالکل ۔
قاہرہ	غالب ۔ زبردست ۔ جابر ۔
قبول صورت	خوبرو ۔ وجیہہ ۔
قدم درمیان میں ہونا	تعلق یا واسطہ ہونا ۔
قرآن کا جامہ پہننا	پارسا بننا ۔ راست باز بننا ۔
قضارا	اچانک ۔ اتفاقاً ۔

قلیہ	شوربے دار، سادہ یا ترکاری دار گوشت۔
قیافہ	فراست ۔ چہرے سے دل کا حال یا چال چلن معلوم کرنا ۔

ک

کان کھڑے ہونا	متنبہ ہونا۔ چوکنّا یا ہوشیار ہوجانا۔
کٹنی	دلالہ ۔ چالاک عورت ۔
کچلی	وہ نوکدار دانت جنھیں کیل یا کیلا کہتے ہیں ۔ اس کے نکلنے میں بچوں کو سخت تکلیف ہوتی ہے ۔
کچلیاں پھولنا	کچلی نکلتے وقت مسوڑھوں کا پھولنا۔
کچلا	ایک زہریلی دوا ۔
کچوانسی	زمین کی پیمایش کا سب سے چھوٹا پیمانہ ۔ بیگھ کا $\frac{1}{8000}$ حصہ ۔
کراماً کاتبین	دو فرشتے جو انسان کے اعمال لکھتے ہیں ۔
کرکری ہونا	بدمزگی ہونا ۔ خفت یا توہین ہونا ۔
کفو	برابر (حیثیت اور حسب نسب میں)۔
کن انکھیوں سے دیکھنا	ترچھی نظر سے دیکھنا ۔ آنکھ کے گوشے سے دیکھنا ۔
کنچنی	طوائف ۔ زن فاحشہ ۔
کندی ہونا	پٹائی ہونا ۔
کنونڈا	دبیل ۔ زیر بار احسان رہنا ۔
کنی دی رہنا	بس میں رہنا ۔
کنی کاٹنا	کترانا ۔

کوتک — برے لچھن ۔ ناشائستہ افعال ۔

کوڑی — مقدار قلیل ۔ دمڑی ۔ بیس چیزوں کی تعداد کو بھی کوڑی کہتے ہیں ۔

کہربا — ایک قسم کی زردگوند ، اگر اسے اونی کپڑے پر رگڑیں تو گھاس کے تنکے کو اٹھا لیتی ہے ۔ مقناطیسی اثر رکھنے والی شئے ۔

کھڑا کرنا — کپڑے کی کچی سلائی ۔

کھسوٹنا — نوچنا ۔ بال اکھاڑنا ۔

کھیوٹ — پٹواری کا کاغذ جس میں مالکان اراضی کے نام اور حصے درج ہوتے ہیں ۔ (کھتونی ۔ وہ کاغذ جس میں گاؤں کی زمین کا حساب کتاب ، کیفیت تقسیم وغیرہ درج ہوتی ہے) ۔

کیمخت — کچا چمڑا ۔

گ

گانٹھنا — کسی کو حیلے حوالے سے اپنے ساتھ ملا لینا ۔ قابو میں کر لینا ۔

گردے میں — دائرے یا حلقے میں ۔ گردونواح میں ۔

گلے مڑھنا (یا منڈھنا) — زبردستی کوئی چیز کسی کے حوالے کرنا ۔

گل چھڑے اڑانا — عیش اڑانا ۔ رنگ رلیاں منانا ۔

گلوری — پان کا بیڑا ۔

گنجفہ — تاش کا ایک کھیل ۔

گنڈے دار	بے سلیقہ ۔ ناغے کے ساتھ ۔
گونتھنا	موٹا موٹا یا برے طریقے سے سینا ۔
گھٹی میں داخل ہونا	سرشت میں یا فطرت میں کوئی وصف ہونا ۔
گھٹنے سے لگنا (یا لگ کر بیٹھنا)	ہر وقت پاس رہنا ۔
گھر گھسنا	ہر وقت زنان خانے میں رہنے والا ۔
گھر میں ڈالنا	کسی عورت کو بغیر نکاح کیے زوجہ کی طرح رکھنا ۔
گھرکنا	جھڑکنا ۔ ڈانٹنا ۔
گھگھی بندھنا	خوف کے مارے بول نہ سکنا ۔ شدت گریہ سے گلوگیر ہو جانا ۔
گھوسن	گھوسی کی تانیث ۔ مسلمانوں میں ایک طبقہ جو آبائی طور پر گوالوں کا پیشہ کرتے ہیں ۔
گھی کہاں گیا کھچڑی میں	جس نقصان یا خرچ سے اپنوں کو فائدہ پہنچے اس کے بارے میں کہتے ہیں ۔

ل

لاکھا	لاکھ کا سرخ رنگ جسے ہونٹوں پر لگاتے ہیں ۔ (لگانا یا جمانا کے ساتھ) مسی کی دھڑی لگا کر ہونٹوں پر پان یا لاکھے کی سرخی جمانا ۔
لتاڑنا (یا لتھاڑنا) لتھیڑنا	پھٹکارنا ۔ فضیحت کرنا ۔ پامال کرنا ۔ آلودہ کرنا ۔ ملوث کرنا ۔ مٹی یا کیچڑ وغیرہ میں بھرنا ۔

لٹو ہونا	فریفتہ ہونا ۔
لچھن	آثار ۔ طور طریقہ ۔ رنگ ڈھنگ ۔
لخلخہ سنگھانا	لخلخہ ایک مرکب خوشبو ہے جسے سنگھا کر بے ہوش آدمی کو ہوش میں لاتے ہیں ۔
لدھڑ	بھدا ۔ کند ذہن ۔
لشٹم پشٹم	[illegible] طرح ۔ جوں توں کر کے۔ بہ مشکل ۔
لعان	شوہر اور بیوی کا ایک دوسرے پر لعنت بھیجنا ۔ زنا کی تہمت لگا کر لعنت سے توثیق کرنا ۔ لعان کے بعد نکاح حرام ہو جاتا ہے ۔
للو پتو کرنا	خوشامد یا چاپلوسی کرنا۔ چکنی چپڑی باتیں کرتا ۔
لے پالک	گود لیا ہوا ۔ متبنیٰ ۔
لیتڑے (یالیتھڑے بوزن چیتھڑے)	پھٹے پرانے جوتے ۔
لیس	تیار ۔ آمادہ ۔ کیل کانٹے سے درست۔

م

ما بہ الامتیاز	وہ وصف جو باعث امتیاز ہو ۔
ماخوذ	گرفتار ۔ پکڑا ہوا ۔
ما مضیٰ	جو گزر گیا ۔ گزشتہ ۔
ماءالشباب	وہ آب و تاب جو جوانوں کے چہرے پر ہوتی ہے ۔

مبتذل	حقیر ۔ ذلیل ۔ کم قیمت ۔ فرسودہ ۔
مبروص	کوڑھی ۔
متفاوت	جدا ۔ مختلف ۔
متفرع	منحصر ۔ مبنی ۔
متمتع	مستفید ۔ فائدہ اٹھانے والے ۔
متموج	لہریں مارنے والا ۔
متنبہ	آگاہ ۔ خبر دار ۔
متنجن	ایک قسم کا میٹھا پلاؤ ۔
مَٹھا	سست ۔ دھیما ۔ کند ذہن ۔
مٹھ بھیڑ(مٹ بھیڑ یا مڈ بھیڑ)	اتفاقیہ ملاقات ۔ اچانک سامنا ہونا ۔
مجرا	ارباب محفل میں ناچ گانا ۔
مجرا عرض کرنا	آداب بجا لانا ۔ جھک کر سلام کرنا ۔
مجرد	اکیلا ۔ بن بیاہا ۔ آزاد ۔
مچان	وہ تختے جو دیوار میں اونچی جگہ اسباب وغیرہ رکھنے کے لیے لگا لیتے ہیں ۔ (دیگر معنی بھی ہیں) ۔
محاسدہ	ایک دوسرے سے حسد کرنا ۔
محامد اخلاق	اخلاق خوبیاں ۔
محاکمہ کرنا	حَکم بن کر جھگڑے کا فیصلہ کرنا ۔ انصاف طلبی ۔
محروم الارث	جو وراثت سے محروم کر دیا گیا ہو۔
مداخلت بے جا	بلا اجازت دخل دینا ۔ قانونی اصطلاح میں کسی کی زمین یا گھر میں بغیر اجازت مجرمانہ ارادے سے داخل ہونا۔

مدعی	دعویٰ کرنے والا ۔ مستغیث ۔ (مدعا علیہ = جس پر نالش کی گئی ہو ۔ فریق ثانی) ۔
مدنی الطبع	فطرتاً مل جل کر رہنے والا ۔ (انسان کی صفت ہے) ۔
مرافعہ	مقدمے کی نظر ثانی (یا داد خواہی) کے لیے کسی بڑے حاکم کی عدالت میں اپیل کرنا ۔
مرکز ثقل	وہ نقطہ جس پر کسی جسم کا توازن قایم رہے ۔
مزمن	کہنہ ۔ پرانا ۔
مُساکر	بہ مشکل ۔
مُساہلت	سستی کرنا ۔ غفلت ۔
مستحضر	یاد رکھا ہوا ۔ حاضر ۔ تیار ۔
مستعجل	جلد باز ۔ جلدی کرنے والا ۔
مسرف	فضول خرچ ۔ (اسم فاعل) ۔
مسی کُسی	موٹا جھوٹا ۔ (مسا = سستا یاموٹا اناج)
مَسی کی دھڑی	مسی کی تہہ جو ہونٹوں پر جمائی جاتی ہے ۔
مسیں بھیگنا	سبزہ آغاز ہونا ۔ موچھیں نکلنا ۔
مصداق	وہ جو کسی چیز کی صداقت ثابت کرے ۔ جس پر کوئی قول صادق آئے ۔
مطبوع	پسندیدہ ۔ مرغوب ۔ نیز طبع شدہ (چھپا ہوا) ۔
مظلمہ	ظلم و ستم ، نیز ظلم کی داد خواہی ۔

معمولات	روز مرہ کی باتیں ۔ وہ باتیں جن کی عادت ہو ۔
مغصوبات	غصب کی ہوئی چیزیں ۔
مغائرت	بیگانگی ۔ غربت ۔اجنبیت ۔
مفتری	افترا پرداز ۔ مفسد ۔ بہتان لگانے والا
مفسدہ	بلوہ ۔ فساد ۔ ہنگامہ ۔ فتنہ ۔
مقتضا	تقاضا کیا گیا ۔ مراد مصلحت ۔ (مقتضی = تقاضا کرنے والا) ۔
مکرنی	ایک قسم کی چو مصرعی پہیلی ۔ پہلے تین مصرعوں میں ایسی باتیں کہی جاتی ہیں جو 'ساجن' سے منسوب ہو سکیں ۔ چوتھے مصرعے میں پہیلی کا حل ہوتا ہے ۔ اسے کہہ مکرنی، مکری یاسکھی بھی کہتے ہیں۔
ملاگیری	صندلی ۔ صندل کے رنگ کا ۔(ملاگیر، دکن کے ایک پہاڑ کا نام جہاں کا صندل مشہور ہے) ۔
ملیح	سانولا سلونا ۔ حسن نمکین ۔
من حیث الاخلاق	اخلاقی حیثیت سے ۔
من سمجھوتی	دل کا سمجھا لینا ۔ اطمینان خاطر ۔
منہیات شرعی	وہ افعال بد جو شرعاً ممنوع ہیں ۔ (منہی کی جمع بمعنی روکی گئی)
منہ بولا	جسے منہ سے کہہ کر اپنایا گیا ہو جیسے منہ بولا بھائی ۔
منہ پھوڑ کرمانگنا (یا کہنا)	بے غیرت بن کر طلب کرنا۔

منه پھلانا	ناراض یا خفا ہونا ۔
منه جٹھلانا	برائے نام کھانا کہ صرف منه جوٹھا ہو جائے ۔
منه کرنا	رخ کرنا ۔ لحاظ کرنا ۔ مقابله کرنا۔
موتی چور	موتیوں کے چورے کی طرح چمکدار ۔ (آنکھوں کی تعریف میں)
موجبات ترغیب	اسباب ترغیب ۔
مور ضعیف	کمزور چیونٹی ۔
موضوع له	جس کے لیے کوئی چیز وضع کی جائے۔
موکھا	جھروکا ۔ سوراخ ۔ روشندان ۔

ن

ناخنه	آنکھ کی ایک بیماری جس میں سفیدی مائل گوشت آنکھ کے کونے میں پیدا ہو جاتا ہے ۔
ناک چوٹی کاٹنا	برے کام کی سزا دینا ۔ ذلیل کرنا ۔
نالش	فریاد ۔ شکایت ۔ دعوی ۔
ناصبور	بے چین ۔ بے صبر ۔
نسوت	خالص ۔ بے میل ۔ بالکل ۔
نص قرآنی	قرآن شریف کی واضح آیت یا حکم ۔
نصیب دشمناں	کسی عزیز کی بیماری یا مصیبت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔
نصیبوں پر پتھر پڑنا	بد نصیب ہو جانا ۔ تباہی آنا ۔
نفقه	اخراجات خانه داری ۔ بیوی کا روٹی کپڑے کا خرچ ۔

نکال لانا	کسی عورت کو بھگا کر لے آنا ۔
نکبت	غربت ، افلاس ۔ ذلت ۔ بد نصیبی ۔
نکو بنانا	بد نام کرنا ۔ رسوا کرنا ۔
نکیلا	بانکا ترچھا ۔ طرح دار ۔
نگھری ندری	بے گھر بے در کی ۔ خانہ برباد ۔
نوج	خدا نہ کرے ۔ دور پار ۔

و

واسوخت	وہ اشعار جو بطور مسدس، ترجیع بند یا ترکیب بند، محبوب کی شکایت اور اس کی محبت سے بیزاری کے اظہار میں لکھے جائیں ۔
واشدگی	رہائی ۔ بے تکلفی ۔ اختلاط ۔
وجاہت	خوبصورتی ۔ وقار ۔ جاہ یا عہدہ ۔
وضعات	(وضع کی جمع) ۔ وضع کرنا یعنی منہا کرنا ۔
وضیع	ادنلی ۔ کمینہ ۔ نیچ ۔

ہ

ہتھکنڈے	ہاتھ کے کرتب ۔ چالاکی۔ داؤ پیچ ۔
ہتھے چڑھنا	ہاتھ لگنا ۔ قابو میں آنا ۔
ہتھے سے اکھڑنا	قابو سے باہر ہو جانا ۔
ہدڑا کرنا	درگت بنانا ۔
ہردا کھلنا	حوصلہ ہو جانا ۔ ہمت بڑھ جانا ۔
ہڑک	خواہش ۔ اُمنگ ۔ (لگنا یا اُٹھنا کے ساتھ، بمعنی ولولہ اُٹھنا ۔ شوق چرانا)

ہڑتال	سنکھیا کی قسم کی ایک زہریلی چیز۔
ہست نیست	ہاں نہیں ۔ اقرار یا انکار ۔ یہ محاورہ اردو کے لیے مخصوص ہے ، فارسی میں نہیں ۔
ہکّا بکّا رہ جانا	حیران ہونا۔ حواس باختہ یا سراسیمہ ہونا ۔
ہلنا	مانوس ہونا ۔ سدھ جانا (ہلانا ۔ متعدی ۔ مانوس کر لینا) ۔
ہلواہا	ہل چلانے والا مزدور ۔
ہمہ تن گوش	سننے میں محو ۔ پوری طرح متوجہ ۔
ہوّا	بچوں کو ڈرانے کے لیے فرضی صورت ۔ ڈراؤنی چیز ۔
ہوا بھر جانا	گھمنڈ ہو جانا ۔ دھن لگنا ۔
ہیکڑی	سر کشی ۔ زبردستی ۔ شیخی ۔ (جتانا کے ساتھ ۔ زور دکھانا ۔ دھمکی دینا)
ہیٹا پن	بزدلی ۔ بودا پن ۔ سفلہ پن ۔

ی

پیوست	خشکی ؛ مراد خشک مزاجی ۔